بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقع
ڈیرہ غازی خان

رحیمی

تاریخِ ڈیرہ غازیِ خان

مصنف

غلام علی نتکانی

ملنے کا پتہ

جمہوری کتاب گھر ⊙ تونسہ شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقع

ڈیرہ غازی خان

(تاریخ ڈیرہ غازی خان)

حصہ۔ اوّل و دوم

تصنیف و تالیف

غلام علی خان بلوچ نتکانی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

طبع اول ۱۹۸۶ء

تعداد ایک ہزار

طباعت یکٹرک پریس ملتان

کتابت ماسٹر محمد رمضان

ناشر

قیمت 100/ روپے

ملنے کا پتہ:- جمہوری کتاب گھر۔ تونسہ شریف

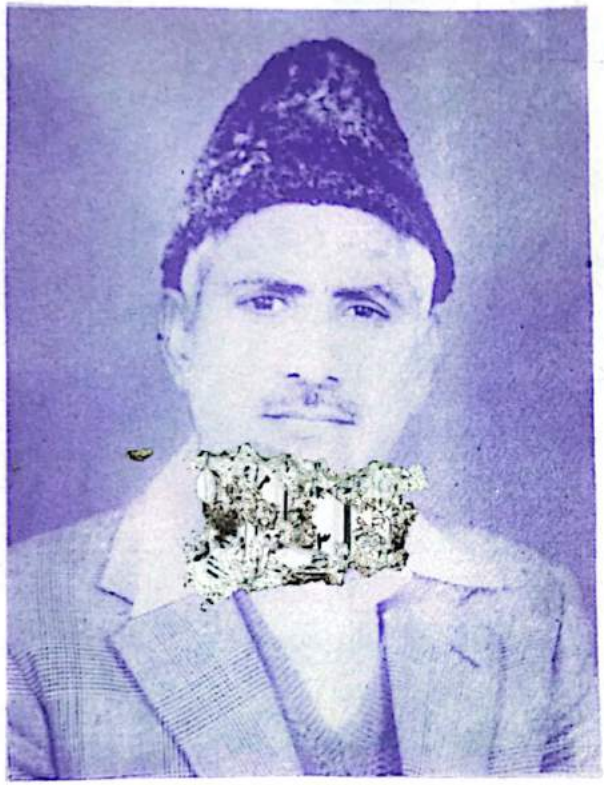

مصنف

غلام علی خان بلوچ تنگانی

حصّہ اوّل

همه مرده از روزگار دراز
شد از گفت من نام شان زنده باز
چو عیسی من این مردگان را تمام
سراسر [illegible] کردم بنام

فردوسی

فہرست مضامین

نمبرشمار	عنوان	صفحہ
	حصہ اوّل	
۱	عرض مصنّف	۱
۲	ماخذات کتاب	۱۴
۳	ابتدائیہ	۲۸
۴	سرزمین ڈیرہ غازیخان مختلف	۳۹
۵	تاریخی دور میں	
۶	نوحؑ اور قوم نوحؑ	״
۷	سوق الثمانین	[illegible]
۸	دنیا کی پہلی بادشاہت	[illegible]
۹	سرزمین ڈیرہ غازیخان پر پہلی بادشاہت	״
۱۰	آریاؤں کا ورود	۴۲
۱۱	میدہ قبائل	۴۳
۱۲	سکندر اعظم کا حملہ	۴۵
۱۳	سکندر اعظم ڈیرہ غازیخان میں	״
۱۴	چندر گپت موریہ	۴۶
۱۵	سیتھین قبائل	״
۱۶	جاٹ قبائل	۴۷
۱۷	ہن قبائل	۴۸
۱۸	رائے خاندان	۴۹
۱۹	پچ خاندان	۴۹
۲۰	راجہ داہر	۵۰
۲۱	اسلامی دور	۵۱
۲۲	محمد بن ہارون گورنر بلوچستان	״
۲۳	محمد بن قاسم کا حملہ سندھ	۵۲
۲۴	ڈیرہ غازیخان آغوش اسلام میں	״
۲۵	والیان سندھ و ڈیرہ غازیخان	۵۴
[illegible]	[illegible] دلورائے اوّل	״
[illegible]	سیف الملوک اور بدیع الجمال کا واقعہ	۵۶
[illegible]	دلورائے ثانی	۵۸
۲۹	جنید بن عبدالرحمٰن مری	۵۹
۳۰	حکم بن عوانہ	״
۳۱	عمر بن محمد بن قاسم	۶۰
۳۲	موسیٰ بن کعب	״
۳۳	عمر بن حفص	״
۳۴	ہشام بن عمر تغلبی	۶۱
۳۵	مصبح بن عمر تغلبی	״
۳۶	طیفور بن عبداللہ حمیری	״
۳۷	داؤد بن یزید مہلبی	۶۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۸	موسیٰ بن یحییٰ برمکی	۶۲
۳۹	ہارون بن ابی خالد	۶۳
۴۰	والیانِ ملتان و ڈیرہ غازیخان	۶۵
۴۱	بنو منبہ	"
۴۲	جلم بن شیبان	۶۶
۴۳	شیخ حمید لوئی	۶۷
۴۴	ابوالفتح داؤد لوئی	"
۴۵	سلطان محمود کا حملہ سومنات	۶۹
۴۶	حسین بن ابراہیم	۷۰
۴۷	عبداللہ لوئی	"
۴۸	ناصرالدین قباچہ	[illegible]
۴۹	خان شہید	[illegible]
۵۰	بہرام ایبہ	۷۲
۵۱	سید خضر خان	۷۳
۵۲	بہلول لودھی	۷۴
۵۳	شیخ یوسف	"
۵۴	رائے سہرہ (قطب الدین لنگاہ)	"
۵۵	سلطان حسین خان لنگاہ	۷۶
۵۶	داجل وہڑند کی ناہڑ لوئی حکومت	۷۹
۵۷	شیخ حمید لوئی	۸۰
۵۸	ابوالفتح داؤد بن نصر	۸۱
۵۹	بہادر خان	"
۶۰	عام حالات	۸۱
۶۱	داجل	۸۲
۶۲	ناہڑ کوٹ	"
۶۳	سہران	۸۳
۶۴	نقش اوّل	"
۶۵	نقش ثانی	"
۶۶	نقش ثالث	"
۶۷	سیت پور کی ناہڑ لودھی حکومت	۸۵
۶۸	لودھی خاندان کی برصغیر میں آمد	"
۶۹	اسلام خان اوّل	"
۷۰	عیسن خان اوّل	۸۷
[illegible]	اسلام خان ثانی	"
۷۲	سلطان محمد خان اور سخی طاہر	"
۷۳	اسلام خان ثالث	۸۸
۷۴	بھاگوان سردار	۸۹
۷۵	بھولا بادشاہ	"
۷۶	اسلام خان رابع اور قاسم خان	۹۰
۷۷	طاہر خان ثانی	۹۲
۷۸	سلطان خان اور ابراہیم خان	"
۷۹	اسلام خان ثالث	۹۳
۸۰	عام حالات	۹۴
۸۱	سیت پور	"

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۸۲	علی پور	۹۵	۱۰۲	غازی خان ششم	۱۱۹
۸۳	بھاگسر	"	۱۰۳	غازی خان ہفتم	۱۲۰
۸۴	کوٹ طاہر	۹۶	۱۰۴	غازی خان ہشتم	۱۲۲
۸۵	مقبرہ سلطان محمد خان	"	۱۰۵	وفات	۱۲۵
۸۶	مسجد مخی طاہر خان	۹۷	۱۰۶	غازی خان نہم (آخر)	۱۲۶
۸۷	مقبرہ بی بی بگی	"	۱۰۷	دیوان گدڑمل کا قتل	۱۲۷
۸۸	مقبرہ حامد سلطان	"	۱۰۸	غلام شاہ کا حملہ اور غازی خان کی	۱۲۸
۸۹	بھاگسر واہ	۹۸		گرفتاری	
۹۰	ڈیرہ غازیخان کی میرانی حکومت	[illegible]	۱۰۹	میرانی دور حکومت پر ایک نظر	۱۲۹
۹۱	میرانی	۱۰۱	۱۱۰	شہر ڈیرہ غازیخان	"
۹۲	حاجی خان اوّل	۱۰۴	۱۱۱	مسجد خانوالی	۱۳۰
۹۳	غازی خان اوّل	[illegible]	[illegible]	مزار غازی خان	"
۹۴	غازی خان اوّل اور اسمٰعیل خان	[illegible]	[illegible]	[illegible]تہ پیر عادل صاحب	"
۹۵	وفات	"	۱۱۴	روضہ لعل عیسن کروڑ	۱۳۱
۹۶	نور احمد خان فریدی کی ایک غلطی	۱۱۱	۱۱۵	نالہ کستوری	"
۹۵	حاجی خان دوم	۱۱۳	۱۱۶	موجودہ میرانی خاندان	۱۳۳
۹۶	غازی خان دوم	"	۱۱۷	شاہ محمد خان	"
۹۷	نور احمد خان کی تیسری غلطی	۱۱۴	۱۱۸		
۹۸	حاجی خان اور غازی خان سوم	۱۱۵	۱۱۹	احمد یار خان	۱۳۴
۹۹	حاجی خان اور غازی خان چہارم	۱۱۶		ڈیرہ غازیخان کی گوجر حکومت	۱۳۶
۱۰۰	غازی خان پنجم	۱۱۸	۱۲۰	محمود خان گوجر	"
۱۰۱	حاجی خان پنجم	"	۱۲۱	محمود خان کی دوغلی پالیسی	۱۳۸

CamScanner

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۲۲	محمود خان کا آسنی پر حملہ	۱۴۰
۱۲۳	وفات	"
۱۲۴	نور محمد خان گوجر	"
۱۲۵	نور محمد کا قتل	۱۴۱
۱۲۶	برخوردار خان گوجر	۱۴۲
۱۲۷	عام حالات	۱۴۳
۱۲۸	محمود کوٹ	"
۱۲۹	نور پور	۱۴۴
۱۳۰	فاضل پور	"
۱۳۱	کوٹلہ داد	"
۱۳۲	کوٹ گجر اور گجری	"
۱۳۳	مسجد غلافے والی	"
۱۳۴	مسجد چھپڑ خان والی	۱۴۵
۱۳۵	تالاب سخی سرور	
۱۳۶	نالہ جات	"
۱۳۷	موجودہ گوجر خاندان	۱۴۶
۱۳۸	مخادیم سیت پور کا عہد حکومت	۱۴۷
۱۳۹	مخدوم شیخ محمد حسن	"
۱۴۰	شیخ محمود اوّل	"
۱۴۱	شیخ محمد راجو اوّل	۱۴۸
۱۴۲	شیخ محمد کیمانظر اور شیخ محمود دوم	"
۱۴۳	شیخ محمد راجو دوم	۱۴۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۴۴	شیخ محمود سوم	۱۵۰
۱۴۵	مخدوم شیخ محمد شاہ	"
۱۴۶	عام حالات	"
۱۴۷	راجن پور	۱۵۱
۱۴۸	اجارہ دار کوٹ مٹھن	۱۵۲
۱۴۹	قاضی نور محمد	"
۱۵۰	اولاد	۱۵۳
۱۵۱	قاضی واہ	۱۵۴
۱۵۲	ہڑند و داجل بروہی دور میں	۱۵۵
۱۵۳	بروہی	"
۱۵۴	میر احمد خان	"
۱۵۵	میر عبداللہ خان	۱۵۶
	میر عبداللہ کا حملہ ڈیرہ غازیخان	"
	خان اعظم میر نصیر خان	۱۵۷
۱۵۸	بندر کی بلا طویلے کے سر	۱۵۹
۱۵۹	میر محمود خان	۱۶۰
۱۶۰	میر محمود خان، دین پناہؒ کے مزار پر	۱۶۱
۱۶۱	میر محراب خان	"
۱۶۲	ڈیرہ غازیخان درّانی عہد حکومت میں	۱۶۳
۱۶۳	احمد شاہ درّانی	"
۱۶۴	احمد شاہ کا پنجاب پر حملہ	۱۶۴
۱۶۵	دوسرا حملہ	"

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۶۶	تیسرا حملہ	۱۶۴
۱۶۷	ڈیرہ غازیخان پر مرہٹوں کا حملہ	۱۶۶
۱۶۸	احمد شاہ کا پنجاب پر چھٹا حملہ	〃
۱۶۹	وفات	۱۶۷
۱۷۰	تیمور شاہ	〃
۱۷۱	زمان شاہ	۱۶۸
۱۷۲	سردار پائندہ خان کا قتل	〃
۱۷۳	محمود شاہ اور شاہ شجاع	۱۶۹
۱۷۴	شاہ شجاع کا فرار	〃
۱۷۵	شاہ شجاع کا قتل	۱۷۰
۱۷۶	درّانی حکومت کا خاتمہ	〃
۱۷۷	درّانی دور کے ناظمین ڈیرہ غازیخان	۱۷۱
۱۷۸	تیمور شاہ کا دور	〃
۱۷۹	زمان شاہ کا دور	〃
۱۸۰	محمود شاہ کا دور	۱۷۲
۱۸۱	درّانی دور حکومت پر ایک نظر	۱۷۳
	حصّہ دوم	۱۷۵
۱۸۲	سنگھڑ	۱۷۶
۱۸۳	لنگاہ دورِ حکومت	۱۷۸
۱۸۴	نشکانی ریاست کا قیام	۱۸۹
۱۸۵	میر محمد خان	〃

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۸۶	سردار میرو خان	۱۹۱
۱۸۷	میر عالی نوتک خان	۱۹۴
۱۸۸	سردار ملغ خان	۱۹۷
۱۸۹	سردار لعل خان	〃
۱۹۰	سردار میر احمد خان	۱۹۸
۱۹۱	سردار شیر خان	۱۹۹
۱۹۲	دلشاد خان قیصرانی کا سنگھڑ پر حملہ	〃
۱۹۳	سردار میر آدم خان	۲۰۱
۱۹۴	نواب محمد مسو خان	۲۰۲
۱۹۵	شہزادہ ہمایوں مسو خان کی پناہ میں	۲۰۴
۱۹۶	میاں رضا محمد کا قتل	۲۰۵
۱۹۷	مسو خان کی وفات	۲۰۶
۱۹۸	قضائے کہ ایں باغ را آفرید	۲۰۷
۱۹۹	نواب علی اکبر خان	۲۰۹
۲۰۰	لکھی محمد خان کا قتل	۲۱۰
۲۰۱	علی اکبر کا سوا روپیہ	۲۱۱
۲۰۲	نواب لعل خاں	〃
۲۰۳	کھوسہ سردار کا قتل	۲۱۲
۲۰۴	لعل خان کی شکست	۲۱۳
۲۰۵	لعل خان کا مھوئی پر حملہ	〃
۲۰۶	لعل خان یا رادھا کرشن	۲۱۴
۲۰۷	لعل نہیں کوئی لالٹری ہے	۲۱۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۰۸	لعل خان ولانہ میں	۲۱۶
۲۰۹	نواب محمد اسد خان	۲۲۲
۲۱۰	رسم دستار بندی	"
۲۱۱	اسد خان ناظم ڈیرہ غازیخان	۲۲۳
۲۱۲	سنگھڑ پر سکھوں کے حملے	۲۲۴
۲۱۳	نواب بہاولپور کا حملہ اور اسد خان کی اطاعت	۲۲۵
۲۱۴	چارلس میسن کی اسد خان سے ملاقات	۲۲۷
۲۱۵	ایک نیام میں دو تلواریں	۲۲۸
۲۱۶	کھوشل سنگھ عبدالصمد کی مدد پر	"
۲۱۷	جنرل ونتورہ کا سنگھڑ پر حملہ	۲۲۹
۲۱۸	سکھوں کا سنگھڑ پر قبضہ	۲۳۱
۲۱۹	اسد خان کی گرفتاری	"
۲۲۰	ایڈورڈس کی سنگھڑ میں پیشقدمی	۲۳۲
۲۲۱	اپنی اپنی پیشکش	۲۳۳
۲۲۲	اسد خان کی شرائط	۲۳۴
۲۲۳	ایڈورڈس کی ایک اور پیشکش	۲۳۵
۲۲۴	اسد خان کا سکھوں کی قید سے فرار	۲۳۶
۲۲۵	اسد خان ملتان کے محاذ پر	۲۳۷
۲۲۶	کل من علیہا فان	"
۲۲۷	ایک خاتم المورخین کی اپیل و نیک مشورہ	۲۳۸
۲۲۸	نور احمد خان فریدی کا ایک منطقی فیصلہ	۲۳۹
۲۲۹	نہ ستتے گر تم غیروں کی زبانی	۲۴۰
۲۳۰	کچھ عادل بادشاہوں کے بیان میں	۲۴۲
۲۳۱	اسد خان خواجہ سلیمانؒ کی نظر میں	۲۴۳
۲۳۲	چارلس میسن کے تاثرات اور ایڈورڈس کے اندازے	۲۴۵
۲۳۳	اسد خان کا نظام حکومت	۲۴۸
۲۳۴	پہلی حکایت	۲۵۰
۲۳۵	دوسری حکایت	۲۵۱
۲۳۶	تیسری حکایت	"
۲۳۷	نواب محمد اسد خان کی اولاد اور جانشین	۲۵۳
۲۳۸	سردار علی گوہر خان اور محمد رضا خان	"
۲۳۹	سردار محمد مسو خان	۲۵۶
۲۴۰	سردار محمد خان	"
۲۴۱	سردار امام بخش خان	"
۲۴۲	سردار محمد عبدالعظیم خان	۲۵۷
۲۴۳	حاجی محمد مسو خان	۲۶۰
۲۴۴	نتکانی خانوادے	۲۶۴
۲۴۵	نتکانی قبیلہ پر ایک نظر	۳۲۲

عرضِ مُصنّف

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ط

امّا بعد! سب سے پہلے میں اپنی علمی بے بضاعتی اور معاشی بے سرو سامانی کا اعتراف کرتا ہوں اگرچہ ہمارا گھرانہ مقامی طور پر خوشحال چلا آتا تھا مگر زمانہ کے انقلابات سے اس میں معاشی بدحالی در آئی۔ اور اس نے ایک عرصہ تک اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔ یہ ایک دَور تھا آیا اور گزر گیا۔ اس دَور میں میں ایک طالب علم تھا۔ دیہات میں اس وقت انگریزی تعلیم نہیں تھی۔ قریب کے شہر تونسہ میں ہائی سکول تھا۔ میں نے چوتھی جماعت میں وظیفہ لیا اور تونسہ ہائی سکول میں داخل ہوگیا۔ لیکن وہاں کا ماحول راس نہ آیا اور سکول چھوڑ دیا۔ اس طرح میں انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ تاہم مشفق اساتذہ کے فیضانِ نظر کے طفیل منگروٹھہ مڈل سکول سے ورنیکلر فائنل کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔

میرے ان اساتذہ میں پریتم داس صاحب اور حاجی خان محمد خان کا خصوصی عمل دخل رہا۔ یوں میں ان جملہ اساتذہ کا مجموعی طور سے شکر گزار ہوں جن کی نظرِ شفقت نے میرے اندر اسقدر تعلیمی لیاقت پیدا کر دی تھی کہ آج میں نے جس کام کو تکمیل تک پہنچایا ہے انھیں کا مرہونِ احسان ہے۔ مرحومین اساتذہ میں غلام حسن خان مسوانی، شیر محمد خان چجبہ، قاضی علی محمد خان، غلام حسن خان سکھانی، اور مولوی صالح محمد خان ملغانی خصوصیّت سے ذکر کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو منوّر کرے۔ آمین!

۵۱-۱۹۵۰ء میں، میں نے نارمل سکول مظفر گڑھ سے جے۔ وی کی ٹریننگ لی اور مئی ۱۹۵۱ء میں میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازیخان میں ملازم ہوگیا۔ ۱۹۵۹ء میں بہاولپور سے پرائیویٹ ایس۔ وی کا امتحان پاس کیا۔ اسی سند کے بموجب ۱۹۷۰ء میں ایم۔ سی ہائی سکول

ڈیرہ غازیخان میں ترقی یاب ہو کر منتقل ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں وقت کی گورنمنٹ نے لوکل باڈیز کے دیگر سکولوں کے ساتھ اس سکول کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر ان سکولوں کے عملے کے حقوق پنشن وغیرہ کا کوئی فیصلہ نہ کیا گیا۔ اس طرح ایسے سکولوں کے عملہ کا تبادلہ کسی دیگر سکول میں کرنے کا مقصد اس اہلکار کو نقصان پہنچانا اور زیادتی تھی۔ چنانچہ یہی صورتحال میرے ساتھ روا رکھی گئی۔ جو صریحاً ایک بددیانتی تھی۔ اس وقت مجھے شہر سے باہر ایک مڈل سکول میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے خلاف اس زیادتی کی آواز ڈی۔پی۔آئی پنجاب، وزیر تعلیم پنجاب، گورنر پنجاب اور صدر پاکستان تک پہنچائی مگر کسی کے کان میں جوں تک نہ رینگی۔ اگرچہ اس وقت کے ڈی۔پی۔آئی نے میری اس درخواست پر غور کیا تھا۔ مگر اس کے احکامات بہرحال غیر مؤثر ثابت ہوئے۔ بالآخر میں نے جنوری ۱۹۸۲ء میں ریٹائرمنٹ رخصت لی اور دسمبر میں ریٹائر ہو گیا۔

میری ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کا مرحلہ آیا۔ چونکہ میری زیادہ تر سروس میونسپل کمیٹی کی تھی اور گورنمنٹ سروس کم تھی اس لئے پنشن کا کیس میونسپل کمیٹی کو بھیج دیا گیا۔ ان دنوں محمد بلال طور بیان کا چیئرمین تھا۔ اس نے پنشن دینے پر بعض اعتراضات کئے۔ جو میرے علم میں نہیں لائے گئے۔ اور محکمہ ایجوکیشن نے ایک مبہم سی چٹھی میرے پاس بھیج دی۔ اور زبانی کہا کہ میونسپل کمیٹی پنشن دینے پر تیار نہیں ہے۔ یہ ایک مدرس کے ساتھ رویہ اختیار کیا گیا جس نے تیس ۳۰ سال تک قوم کے نونہالوں کو پڑھایا اور ان کی تربیت کی تھی۔

اب میں نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنی روداد لکھ بھیجی۔ جس کا انھوں نے نوٹس لیا اور اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب لاہور کو اس بارے میں لکھا۔ چنانچہ یہ چٹھی حوالہ بحوالہ دفتروں کا چکر کاٹتے ہوئے میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازیخان میں پہنچی۔ ان دنوں طور صاحب خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ اور میرا ایک شاگرد ظفر علی خان (وائس چیئرمین) قائمقام چیئرمین تھا۔ اس نے دونوں سمت سے نوٹس لیا۔ اور میری پنشن کے کاغذات میں کچھ پیشرفت ہوئی۔ وہ جلد ہی حج بیت اللہ پر چلا گیا۔ اور میرا پنشن کیس قدرے سست پڑ گیا۔ بلکہ اسے آفس فائلوں میں دبا کر رکھ دیا گیا۔ اس اثناء میں لوکل باڈیز کے نئے الیکشن ہو گئے۔ اور سردار عالم کھتران میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازیخان کا چیئرمین بن گیا۔

اب میں نے اپنے پنشن کیس کو گرد آلود فائلوں سے نکلوایا اور مرحلہ وار بل بنوانے پر پہنچا۔ چنانچہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو چیئرمین صاحب نے میرے پنشن بل پر دستخط کئے اور اس سے اگلے روز اس کی ادائیگی سے منحرف ہو گیا۔ اور کہا کہ ہم لوکل گورنمنٹ کو لکھیں گے۔ وہ ہمیں رقم دے گی تو پھر آپ کو بل مل سکے گا۔

جنوری ۱۹۸۴ء کو میں نے ایک مراسلہ وفاقی محتسب صاحب اور ایک صدر پاکستان کو لکھا اور یہ تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اس وقت ان دونوں اعلیٰ شخصیتوں نے میری اس عرضداشت کو پذیرائی بخشی۔ اور دستور کے مطابق چٹھیاں ارسال کیں۔ انھیں شاید معلوم نہیں تھا کہ یہاں سب "گونگے، بہرے اور اندھے" کرسیوں پر براجمان ہیں۔ بہرحال ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اب میں نے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب ملتان و ڈیرہ غازیخان ڈویژن کو مارشل لاء ضابطوں کا سہارا لیتے ہوئے لکھا اور ساتھ ہی محکمہ تعلیم ڈیرہ غازیخان اور میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازیخان کو حسب ضابطہ ایک نوٹس دیا اور اس نوٹس کی کاپی صدر پاکستان کو بھیجی اور عرض کیا کہ ایک مدرس تیس ۳۰ سال تک قوم و ملک کی خدمت کرے اور علم کی روشنی پھیلائے اور جب وہ ریٹائر ہو تو عدالتوں کے ذریعے اپنا حق پنشن طلب کرے۔ یہ مقام بہرحال عبرت کا باعث ہے۔

اس موقع پر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے زبردست نوٹس لیا اور اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کو سخت ہدایت کی کہ وہ نہ صرف مجھے بلکہ اسی نوعیت کے ہر کیس کو فوری طور پر نمٹائے اور پنشن مع گریجوئٹی ادا کرنے کا بندوبست کرے۔ چنانچہ میری اس عرضداشت سے ایک ماہ کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ اور مجھے میرا حق پنشن ادا کر دیا گیا۔

میرے ساتھ یہ سب کچھ ان دو بدعنوان افسروں کی بدولت ہوا تھا۔ یعنی کریم نواز ٹھٹھار[۱] ہیڈماسٹر ایم بی ہائی سکول اور ملک عبداللہ چیندر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ڈیرہ غازیخان۔ کریم نواز کا خاندان بدستور ٹھٹھار کا کام کرتا ہے۔ برتن سازی، ٹانکے لگانا اور انھیں قلعی کرنا ان کا موروثی پیشہ ہے۔ شہر ڈیرہ غازیخان کا بڑا ٹھٹھار گھرانہ یہی ہے۔ ابتدا میں چونکہ جست کے برتن بنانے کا رواج عام تھا اور یہ لوگ اس پیشہ میں ماہر تھے۔ اس لئے جستکانی مشہور ہو گئے۔ محکمہ مال کے ریکارڈ میں یہ خاندان "جست گر" لکھا گیا ہے۔ لفظ "جستکانی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

[۱] ٹھٹھیار یا ٹھٹھیرا۔

یہ لوگ اپنے آپ کو جسکانی بلوچوں سے نسبت دینے لگے ہیں۔ جو درست نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص تین سال تک بی۔ اے کرتا رہا۔ زمانہ کی ستم ظریفی کہ اخبارات اسے ماہر تعلیم لکھ رہے ہیں۔ ان کا قصور بھی نہیں ہے کہ دَور ایسا ہے۔ کسی شاعر نے ایسے ہی موقع پر کہا ہے۔

ے رہ و رسمِ فرمانروایاں شناسم — خراں بر سرِ بام و یوسف بچاہی

شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ بڑے آدمی کو بُرا کوئی نہیں کہتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صادق القول لوگ برملا کہتے ہیں اور دوسرے پسِ پشت۔ چنانچہ کہا ہے۔

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار — کہ برگشتہ بختی و بدروزگار
چرا خشم بر من گرفتی و بس — منت پیش گفتم، ہمہ خلق پس

تاہم

ے زِ رنج و راحت عالم مشو خنداں مرنجاں دل
کہ آئینِ جہاں گاہے چنیں، گاہے چناں باشد

اور "چندڑ" ہماری زبان میں ایسے "چوک چندڑے" کو کہتے ہیں جو جہل بسیط اور جہل مرکب کا امتزاج ہو۔ گویا کہ ایسا احمق جو اپنی عقل سے کام نہ لے اور دوسروں کے اشاروں پر چلے۔ یہ حقائق ہیں۔ اس میں ذاتیات کا قطعاً دخل نہیں ہے۔

ذوقِ مطالعہ

ابتداء میں مجھے پڑھنے اور شعر یاد کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ ملازمت میں آ کر میں نے نثر کی طرف توجہ دینا شروع کیا اور تاریخ کی طرف رجوع رہا۔

نارمل سکول مظفرگڑھ میں ہم جب پڑھ رہے تھے تو نفسیات کے مضمون میں پڑھا کہ بچوں کو جغرافیہ گھر سے پڑھایا جائے۔ چنانچہ جب میں مدرّس ہوا تو دیکھا کہ تیسری جماعت میں اپنے ضلع کا جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے اور تاریخی حالات میں مختلف مشاہیر کی داستانیں اور قصے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ہم ان بچوں کو جغرافیہ اپنے ضلع کا پڑھاتے ہیں تو تاریخ اپنے ضلع کی کیوں نہ پڑھائی جائے؟ اس طرح ہر بچہ مقامی تاریخ سے روشناس ہوگا۔

دوسرے میرے ایک دوست نے اپنے قبیلے کے بارے میں مجھ سے سوال کیا جو ان کا

اور میرا مشترک قبیلہ تھا۔ چنانچہ اس قبیلے کی تحقیق مجھے دامنگیر ہوئی۔ جو جملہ بلوچ قبائل اور ان کی اصل معلوم کرنے پر منتج ہوئی۔ اس وقت میں نے چاہا کہ بلوچوں کی تاریخ ہی لکھ ڈالوں۔ اس کتاب کا نام میں نے "صحیفۂ بلوچاں" رکھا۔ چنانچہ یہ تحقیقی سلسلہ ۱۹۷۰ء تک برابر چلا آیا۔ اور اس دوران میں تیرہ ۱۳ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان دنوں چونکہ بلوچستان کے بلوچ حکومت وقت کے زیر عتاب تھے اس لئے میں نے سوچا کہ اب ڈیرہ غازیخان کی تاریخ لکھ ڈالی جائے۔ چنانچہ اس کتاب کا نام "مرقع ڈیرہ غازیخان" رکھا اور اس کی ترتیب و تدوین شروع کردی۔ تحقیق و ترتیب کا یہ کام مسلسل نہیں کیا جاتا رہا بلکہ ملکی اور اپنے ذاتی حالات کے ساتھ وقفہ وقفہ سے ہوتا رہا۔ جسے آج بیس سال کا عرصہ گزر رہا ہے۔ اور مئی ۱۹۸۱ء کو یہ مسودہ مکمل ہوگیا۔ كلُّ امرٍ مرهونٌ باوقاتها۔ (ہر کام وقت کا محتاج ہے)

مرقعِ ڈیرہ غازیخان

جب میں نے مرقع ڈیرہ غازیخان لکھنے کا کام شروع کیا تو اس وقت اس میں موجودہ ضلع راجن پور شامل تھا مگر بعد میں اسے ایک الگ ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں ضلع راجن پور کے حالات شامل ہیں۔ اس کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّہ میں قدیم تاریخی دور سے ڈیرہ غازیخان کی مرانی حکومت تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصّہ میں سابق ریاست سنگھڑ کا بیان ہے۔ کتاب کا تیسرا حصّہ سکھ شاہی دور سے موجودہ دور تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں اقوام ضلع، زبان، ادب، صحافت و ثقافت وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ اور آخری حصّہ میں سرزمین ڈیرہ غازیخان کے جغرافیائی حالات اور پاکستانی عہد کا ترقیاتی جائزہ شامل ہے۔

اس وقت صرف دو حصّے یک جلدی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ اور یہی حالات کا تقاضا ہے۔ چنانچہ آخری دو حصّوں کا دوسری جلد میں شائع کیا جانا پہلی جلد کی کامیابی پر منحصر ہے۔

اضلاع کی فطرت

یہ درست ہے کہ انسان، حیوان، چرند، پرند اور حشرات الارض میں ہر ایک کی فطرت اپنی ہے اور اسی کے بارے میں قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ہر انسان کو اس کی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے بعینہٖ قطعات الارض کی فطرت ہے۔ چنانچہ جناب شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی تصنیف "پس دیوار زنداں" میں "اضلاع کی فطرت" کے عنوان سے سرزمین ڈیرہ غازیخان کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "ڈیرہ غازیخان ایشیا کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ اس کا طول اتنا لاہور سے دہلی ..... قلاش لوگ اپنی بیویوں کے پیٹ بیچ دیتے ہیں۔ لڑکی کے پیٹ کی قیمت زیادہ پڑتی ہے۔ تمام عورتیں لڑکی کی پیدائش کے لئے پیر فقیر مناتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو تمنداروں کی عظمت اور پیروں کی کرامت کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ خدا بھی کوئی چیز ہے" [1]

شورش صاحب کو شاید اپنے خطّہ کی فطرت کا علم نہ ہو سکا۔ ورنہ وہ دوسرے خطوں کے متعلق ایسا نہ لکھتے۔ چنانچہ یہاں پر مسعود اشعر صاحب کا ایک کالم نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے کالم "آئینہ" میں زیر عنوان "امریکی سفر نگار لاہور میں" لکھا ہے۔

"پال تھیروکس یا ٹیرڈر، چونکہ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں اور کافی عرصہ برطانیہ میں گزار چکے ہیں اس لئے ان کے لکھنے کے انداز میں کہانی کا عنصر بہت زیادہ اور ایشیا کے ملکوں کے بارے میں سوچنے کا انداز کسی حد تک برطانوی ہے۔ بہت خوبصورت لکھتے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا لیکن ہم یہاں ان کی کتابوں پر تبصرہ نہیں کر رہے ہیں۔ ہم وہ باتیں بتانا چاہتے ہیں جن کا ذکر سلیم الرحمٰن نے نہیں کیا لیکن وہ ہمارے لئے کسی نہ کسی طرح دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں ..... ان باتوں کا تعلق ایران اور پاکستان سے ہے۔ یہاں یہ بھی وضاحت کر دیں کہ ان ملکوں کا سفر آج سے سات آٹھ سال پہلے کیا گیا تھا۔ ..... پاکستان اور خاص طور سے لاہور کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے بیان کرتے شرم آتی ہے۔ پاکستان میں اسے صرف پشاور پسند آیا تھا اور وہ بھی پٹھانوں کی مہمان نوازی۔ لاہور میں وہ فلیٹیز ہوٹل میں ٹھیرا اور شام کو جب ٹہلنے باہر نکلا تو اس کا بیان ہے کہ ہر جھاڑی کے پیچھے سے ایک آدمی نکلتا تھا اور پوچھتا تھا صاحب کچھ چاہیئے؟ ..... گویا لاہور کے بارے میں اس کا تاثر۔ اب آپ ہی بتایئے یہ بیان پڑھ کر ہمیں شرم آئے یا نہیں؟ اور پھر یہ شخص دنیا کا مشہور اور نہایت مقبول سفرنامہ نگار ہے۔ اس کے پڑھنے والے ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہونگے" [2]

شورش صاحب زندہ ہوتے تو اس واقعہ پر یقیناً فخر محسوس کرتے اور اس سے کوئی جواز پیدا کر ہی لیتے غرضیکہ اضلاع کی فطرت کا فرق خود قارئین ہی نکال لیں۔

[1] پس دیوار زنداں ص ۱۳۰۔ [2] روزنامہ امروز ملتان ۱۴ اپریل ۱۹۸۲ء۔

تاریخ نگاری

تاریخ نویسی ایک مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کے لئے تاریخی ذوق، وافر مطالعہ، فہم و فراست، عقل سلیم، صحیح قوتِ فیصلہ، اجتہاد و قیاس کا ادراک اور علم معقول و منقول کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ تاریخی روایات عام طور سے گرمیٔ محفل کا سبب ہوتی ہیں۔ ایسی روایات کو عوام بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس طرح ان روایات میں مبالغہ آمیزی کا رنگ بھر جاتا ہے۔ ایسے مقامات پر واقعات کے اسباب و علل معلوم کرنے پڑتے ہیں۔ اور ان کے لئے قیاس و اجتہاد اور ادراک سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور ان امور کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ قیاس و اجتہاد اصل واقعہ میں اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان میں کسی قسم کا فرق محسوس نہ کیا جا سکے۔

تاریخ نویسی میں سب سے بڑی مشکل سچ لکھنا ہے۔ اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس سے لوگ خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور دشمن بن جاتے ہیں۔ خصوصاً ایسے دور میں سچ لکھنا جبکہ ملک کا ہر فرد نازک مزاج ہو۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہم کسی قوم، قبیلہ، خاندان یا فرد واحد کے متعلق پریس آرڈیننس کی رو سے ایسی کوئی سچی بات بھی نہیں لکھ سکتے جس سے ان کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ ایسے حالات میں کوئی مؤرخ آخر کیا لکھے۔ تاہم گذشتہ دور کے حالات میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں کوئی لگی لپٹی بات نہیں ہے۔ ان کے حوالہ جات دے دیئے گئے ہیں۔ ان کی تمام تر ذمہ داری پہلے مؤرخین سے متعلق ہے۔

یہ درس مجھے ضیاء الدین برنی سے ملا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "تاریخ نویسی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنی دینداری کی وجہ سے مؤرخ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جب وہ کسی بادشاہ یا اہم شخصیت (بزرگ) کی فضیلت، نیکی، انصاف اور احسان کا حال لکھے تو اس کی رذالت اور برائیوں کو نہ چھپائے۔ تاریخ لکھنے میں مصاحب کا انداز اختیار نہ کرے۔ اگر مصلحت دیکھے تو ان کو صاف الفاظ میں تحریر کرے ورنہ ذہین اور سمجھدار لوگوں کو اشارہ اور کنایہ میں بتا دے۔ اگر خوف و ہراس کی وجہ سے اپنے ہم عصری نقائص بیان نہیں کر سکتا تو قابلِ معافی ہے۔ لیکن جہاں تک گذشتہ عہد کے لوگوں کا تعلق ہے اس کو بالکل سچی باتیں لکھنی (لکھنا) چاہیئں" [1]

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۷۔ ۵۸۔

مَن صنف فقد استهدف۔ جو شخص کوئی تصنیف کرتا ہے وہ نکتہ چینی کا نشانہ بنتا ہے"

تاریخی مواد

زیرِ نظر کتاب کے مواد کے لئے میں نے جہاں پر بیسیوں کتابیں کھنگالی ہیں۔ وہاں پر سفر کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ "السفر سقری"

بعض اوقات تو سفر میں مجھے ایسا دلی صدمہ اور ذہنی کوفت ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔ یہ ذہنی کوفت اس وقت پیش آتی جب کسی ناہنجار شخص سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس حالت میں جی میں آتا کہ گھر میں پہنچ کر اس تمام مواد کو آگ لگا دوں جو جمع ہو چکا ہے۔ لیکن پھر خود اپنے آپ سے کہتا کہ کس نابکار نے تمہیں کہا کہ تم ایسا کام اپنے سر لو جس کے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ہو۔

غرضیکہ میں اگر اپنے اس بیس سالہ سفر کا حال لکھنے بیٹھ جاؤں تو اس کتاب کے برابر ایک اور سفرنامہ مرتب ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں میں نے سیت پور ضلع مظفر گڑھ، اُچ شریف، بھکر، منکیرہ ضلع جھنگ، ست گرھ ضلع اوکاڑہ، ڈیرہ اسماعیل خان، یارکھان، ناہڑ کوٹ اور لغاری بارکھان تک کا سفر کیا۔ خود ضلع ڈیرہ غازیخان کے بعض مقامات پر چند بار جانا پڑا۔ اس سفر کے دوران میں نے بعض تاریخی مقامات کو جا کر دیکھا ہے۔ جہاں کہیں سے کچھ تاریخی مواد میسّر آیا حاصل کیا اور بعض لوگوں سے زبانی حالات لئے ہیں۔ گویا کہ اپنے اس سفر میں بعض تاریخی مقامات سے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں۔ اور ان کے فوٹو حاصل کئے ہیں۔ جو اپنے اپنے مقام پر کتاب میں شامل ہیں۔ تاریخی مواد کے لئے کہیں سے ایک جملہ اور کہیں سے دو جملے جو بھی میسّر آیا لے لیا گیا۔ جنھیں جوڑ کر "مرقع ڈیرہ غازیخان" کی شکل دے دی گئی ہے۔

باب الاسلام سندھ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں یہ لکھا ہوا ملتا ہے۔

"سندھ کی تاریخ قدیم زمانے سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بے حد دلچسپ بھی ہے اور بدرجۂ غایت اہم بھی۔ لیکن اب تک منتشر اور غیر مرتّب پڑی ہے۔ سندھی یا کسی اور زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جسے سندھ کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ بھی قرار دیا جا سکے۔"

اور یہی حال مرقعِ ملتان کا ہے۔

بہر کیف مرقع ڈیرہ غازیخان کے تاریخی حالات حاصل کرنے میں ایک محتاط طریقہ اختیار کیا گیا ہے جن میں چند قابلِ ذکر امور یہ ہیں۔

- میں نے تاریخی کتب میں موجود ان خاندانوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں اس خطّہ سے رہا ہے۔
- ایسے قبائل یا خاندان جو کسی دور میں کچھ تاریخی حیثیّت رکھتے تھے۔ اور آج ان کی کوئی تاریخی حیثیّت باقی نہیں رہی ہے۔ اور وہ جس حال میں ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔
- بعض ایسے خاندان جو ڈیرہ غازیخان میں آباد ہیں اور ان کا ایک حصّہ کسی دوسرے علاقہ میں رہتا ہے اور اسے کسی قدر تاریخی حیثیّت حاصل ہے یا کسی زمانہ میں تھی ایسے خاندانوں کا ذکر بھی زیرِ نظر کتاب میں کر دیا گیا ہے۔
- بعض خاندان جو کبھی سرزمین ڈیرہ غازیخان پر تاریخی اہمیّت کے حامل تھے۔ بعد میں انھیں زوال آگیا اور یہاں سے وہ ترکِ سکونت کر گئے۔ ان کے بارے میں تحقیق کی گئی کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ چنانچہ ان کا ذکر بھی اِس کتاب میں آگیا ہے۔
- اگر تاریخ میں کسی اہم شخصیّت کا ضمناً ذکر آگیا ہے تو اس کے خاندان کا کھوج لگا کر اسے شاملِ کتاب ہٰذا کر دیا گیا ہے۔
- بعض ایسے خاندان جو پہلے سے کوئی تاریخی مقام نہیں رکھتے تھے۔ مگر آج کے انقلابی دور میں انھیں اس قابل سمجھا گیا ہے کہ آئندہ چل کر وہ اپنے خاندان کی تاریخ کے بانی بن سکتے ہیں۔ تاریخ میں جگہ دی گئی ہے۔
- بعض منظم قبائل کے خاندان اپنے تمن سے جدا ہو کر کسی دوسرے علاقہ میں جا کر آباد ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے تمن کے تابع قرار دے کر ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر غیر منظم قبائل میں ایسا نہیں کیا گیا۔
- یہ درست ہے کہ آج کے خود سری دور میں ہر شخص اپنے آپ کو وڈیرہ اور اپنے قبیلے کا سربراہ سمجھتا ہے۔ اس صورت میں کوشش کی گئی ہے کہ اس قبیلے کے ایک سردار کا ذکر کیا جائے۔ پھر بھی جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی

ہے ایک سے زائد کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

♦ مختلف قبائل کے ذکر میں عمری دور کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی ترتیب سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ جاٹ، افغان، بلوچ اور قریش و سادات کی ترتیب ہے۔

غرضیکہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ زیر نظر کتاب (مرقع ڈیرہ غازیخان) میں زیادہ سے زیادہ خاندانوں کو جگہ دی جائے اور انھیں تاریخی حیثیت حاصل ہو۔ پھر بھی کوئی خاندان جو ذکر کے قابل ہو اور رہ گیا ہو مصنف کو اس خاندان سے لاعلم سمجھا جائے۔ اس سے بدظن نہ ہوا جائے۔

حوالہ جات حوالہ جات کا طریق کار۔ اس طرح اختیار کیا گیا ہے کہ جہاں کہیں مناسب ہوا اصل کتاب کا اقتباس نقل کر دیا ہے۔ ساتھ ہی اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ اقتباس نقل کرتے وقت اصل الفاظ جوں کے توں لکھ دیئے گئے ہیں اگرچہ وہ آج متروک کیوں نہیں ہیں۔ اسی طرح انگریزی اقتباسات کو روا رکھا گیا ہے۔ ان میں بعض الفاظ کے سپیلنگ (ہجے) غلط ہیں۔

بعض کتب کے صرف حوالہ جات دیئے گئے ہیں جو حاشیہ پر درج ہیں۔ بعض مقامات پر تفصیلی حواشی درج ہیں کہ مناسب یہی سمجھا گیا۔ بعض واقعات مکرر بار آ گئے ہیں۔ ان کا ایسا ہونا ضروری ہے۔ اس میں قارئین کتاب بوریت محسوس نہ کریں۔

مؤرخین کا عام طریقہ یہی ہے کہ وہ سنین کو عنوان دے کر ان کے مطابق حالات اور واقعات لکھ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ستم سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک ہی وقت میں مختلف مقامات کا ذکر واقعات کے ربط کو توڑ دیتا ہے۔ ایک علاقہ کے حالات لکھنا ابھی باقی ہوتے ہیں کہ دوسرے علاقے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تاریخ نگاری میں وہ ربط اور تسلسل باقی نہیں رہتا۔ جو ہونا چاہیئے۔ اس طرح کتاب کے قاری کے ذوق مطالعہ اور ذہن میں ایک انتشار کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ ان حالات کو اپنے حافظہ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو کسی ایک قطعۂ زمین پر ایک ہی حکومت کے دور کے حالات کی صورتحال ہوتی ہے۔ مگر سرزمین ڈیرہ غازیخان کے تاریخی حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں پر ٹکڑے ٹکڑے پر بادشاہی کی جا چکی ہے۔ جیسے ہرند اور واجل میں ناہڑ لوئی حکومت، ڈیرہ غازیخان میں مرزائی دور اور سنگھڑ میں نتکانی حکومت کا عہد ایک ہی وقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ان قطعاتِ حکومت میں سے کسی ایک کا ایران، کابل کی حکومت کے ماتحت رہنا یا بلوچستان، سندھ

اور پنجاب سے الحاق وغیرہم۔

غرضیکہ میں نے سنین کا لحاظ کئے بغیر ہر قطعہ کی اس وقت تک تاریخ لکھ دی ہے جہاں یہ کہ مناسب سمجھی گئی۔ اور عنوان بھی اسی لحاظ سے قائم کئے گئے ہیں۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ ان تاریخی حالات میں رشتۂ ربط و ضبط قائم رہے اور کہیں سلسلۂ واقعات ٹوٹنے نہ پائے۔

معاونین میں اپنے ہر اس معاون کا شکر گزار ہوں جس نے زیر نظر کتاب کے لئے ایک جملہ یا حرف کے برابر بھی مواد مہیا کیا۔ کیونکہ اس کتاب کی تیاری اس طرح تنکا تنکا چن کر کی ہے۔ قارئین اس کا فیصد خود کریں گے۔ ان معاونین میں سے بعض کا میں خصوصیت سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ سردار محمد علی خان علیانی لغاری مرحوم	۲۔ میاں ممتاز حسین و سجاد حسین صدیقی برادران
۳۔ عبدالعزیز خان گورمانی	۴۔ عطا محمد خان جام
۵۔ ملک نسیم احمد صاحب ایڈووکیٹ	۶۔ میاں غلام رسول صاحب خوجہ
۷۔ غلام حسین خان لاشاری	۸۔ ملک غلام رسول صاحب شوق
۹۔ ظفر اللہ خان نتکانی	۱۰۔ طارق فاروق صاحب فاروقی
۱۱۔ عنایت اللہ خان لیسرام	۱۲۔ علی احمد صاحب پروفیسر
۱۳۔ خدا بخش خان اور شبیر احمد کھرانی	۱۴۔ فیاض احمد خان مستوئی
۱۵۔ اشفاق احمد خان پٹھان	۱۶۔ بشارت علی قریشی ماڈرن فوٹو گرافر جامپور
۱۷۔ عبدالمجید خان گورمانی	۱۸۔ مرزا عبدالرزاق سب انجینیر لیہ

ان معاونین کتاب میں ظفر اللہ خان۔ خدا بخش خان۔ طارق فاروق اور عنایت اللہ خان انگلش کتب کے تراجم کرنے والوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر میری مدد کی۔

یہ بات بھی قارئین کرام سے پوشیدہ نہ رہے۔ میں نے مالی معاون پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس میں بہرحال کامیاب نہ ہو سکا۔ یعنی چالیس چالیس پیسے کے لفافے بھیج کر میں نے ضلع کے سرداروں اور وڈیروں کو لکھا کہ اگر آپ زیر نظر کتاب کی اشاعت و طباعت میں مالی امداد کر سکتے ہوں تو اپنے جواب سے مجھے مطلع فرمائیں۔ لیکن ان سب نے چپ سادھ لی۔ صرف سردار محمد اکبر خان

بزدار مرحوم نے اپنے خط میں مجھ سے ملنے کی آرزو ظاہر کی تھی جو بہرحال پوری نہ ہو سکی۔

اس سلسلہ میں میں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی خدمت میں لکھا تھا۔ جس کے جواب میں بہ دستخطی خالد اقبال یاسر ڈپٹی ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے لکھا "آپ کا مکتوب مؤرخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۸۴ء موصول ہوا۔ عرض ہے کہ اکادمی کا سالانہ اشاعتی پروگرام چند حوالے اور ادبی تخلیقات کی کتابوں تک محدود ہے جو ایک طباعتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے۔"

آخر میں "نیشنل بک کونسل پاکستان اسلام آباد" سے رابطہ قائم کیا۔ اس کونسل کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہے جو ہم جیسے کم مایہ لوگوں کو کسی قسم کی مالی امداد نہیں پہنچا سکتا۔

انتساب کتاب

میں نے حتی الوسع یہ کوشش کی ہے کہ کسی قسم کی طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر سرزمین ڈیرہ غازیخان کی تاریخ لکھی جائے۔ اس میں ایک اہم مسئلہ کتاب کے انتساب کا تھا۔ جسے میں نے ایک مدت تک جوں کا توں رکھا اور اس پر کافی سوچ بچار کی۔

مجھے ایسے شخص کی جستجو اور تلاش تھی جس نے سکھوں خواہ انگریزوں کی نہ صرف مخالفت کی ہو بلکہ اپنی پوری قوت سے ان کا مقابلہ کیا ہو۔

ایسا شخص نہ ہو جو حین حیات ہو کہ اس سے مؤرخ کی طرف سے خوشامد اور ناجائز مدح سرائی کا پہلو نکل سکے۔

پس اس صورت میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس نے کسی دور میں سکھوں اور انگریزوں کی مخالفت کی ہو اور آخر وقت تک قائم رہا ہو۔ یہ جملہ صفات صرف

"نواب محمد اسد خان نتکانی"

میں پائی گئیں۔ چنانچہ میں نے زیر نظر کتاب کا "انتساب" انہیں وجوہ کی بنا پر ان کی ذات سے کیا ہے۔

آخر میں میں قارئین کرام کی توجہ چند گذشتہ باتوں کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ حالات ابتدا ہی سے اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں زیر نظر کتاب کو تکمیل تک پہنچا سکوں۔ اس کیلئے اگرچہ ہر طرح کی کوشش کی گئی مگر بے سود رہی۔ چنانچہ اب جس قدر اور جیسے ہی یہ کتاب چھپی ہے۔ اس میں ابہام بھی ہوں گے تسامحات بھی، کتابت بھی حسب منشا نہیں ہوگی اور املا کی غلطیاں بھی ہوں گی۔ یہ سب کچھ عمداً نہیں بلکہ مجبوراً رہ گئی ہیں۔ جو بہرحال قابل معافی ہیں اور ان سے درگذر کیا جائے گا۔ تاہم آپ دوستوں کی نشاندہی اور مفید مشوروں سے ان غلطیوں سے پاک دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

کم ترک الاول الآخر (پہلا مصنف دوسرے کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے)۔ یہ کتاب بہرحال بعد کے مؤرخین کے لئے نقش اول ثابت ہوگی۔

ادر

گر نجویم کہ نیست در عالم — مثل تاریخ من کتاب دگر
چوں دریں علم عالمے نیست — کہ کند گفتہ من، باور

بایں ہمہ کسی نے سقراط سے پوچھا کہ آپ کو اس قدر تحقیقات اور تدقیقات کے بعد کیا کچھ معلوم ہوا۔ فرمایا۔ "معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد" (معلوم ہوا کہ کچھ معلوم نہیں ہوا)

غلام علی خان نتکانی

ماخذِ کتاب

اگرچہ ہر مؤرخ اپنی تصنیف میں زیادہ سے زیادہ ماخذ کی فہرست دینے کی کوشش کرتا ہے اور قارئین اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اس بات کا اندازہ لگالیتے ہیں، کہ زیرِ مطالعہ کتاب کس قدر ثقہ اور تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔

مگر اس فہرست میں چند ہی ایسی کتابیں ہوتی ہیں۔ جنھیں حقیقی معنی میں ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے باقی کتب کو ہم مستفادہ کتب کہہ سکتے ہیں، ماخذ نہیں کیونکہ کتب ماخذہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے گرد اصل تصنیف کے موضوعات گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور اصل کتاب کا تعلق ان کا چربہ اتارنے سے نہیں، بلکہ ان کی روح سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں پر ایسے ہی ماخذات پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ جنہیں زیرِ نظر کتاب میں مرکزیت کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۔ **گلِ بہار**۔ رائے بہادر ہیتو رام نے جو کہ اسسٹنٹ کمشنر سب ڈویژن راجن پور کا مثل خواں تھا۔ کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مسٹر بروس صاحب اسسٹنٹ کمشنر سب ڈویژن راجن پور نے وقت کی گورنمنٹ کی ہدایات کے مطابق ضلع ڈیرہ غازیخان کے تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی اور ثقافتی وغیرہ قسم کے حالات جمع کیے، اور انہیں انگریزی زبان میں مرتب کیا، اور کتاب لکھی اور وہ کتاب انگریزی گورنمنٹ نے شائع کی تھی۔

لالہ ہیتو رام کا بیان ہے کہ وہ صاحب ممدوح کا مثل خواں تھا اور ان حالات سے بخوبی واقف ہوتا رہا۔ اور بروس صاحب کی اجازت سے اس نے انگریزی تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا ساتھ ہی بعض واقعات میں اضافہ کیا اور اس کا نام "گلِ بہار" رکھا۔

گلِ بہار میں ابواب اور فصول وغیرہ کی بجائے چمن، گل اور خار وغیرہ نام تجویز کیے۔ جس میں چار چمن، سولہ گل، چند برگ اور دو خار ترتیب دیئے گئے۔ یہ کتاب ۱۸۷۲ء میں وکٹوریہ پریس لاہور نے شائع کی۔ کتاب کی سائز عام کتب کی ہے۔ اور ۳۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں ہیتو رام نے لکھا ہے "سبب تصنیف کتاب ہذا یہ ہے۔ کہ سرکلر نمبر ۱۔ ۳۔ مؤرخہ ۲ جنوری ۱۸۶۹ء منجانب صاحب سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب بنام جملہ صاحبان کمشنر وغیرہ بموجب ہدایت گورنمنٹ ہند بدریافت

چند امورات متعلقہ تواریخ و آبادی و صورتِ حال اضلاع پنجاب جاری ہوا تھا۔ بہ تعمیل جس کے صاحب والا شان مسٹر بروس صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر سب ڈویژن راجن پور امورات تہذیبیہ سرکلر مذکور و چند امورات دیگر متعلقہ سرحد ضلع ہذا وغیرہ تحقیق فرما کر ایک کتاب بخط انگریزی ترتیب دی۔ چنانچہ کتاب مذکور گورنمنٹ عالیہ میں منظور ہو کر مطبوع ہوئی۔

یہ کمترین جو زیر تحت ممدوح کے مثل خواں تھا۔ حالات متعلقہ ضلع وغیرہ سے واقف اور آگاہ ہوتا رہا۔ بموجب حکم مقدم الوصف ترتیب اس کتاب کی مطابق انگریزی بلکہ بہ تزائد چند امورات متعلق انتظام مال و تفصیل اقوام و حال سرحد قلات وغیرہ شروع کی، امید ہے کوئی دن تک بطور یادگار رہے گا[۱] اور خاتمہ کتاب ان اشعار پر ہوا ہے جو ملک جندوڈہ نامی کسی شخص نے نظم کئے تھے۔

دلا بہ بیں کہ عجائب کتاب باغ و بہار ۔۔۔ زِحالِ ملک زِنام و نشاں شُد اظہار
عجیب حال کہ وزِ قوم مردمان بلوچ ۔۔۔ ہمہ بہ بیں کہ از دیافت انسداد بہار
ہزار مژدہ و شاباش بر مصنفِ آں ۔۔۔ چنیں کتاب بہ تحریر آمد از اسرار
اگرچہ نامِ مصنف بفاش ظاہر نیست ۔۔۔ مگر ز شش صد و پنجاہ و دو حروف شمار[۲]
سروش ہاتفِ غیبم خوش ایں بشارت داد ۔۔۔ عجیب نام کتابم جدید باغ و بہار[۳]

کتاب میں ڈیرہ غازیخان سے متعلق تاریخی حالات نہایت مختصر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں جب تک دوسری کتب تواریخ سے آگاہی حاصل نہ ہو۔ اس کتاب میں بیان کردہ اشارات اور کنایات سے استفادہ نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ اس میں جن خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں جا بجا اسقام پائے جانے کے باوجود غنیمت ہیں۔ اسی طرح گلِ بہار نے جغرافیائی اور ثقافتی حالات اور قدیم مقامی حکومتوں کا ذکر سرزمین ڈیرہ غازیخان کی تاریخی قدامت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گلِ بہار کے مطبوعہ نسخے جو مجھے ملے ہیں، اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ کرنل حاجی محمد علی خان علیانی لغاری اور زوار غلام حسن سے دستیاب ہوئے تھے۔ پہلے نسخہ میں ابتدائی ستر صفحات

[۱] دیباچہ کتاب مذکور ص ۱۔ [۲] ہیتو رام [۳] ۱۸۶۲ء (سنہ تصنیف)

اور دوسرے میں بھی اسی قدر صفحے نہیں تھے۔ پہلا نسخہ اندر سے دیمک خوردہ بھی تھا۔ اسی طرح پہلے نسخہ کی کمی جو دیمک چاٹ جانے کی وجہ سے محسوس ہوتی تھی۔ دور ہوگئی۔ مگر پہلے نایاب صفحات کی کمی برابر محسوس کی جاتی رہی۔ بالآخر ملک غلام رسول صاحب شوق کے ذاتی ذوق و شوق نے اس کمی کو پورا کرادیا۔ یعنی انہوں نے گل بہار کی ایک مکمل فوٹوسٹیٹ کاپی ہدیہ کے طور پر میرے پاس بھیج دی۔ یہ نسخہ میرے پاس محفوظ ہے۔ جبکہ پہلے دونوں اصل نسخے مالکان کو شکریہ کے ساتھ واپس کردیئے گئے تھے۔

گل بہار کا ایک نسخہ نورا حمد خان فریدی کے پاس بھی میں نے دیکھا تھا۔ جس کے ابتدائی چند صفحات بوسیدہ تھے۔ ایسا ہی ایک نامکمل نسخہ عبدالقادر خان علیانی کے پاس تھا۔ جو غالباً اب بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ کے پاس پہنچ چکا ہے۔ بہرحال یہ کتاب دوبارہ شائع نہیں ہوئی ہے۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اسے دوبارہ شائع کرانے کی کوشش میں تھی۔ جس کے پاس اب مکمل نسخہ بھی پہنچ چکا ہے۔ شاید کسی وقت شائع کرادے۔[۱]

۲ تواریخ ڈیرہ غازیخان ۔ سرزمین ڈیرہ غازیخان پر جو مفصل اور جامع کتاب لکھی گئی ہے وہ لالہ حکم چند کی ہی تصنیف ہے اس نے یہ کتاب ۱۸۷۵ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع کرائی تھی جو سرکاری طور سے شائع ہوتی۔ اس کتاب کا نام اس نے "تواریخ ڈیرہ غازیخان" رکھا۔ یہ کتاب بڑی تقطیع پر ہے۔ جس کے اڑھائی ہزار کے قریب صفحات ہیں۔ چونکہ اس کتاب کے نسخے جو میسر ہوئے ہیں۔ ان میں چند ابتدائی صفحات نہیں تھے اس لئے اس کتاب کی وجہ تالیف و تصنیف معلوم نہیں ہوسکی۔ اس میں ڈیرہ غازیخان کے تاریخی حالات مختصر ہیں مگر یہ کتاب معلومات افزا ضرور ہے۔ یوں بھی اس خطہ کے ذرہ ذرہ کا حال اس میں درج ہے مصنف کی تحقیق اور محنت کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس کتاب کے دو نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ محمود خان بزدار ایڈیٹر ہفت روزہ بلال ڈیرہ غازیخان کے پاس تھے۔ اسی طرح نامکمل دو نسخے محافظ خانہ اور اور تحصیل لائبریری ڈیرہ غازیخان میں موجود ہیں۔ اور ایک نامکمل نسخہ راقم کے پاس ہے۔

تواریخ ڈیرہ غازیخان دراصل یہاں کے باشندوں ان کے رسم و رواج، تاریخی، اقتصادی

[۱] بلکہ شائع کرادی گئی ہے۔

معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور جغرافیائی حالات پر لکھی گئی ہے۔ جسے قانونی حیثیت حاصل ہے اور اس کا نام "تواریخ ڈیرہ غازیخاں رواج عام" ہے۔ اور اس کی ثانوی کتاب جو عوام الناس کیلئے شائع کیگئی ہے۔ اس سے "رواج عام" کا لفظ حذف کرکے اس کا نام تواریخ ڈیرہ غازیخان رکھ دیا گیا۔

تواریخ بلوچستان ۔ سرزمین ڈیرہ غازیخان پر چونکہ زیادہ تر بلوچوں کو تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسلیئے تواریخ بلوچستان کو اس خطہ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب لالہ ہتو رام کی تصنیف ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۵ء تک ضلع ڈیرہ غازیخان میں اور ۱۸۹۶ء تک بلوچستان میں ملازم رہا۔ یوں بھی اس کا تعلق بلوچی علاقہ سے تھا اسلیئے اسے تاریخ بلوچستان لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے "تواریخ بلوچستان" نام کی یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں وکٹوریہ پریس لاہور میں چھپی، اس کی سائز عام کتب سے بڑی اور بڑی تقطیع سے چھوٹی گویا کہ درمیانہ سائز ہے۔ جو چار ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے ۳۶۷ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں بلوچستان کی باشندہ جملہ اقوام کے حالات درج ہیں۔ بلوچوں کا اس میں ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

تواریخ بلوچستان کی تصنیف و تالیف کی وجوہات ہتو رام نے یہ بیان کی ہیں۔

اگرچہ بعض مؤرخوں نے بزبان فارسی یا انگریزی کچھ حال بلوچستان کا قلمبند کیا ہے۔ مگر اب تک کوئی صحیح اور مکمل تواریخ بلوچستان کی نہیں پائی جاتی ہے۔ مجھکو بوجوہات ذیل اس تاریخ لکھنے کی رغبت پیدا ہوئی۔

اوّل ۔ میں خود باشندہ بلوچستان کا ہوں، کہ میرا وطن راجن پور سب ڈویژن ڈیرہ غازیخان ہے جو کہ ایک جزو بلوچستان کا ہے۔

دوئم ۔ ابتدائے سال ۱۸۵۹ء لغایت سال ۱۸۷۵ء ضلع مذکورہ میں اور بعد ازاں لغایت ۱۸۹۶ء بلوچستان میں میرا تعلق بذریعہ ملازمت سرکاری بصیغہ پولیٹیکل رہا۔

سوئم ۔ ابتدائے ملازمت سے تا دم حال مجھ کو شوق جمع کرنے حالات متعلقہ تواریخ بلوچستان کا دامن گیر رہا۔ چنانچہ سال ۱۸۷۳ء میں جبکہ میں سب ڈویژن راجن پور کا سررشتہ دار تھا

میں نے ایک کتاب موسومہ گل بہار متضمن تواریخ وغیرہ حالات ضلع ڈیرہ غازیخان تصنیف کی تھی۔ - - - - - - - - - - اس میں بھی میں نے بہت کچھ حال اقوام بلوچی کا لکھا تھا۔ مگر اس وقت اس قدر میسّر نہ تھا۔ کہ میں تواریخ تمام ملک بلوچستان کی تحریر کرسکتا [1] غرضیکہ ۱۹۷۳ء میں تواریخ بلوچستان کا دوسرا ایڈیشن بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔ اب یہ کتاب ہر لائبریری میں دستیاب ہے اور راقم کے پاس اس کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ ہے۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب: تذکرہ رؤسائے پنجاب دراصل "پنجاب چیفس" کا اردو ترجمہ ہے اصل کتاب "سرلیپل اچ گریفن" نے لکھی تھی اور سول اینڈ ملٹری پریس لاہور میں ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا پہلا ترجمہ غالباً "رؤسائے پنجاب" نام سے پنڈت موتی لعل نے کیا۔ اور دوسری بار اس کا ترجمہ "تذکرہ رؤسائے پنجاب" نام سے سید نوازش علی نے ۱۹۱۲ء میں کیا۔ ایک اور ترجمہ جو رئیسانِ پنجاب کے نام سے ہے، اور اس کی جلدیں بڑی تقطیع پر ہیں۔ اس کے مترجم کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔ اسی طرح ایک اور مترجم کا ترجمہ "صحیفۂ زریں" نام سے مشہور ہے۔ پہلے تین ترجمے میری نظر سے گزرے ہیں۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب میں پنجاب کے متعدد بڑے خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے روشن ہے۔ یہ کتاب عام سائز کی ہے، اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو ۷۰۰ صفحات کے قریب ضخیم ہے۔ ہر جلد دوسری جلد کے برابر ہے۔ اس کتاب میں اس وقت کے سرداروں کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔

دوسری کتاب جو رئیسانِ پنجاب کے نام سے لکھی گئی ہے اس میں برصغیر کے والیانِ ریاست کے تاریخی حالات ان کے فوٹو اور شجرہ ہائے نسب دیئے گئے ہیں۔ بہرکیف تذکرہ رؤسائے پنجاب اگرچہ تاریخی لحاظ سے ایک معلوماتی کتاب ہے۔ لیکن اس کی تاریخی حیثیت کی ذمہ داری صاحبِ تصنیف نے قبول نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس کتاب کے مواد کا تعلق زیادہ تر

[1] دیباچہ کتاب مذکور ص ۱۔

زبانی بیانات پر ہے، اور یہ حالات، ہر قبیلے کے متعلقہ افراد نے بہم پہنچائے تھے۔ جو ان کی خاندانی روایات میں سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ چنانچہ تذکرہ رؤسائے پنجاب میں اس سلسلہ میں یہ بیان دیا گیا ہے۔ لیکن عام قاعدہ یہ رکھا گیا ہے کہ ان اشخاص کا حال لکھا گیا ہے جو اس وقت قدر و منزلت اور ثروت اور رسوخ اور زور رکھتے تھے۔ یہ بات نہیں ہوسکی کہ اس کتاب میں ہر ایک امر کے واسطے جو بیان دیا گیا ہے سند دی جائے۔

اوّل - اوّل تو ہر رئیس نے اپنے خاندان کا حال لکھ کر بھیجا کوئی ایسا تھا کہ پورا نہ تھا اور تھوڑا تھا کوئی ایسا پورا پورا اور سلسلہ وار بہت حالتوں میں مبالغہ آمیز اور غلط۔

دوئم۔ دفتر سرکار سکھاں سے بہت کچھ حال لیا گیا۔

سوئم۔ پنجاب کے متعلق جو تواریخ، سفرنامے اور تذکرے انگریزی، فارسی اور اُردو میں ہیں تقریباً دیکھے گئے۔

چہارم۔ جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض اشخاص ان میں شریک تھے یا انہوں نے سن رکھا تھا۔ یا ان کے میراثیوں وغیرہ کے بیانات سے دلچسپ واقعات دریافت کیئے گئے [1] تذکرہ رؤسائے پنجاب مجھے ملک نسیم احمد ایڈوکیٹ ڈیرہ غازیخان نے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کو دی تھی۔ اس سے استفادہ کے بعد واپس کردی۔ یہ کتاب دیمک خوردہ تھی اور اکثر سرداروں کے فوٹو بھی اس میں نہیں تھے۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازیخان کی لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے۔ اور رئیسان پنجاب بھی وہاں پر دیکھی گئی ہے۔ یہ کتابیں دوبارہ شائع نہیں ہوئی ہیں۔

ڈسٹرکٹ گزیٹئرز۔ یہی حال مختلف اضلاع اور صوبوں کے گزیٹئرز کا ہے۔ کہ یہ سب لوگوں کے دیئے گئے زبانی بیانات پر مبنی ہیں جن کی تاریخی حیثیت تذکرہ رؤسائے پنجاب سے زیادہ نہیں ہے۔

تاریخ بلوچیاں: "تاریخ بلوچیاں یا بلوچ پنجاب میں" غلام رسول خان کورائی کی تصنیف ہے۔ اور تذکرہ رؤسائے پنجاب" کی لفظ بہ لفظ نقل ہے۔ البتہ بعض مقامات پر کہیں کہیں اضافہ مل جاتا ہے۔ یہ کتاب روز بازار ایکٹرک پریس امرتسر سے چھپی تھی۔ لیکن اس کا سن تصنیف معلوم نہیں ہوسکا۔ کتاب کی سائز عام کتب سے بڑی ہے اور ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اے ہیٹران دا پنجاب فرنٹیئر: یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ جیسا کہ

[1] —

اس کے نام سے واضح ہے۔ مسٹر ایڈورڈیس جب ڈیرہ جات کی مہم پر آیا اور اپنی روزمرہ کی کارروائی کی رپورٹ اپنے افسر ریزیڈنٹ لاہور کو بھیجا کرتا تھا۔ بعد میں اس نے اس روزانہ ڈائری کے مواد کو کتابی شکل دے کر شائع کرا دیا۔ گویا کہ یہ اس کا ایک روزنامچہ ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور بڑی تقطیع میں ہے۔ پہلی جلد ۴۳۵ اور دوسری ۵۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ گورنمنٹ پاکستان نے حال ہی میں یہ کتاب دوبارہ شائع کی ہے جو فیروز لمیٹڈ سرکلر روڈ لاہور سے چھپی ہے معلوماتی کتاب ہے۔ ہر لائبریری میں اس کا سیٹ موجود ہے۔ میرے پاس اس کا ایک سیٹ ملک غلام رسول صاحب شوق نے بڑے جذبے اور شوق سے نذرانہ کے طور پر بھیجا تھا۔ اور وہ محفوظ ہے۔

نیریٹو آف وَیری اَس جَرنیز اِن بلوچستان، افغانستان اینڈ دا پنجاب۔

یہ کتاب دراصل ایک سفرنامہ ہے۔ جو مسٹر چارلس میسن کی تصنیف ہے یہ شخص ایڈورڈس سے بائیس سال قبل اس راہ (ڈیرہ غازیخان) سے گزرا تھا۔ اس نے یہاں کے بعض حالات بچشم خود دیکھے تھے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ حال ہی میں حکومت پاکستان نے اسے دوبارہ شائع کرایا، اور ہر لائبریری میں دستیاب ہے۔

۶- **تاریخ پنجاب**۔ تاریخ پنجاب سید محمد لطیف کی تصنیف ہے۔ سید محمد لطیف ہوشیارپور (مشرقی پنجاب) میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر ملازم تھا۔ یہ کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی تھی اور ۷۵۰ کے قریب اس کے صفحات ہیں۔ اگرچہ اس کتاب کا نام تاریخ پنجاب ہے، لیکن یہ زیادہ تر سکھوں اور انگریزی دور کے شروع کے حالات پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

۷۔ مُرقّع ملتان

۸۔ تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان از منشی چرنجیت لال مطبوعہ ۱۸۷۸ء

۹۔ تواریخ سیالکوٹ از منشی امین چند ۱۸۶۷ء

۱۰۔ تاریخ گوجرانوالہ از علامحمد قانونگو قسمت امرتسر

۱۱۔ تاریخ گجرات از مرزا محمد اعظم بیگ مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۲۔ تاریخ جہلم از مرزا محمد اعظم بیگ مطبوعہ ۱۸۸۰ء

۱۳۔ تاریخ پشاور از رائے بہادر منشی گوپال داس مطبوعہ ۱۸۶۹ء

۱۴۔ تحفۃ الکرام (تاریخ سندھ) از میر شیر علی قانع ٹھٹوی ترجمہ اختر علی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی

۱۵۔ تاریخ سندھ از ظفر احمد ندویؔ

۱۶۔ تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ از غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی

۱۷۔ عبرت کدۂ سندھ از موری یوز فرم ینگ ایجپٹ ترجمہ محمد ضامن کنتوری نفیس اکیڈیمی کراچی

۱۸۔ تاریخ سیستان

۱۹۔ تاریخ پاک و ہند از پروفیسر سید عبد القادر پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

۲۰۔ خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی، ترجمہ ناظر حسن زیدی مرکزی اردو بورڈ لاہور

۲۱۔ خطۂ پاک اوچ (تاریخ اوچ) از مسعود حسن شہابؔ اردو اکیڈمی بہاولپور

۲۲۔ حیاتِ افغانی از محمد حیات خان مطبوعہ ۱۸۶۵ء

۲۳۔ آئینہ حقیقت جہاں نما (تاریخ ہند) از اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔

۲۴۔ تاریخ شیر شاہی از عباس علی خان شیروانی ترجمہ مظہر علی خان ولاؔ نفیس اکیڈیمی کراچی۔

۲۵۔ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق مرکزی اردو بورڈ لاہور

۲۶۔ عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمانؒ ندویؔ

۲۷۔ ٹاڈ راجستان از ٹاڈ صاحب ترجمہ ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد مطبوعہ ۱۹۰۷ء

۲۸۔ تاریخ ملک عراق

۲۹۔ تاریخ شام از ڈاکٹر فلپ۔ کے حتی ترجمہ غلام رسول مہرؔ

۳۰۔ تاریخ لبنان از ڈاکٹر فلپ۔ کے حتی ترجمہ غلام رسول مہرؔ

۳۱۔ نوعِ انسان کی کہانی از ہینڈرک وَن لون

۳۱۔ علم الاقوام۔ از ڈاکٹر بیرن ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین

۳۲۔ تاریخ اقوامِ عالم ۔

۳۳۔ قاموس المشاہیر از نظامی بدایونی ۔

۳۴۔ اخبار الطوال ۔ ترجمہ مرزا محمد منوّر ۔

۳۵۔ اِنسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ۔

۳۶۔ اِسلامی اِنسائیکلوپیڈیا ۔

۳۷۔ اردو انسائیکلوپیڈیا ۔

۳۸۔ تاریخ طبری ۔ ترجمہ سید محمد ابراہیم ندوی ۔

۳۹۔ طبقات ابن سعد ترجمہ علامہ عبداللہ العمادی شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی ۔

۴۰۔ مقدمہ تاریخ ابن خلدون ۔ ترجمہ مولوی عبدالرحمن مطبوعہ سنہ ۱۹۳۲ء ۔

۴۱۔ تاریخ ابن خلدون ۔ ترجمہ ڈاکٹر عنایت اللہ و علامہ حکیم احمد حسین الٰہ آبادی ۔

۴۲۔ تاریخ کا مُطالعہ ۔ از عبدالباری علیگ شائع کردہ مکتبہ اُردو ادب لاہور ۔

۴۳۔ آثار الصنادید از سر سید احمد خان ۔

۴۴۔ فتوح البلدان از علامہ بلاذری ۔ ترجمہ سید ابوالخیر مودودی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

۴۵۔ تاریخ اِسلام از مُعین الدین احمد ندوی ۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ (انڈیا)

۴۶۔ تاریخ اِسلام از اکبر شاہ خان نجیب آبادی مطبوعہ سنہ ۱۳۴۳ھ ۔

۴۷۔ سفرنامہ اِبن بطوطہ ۔ ترجمہ رئیس احمد جعفری ۔

۴۸۔ دربارِ اکبری از مولانا آزاد ۔

۴۹۔ تزکِ تیموری ۔

۵۰۔ تزکِ بابری ۔

۵۱۔ تزکِ جہانگیری ۔

۵۲۔ اُردو اِنسائیکلوپیڈیا ۔ از انجمن اُردو دائرہ معارف اِسلامیہ ۔

۵۳۔ بہادر شاہ ظفرؔ ۔ از رئیس احمد جعفری ۔

۵۴۔ الفاروق ۔ از علامہ شبلی نعمانیؒ ۔

۵۵۔ آبِ حیات از شمس العلماء محمد حسین آزادؔ ۔

۵۶۔ مقالاتِ شبلیؒ ۔ از علامہ شبلی نعمانی ۔

۵۷۔ معارف (ماہنامہ) دار المصنفین اعظم گڑھ (انڈیا) جون جولائی سنہ ۱۹۳۹ء ۔

۵۸۔ برہان (ماہنامہ) ندوۃ المصنّفین دہلی (انڈیا) ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء ۔

۵۹۔ برہان (ماہنامہ) ندوۃ المصنّفین دہلی (انڈیا) نومبر سنہ ۱۹۶۲ء ۔

۶۰۔ خلاصہ سیئرۃ المتاخرین ۔ ترجمہ علامہ چراغ دین محمود جھنگوی ۔

۶۱۔ احسن البیان یعنی تواریخ بلوچاں از محمد حیات خان بیدارؔ ۔

۶۲۔ ازمنۂ بلوچ از میر خدا بخش خان مری بجارانی ۔

۶۳۔ اِصلاح (ماہنامہ) ڈیرہ غازیخان ۔ سنہ ۱۹۳۹ء ۔

۶۴۔ تعارف (جائزہ (رسالہ) ڈیرہ غازیخان ۔ سنہ ۱۹۶۲ء ۔

۶۵۔ اِنتخاب ماہِ نو (رسالہ)

۶۶۔ شعر العجم از علامہ شبلیؒ نعمانی ۔

۶۷۔ حیاتِ سلیمان از مولوی صالح محمد خان ۔

۶۸۔ تذکرۂ سلیمان (ترجمہ نافع السالکین) از صاحبزادہ محمد حسین مَلّی ۔

۶۹۔ تفسیر ابن کثیر مطبوعہ کارخانۂ تجارت کراچی ۔

۷۰۔ شرح دیوانِ فرید از عزیز الرحمن عزیزؔ بہاولپور ۔

۷۱۔ اشاراتِ فرید ۔ شائع کردہ انجمن گلزار فریدیہ ملتان ۔ سنہ ۱۳۲۶ھ

۷۲۔ تذکرہ صوفیائے سندھ از اِعجاز الحق قدوسی ۔

۷۳۔ سفینۃ الاولیاء از دارا شکوہ ۔ ترجمہ ابوالفضل پیر غلام دستگیر ۔

۷۴۔ حدیقۃ الاولیاء از مفتی غلام سرور لاہور ۔

۷۵۔ ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم ۔ ترجمہ رشید احمد ندوی ۔

۷۶۔ ریکارڈ محکمہ مال از بندوبست قانونی ۔ سنہ ۱۸۷۲ء ۔

کتب فارسی

۱۔ تاریخ فرشتہ از محمد قاسم ہندو شاہ، مشہور فرشتہ، مطبوعہ نول کشور دہلی ۔

۲ ۔ آئینِ اکبری ۔
۳ ۔ اکبر نامہ ۔
۴ ۔ شاہجہان نامہ ۔
۵ ۔ ظفرنامہ رنجیت سنگھ از دیوان امرناتھ ۔
۶ ۔ مناقب المحبوبین از نجم الدین جھنجوی ۔
۷ ۔ اِنتخاب مناقب سلیمانی مطبوعہ حمیدیہ سٹم پریس لاہور سنہ ۱۳۲۵ھ

٭ کتب عربیہ ٭

۱ ۔ سبائکُ الذہب ۔

٭ کتب اِنگلش ٭

. DISTRICT GAZETTERS OF D.G.KHAN [illegible]-97.

2. DISTRICT GAZETTERS OF D-I-KHAN.

3. DISTRICT GAZETTERS OF MUZAFFARGARH
(1883) (1929)

4. DISTRICT GAZETTERS MULTAN (1901).

5. DISTRICT GAZETTERS OF MUZAFFARGARH
TEH.LEIAH (1916)

6. DISTRICT GAZETTERS OF MIANWALI (1915)

7. DISTRICT GAZETTERS OF SHAH PUR (1883)

8. STATE GAZETTERS OF BAHAWALPUR (1904)

9. GAZETTERS OF THE PUNJAB PROVINCE (1880)

10. THE COUNTRY OF BALUCHISTAN (1877)

11. HISTORY OF THE AFGHANS IN INDIA (1961)

12. A GLOSSARY OF THE TRIBES AND CASTES
OF THE PUNJAB AND NORTH, WEST
FRONTIER PROVINCE (Vol.IInd & IIIrd)

13. PUNJAB CASTES (FIRST REPRINT) (1974)

14. A YEAR ON THE PUNJAB FRONTIER
(Vol. Ist & IInd)

CamScanner

عُلمائے تاریخ کا نظریۂ تاریخ

○ علم تاریخ دنیا کی تمام قوموں میں رائج اور متداول ہے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو بھی اس فن کا ایسا ہی ذوق و شوق ہے جیسا کہ اکابرین، سلاطین کو۔

(رئیس المؤرخین علامہ ابن خلدون)

○ انسانی علوم میں سب سے مفید خود انسانی زندگی کا علم ہے مگر اسی نے سب سے کم ترقی کی ہے۔

(روسو)

15. NARRATIVE OF VARIOUS JOURNEYS BALUCHISTAN, AFGHANISTAN AND THE PUNJAB (1842)

16. REVISED PEDIGREE - TABLES OF THE FAMILIES MENTIONED CHIEF AND FAMILIES OF NOTE IN THE PUNJAB (1940)

17. ISLAMISATION OF BANKING SYSTEM IN PAKISTAN

18. FEDERAL SHARIAT COURT IN PAKISTAN

19. INTRODUCTION OF HUDOOD LAWS IN PAKISTAN

20. ISLAMIC UNIVERSITY AND INSTITUTE OF TRAINING IN SHARIAH AND LEGAL PROFESSION

ابتدائیہ

علمِ تاریخ۔ علم تاریخ بھی دنیا کے دیگر علوم متداولہ کی طرح ایک علم ہے۔ جس طرح علم ادب فلسفہ اور مصوری وغیرہ۔ بلکہ علم تاریخ کو اور علوم پر یک گونہ اہمیت حاصل ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جملہ علوم انسان کے وجود میں آنے کے بعد منصۂ شہود پر آئے۔ جبکہ علم تاریخ تخلیق آدم کے ساتھ وجود میں آچکا تھا۔ یعنی عالم ہست و بود کا پہلا دن گویا کہ علم تاریخ کا اولین دن تھا۔ چنانچہ اخباریین اسی دن سے تاریخ عالم کا آغاز کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے، یا کوئی غیرمعمولی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ تو اس کی تاریخ اسی روز سے شروع ہو جاتی ہے۔ جس دن کہ وہ واقعہ ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اور "علم تاریخ" کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

اردو سائیکلوپیڈیا میں تاریخ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے، "تاریخ، عربی زبان کا مصدر ہے۔ تاریخ کے لغوی معنی کسی واقعہ یا حادثے کو تحریر میں متعین کرنا ہے۔ اصطلاح میں تاریخ عہد ماضی کے حالات، واقعات، حادثات کے بیان کو کہتے ہیں۔ علامہ شبلی تاریخ کی تعریف میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں تغیرات پیدا کئے ہیں۔ اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے۔

ایک اور حوالے سے لکھتے ہیں ان حالات اور واقعات کا پتہ لگانا جن سے یہ دریافت ہو کہ آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات اور مذاہب موجود ہیں۔ سب گذشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا۔ اسی کا نام تاریخ ہے۔

تاریخ اگرچہ مختلف علوم وفنون، نباتات اور حیوانات کی بھی ہو سکتی ہے مگر عام طور پر اس کا اطلاق انسانی زندگی پر کیا جاتا ہے، دنیا میں جب اور جہاں کوئی انسانی گروہ موجود رہا ہے، علم تاریخ بھی اس کے ساتھ ساتھ رہا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے۔ کہ کسی قوم کی

تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے روح انسانی کی ایک حرکت ہے، روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں، بلکہ تمام عالم اسکا ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔[1]

علم تاریخ کے ماہروں نے زمانہ کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ایک ماقبل تحریر عہد اور دوسرا مابعد تحریر دور، ماقبل تحریر عہد سے مراد یہ ہے۔ کہ اس زمانہ کے حالات و واقعات کا پتہ لگایا جائے جس وقت کہ کوئی تحریر عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ پھر ماقبل تحریر دور کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں "آثارِ قدیمہ" دوسرے میں طبیعی علم الانسان اور تیسرے حصہ میں لسانیات سے بحث کی گئی ہے۔ آثارِ قدیمہ جسے ہم قدیم حجری دور بھی کہتے ہیں، اور اس زمانہ کے کتبات، سکے، مہریں، اوزار، ظروف، طرزِ تعمیرات اور فنون لطیفہ قسم کی متعدد اشیاء ملتی ہیں جن سے ہم بڑی حد تک مدد لے سکتے ہیں جیسا کہ وادیٔ سندھ (موہنجودڑو اور ہڑپہ) بلوچستان وسیستان اور وادی دجلہ و فرات میں کھدائی سے نکلنے والی اشیاء اس بات کا بخوبی ثبوت پیش کرتی ہیں۔ کہ یہاں کی تہذیب ایک ہی نسل کے لوگوں کی تہذیب ہے۔

طبیعی علم الانسان یعنی وادیٔ سندھ، بلوچستان، سیستان اور وادیٔ دجلہ فرات سے نکلنے والی ممی اور انسانی کھوپریوں سے اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح علم لسانیات کے ماہروں نے دنیا کی مختلف زبانوں کا جائزہ لے کر ان کے متعدد خاندان بنا دیئے ہیں جن میں سے ایک سُمیری، دراوڑی یا بروہی زبان کا خاندان ہے۔

تاریخ کے دوسرے دور مابعد تحریر عہد سے مراد وہ زمانہ ہے جبکہ اس دور کی کوئی تحریر آج ہمیں ملتی ہے، اگرچہ وہ ہمارے پاس نقل در نقل پہنچی ہے یا اس کے بھی بعد کی کسی تحریر سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور زمانہ مابعد تحریر کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ عمرانیات کا ہے۔ دوسرا مذاہب عالم کا اور تیسرا حصہ تاریخ صنعت سے تعلق رکھتا ہے۔

مذاہب عالم کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ بنی نوع انسان کا مذہب صرف اسلام ہی رہا ہے مگر انسان نے خود اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس طرح انسان کئی مختلف گروہوں میں بٹ کر رہ گیا۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے "ابتداً سارے انسان ایک ہی

[1] گفتارِ اقبال ص ۱۵۳۔

اُمت تھے بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیئے"[1]

تیسرے حصہ تاریخ صنعت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جوں جوں انسانی آبادی بڑھتی گئی اور انسانی ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، تو ان روز افزوں ضرورتوں کے پیش نظر مختلف انسانی گروہ وجود میں آتے گئے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ذمہ کچھ کام لے لئے جو کہ ایک عرصہ بعد ایک مستقل پیشہ کی صورت اختیار کر گئے۔ اس طرح وہ لوگ ایک پیشہ ور گروہ بن کر رہ گئے۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف پیشے طوفان نوح سے قبل دنیا میں موجود تھے۔ سورۃ الشعراء میں ہے "جب کہا ان کو ان کے بھائی نوحؑ نے کہا تم کو ڈر نہیں؟ میں تمہارے واسطے پیغام لانے والا ہوں، معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور میں مانگتا نہیں تم سے کچھ نیگ (مزدوری)، میرا نیگ ہے۔ اِسی جہان کے صاحب پر، ڈرو اللہ سے میرا کہا مانو۔ بولے، کیا ہم تجھ کو مانیں؟ اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں۔ کمینے (پیشہ ور) کہا مجھ کو کیا جاننا ہے جو کام وہ کر رہے ہیں"

اِس سے معلوم ہوا کہ تاریخ صنعت۔ بھی اِس قدر قدیم ہے۔ جس قدر کہ خود انسانی تاریخ۔ اور پہلے حصہ عمرانیات سے مراد یہ ہے کہ اِنسانی تاریخ میں جملہ اِنسانی قبائل کے تہذیب و تمدن معاشی و معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اِس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ماضی اور حال کے سلسلہ کی دو کڑیاں نظر آنے لگیں۔ قرآن حکیم نے قصہ ہائے آدمؑ و حوّا، نوحؑ، عاد و ثمود اور عالیق وغیرہ اور ان کی تاریخ بیان کر کے تاریخ کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے، اور دوسری جانب "علم تاریخ" کو ایک صحت مند اور مستقل فن تحریر بنا دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے مسلمان مؤرخین نے اس فن کو اِس قدر ترقی دی کہ اِسلامی عہد میں ضبطِ تحریر میں آنے والی سب سے پہلی کتاب تاریخ کی کتاب تھی، جو حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے لکھی گئی "الملک والاخبار الماضین" تھا۔ اس کتاب کی تالیف و تصنیف کیلئے عُبید بن سُریہ کو بلایا گیا۔ جو صنعا کا باشندہ تھا اور اسے عرب و عجم کے اکثر معرکے یاد تھے، وہ ان تواریخی واقعات کو زبانی بیان کرتا جاتا تھا۔ اور کاتبین انہیں قلمبند کرتے گئے۔

[1] سورۃ یونس۔

چنانچہ اس کے بعد دوسری صدی ہجری میں عوانہ بن الحکم کا نام لیا جاتا ہے۔ جو اخبار و انساب کا ماہر تھا اور ۱۴۷ھ میں جب علم تفسیر، حدیث اور فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی تاریخ و رجال کے فن پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، غرضیکہ اس کے بعد فنِ تاریخ کے بڑے بڑے اور نامور مؤرخ پیدا ہوئے۔ اور علم تاریخ کو عروج کمال تک پہنچا دیا۔

علامہ شبلیؒ بیان کرتے ہیں، فنِ تاریخ کی ابتدا قصہ اور افسانہ سے ہوئی ہے یعنی خاندان کے لوگ اپنے باپ دادا کے قصے بیان کیا کرتے تھے۔ جب تہذیب تمدن آیا تو یہی قصے قلمبند ہو کر تاریخ بن گئے۔ اس بنا پر جس قدر قدیم تاریخیں ہیں۔ ان میں لڑائی اور جنگ و جدل کے علاوہ ملکی نظم و نسق کے واقعات، کم ملتے ہیں۔

اقسامِ تاریخ۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں، مختلف اعتبار سے تاریخ کی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً باعتبار کمیت دو قسمیں عام اور خاص ہو سکتی ہیں عام تاریخ وہ ہے جس میں ساری دنیا کے آدمیوں کا حال بیان کیا جائے۔ خاص وہ جس میں کسی ایک قوم یا ملک یا ایک خاندان کی سلطنت کا حال بیان کیا جائے، اور باعتبار کیفیت تاریخ کی دو قسمیں روائتی اور درائتی ہیں[1]۔ روایت سے مراد یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کے ذریعے سے بیان کیا جائے جو خود اسی واقعہ میں موجود تھا۔ اور اس سے لیکر اخیر راوی تک روایت کا سلسلہ تواتر کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ساتھ ہی تمام راویوں کی نسبت تحقیق کیا جائے کہ وہ صحیح الروایہ اور ثقہ تھے یا نہیں؟

درایت سے یہ مراد ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید و تنقیح کی جائے اور خبر کے اصول و قواعد پر جانچا جائے۔ چنانچہ روائتی اصول کے مطابق جو قاعدے اور کلیئے مرتب کئے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں

اول" راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا وہ واقعہ کی مکمل تصویر ہے؟ یا اس سے کوئی اِحتمال پیدا ہوتا ہے۔ کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا۔

دوم۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اس کے قیاس

[1] تاریخ اِسلام از اکبر شاہ خان نجیب آبادی ص ۳۱۔

اور رائے کا کتنا حصہ شامل ہے۔

سوم ۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے، تو اسی نسبت سے اس کے ثبوت کی شہادت بھی قوی ہے یا نہیں؟

چہارم ۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے اِستداد اور مختلف راویوں کے طریق ادائے اصل روایت میں کیا کیا اور کس قسم کی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں؟ وغیرہ

اسی لئے تاریخ نگار کیلئے بھی چند ضروری امور کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ :۔

۱ ۔ کسی مؤرخ کیلئے یہ بات کہ وہ کسی خبر سے پہلے اپنی رائے الگ رکھتا ہو اور رد اپنی رائے کے مطابق اس خبر کو پا کر قبول کرے۔

۲ ۔ اکثر لوگ ناقلین اخبار کو ثقہ اور معتبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان پر اعتبار کی بجائے ان کے حال کی تحقیق ضروری ہے۔

۳ ۔ اخبار و احوال والوں کو ان کے خارجی واقعات سے مطابقت نہ دینا، جبکہ بعض باتیں حقیقت کے خلاف پائی جاتی ہیں۔

۴ ۔ بیشتر لوگ اہلِ منصب و وجاہت کی بے جا تعریفیں کر کے ان کا تقرّب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح وہ غلط باتیں تاریخی ماخذ میں شامل ہو جاتی ہیں۔

۵ ۔ ایک تاریخ نگار کیلئے ضروری ہے، کہ وہ فکرِ صحیح اور استقلالِ طبیعت رکھتا ہو۔ جو اسے کسی واقعہ کے صحیح نتیجہ تک پہنچا سکیں اور لغزش و اغلاط سے بچائیں۔ اور کتبِ تاریخ کے قارئین کے متعلق کہا گیا ہے کہ جس طرح تاریخ کا مرتب کرنا اور تاریخ کی کتاب کا لکھنا ایک مشکل اور دشوار کام ہے، اس کا پڑھنا اور مطالعہ کرنا ایک ذمہ داری کا کام ہے۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے صحیح طور پر اس وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، کہ تاریخ پڑھنے والا اسے عبرت آموزی کیلئے پڑھے، اور تعصّب اور بغض کی عینک اتار کر پڑھے۔ بصورت دیگر وہ اپنے ذہن میں پہلے سے موجود نظریات اور خیالات کے مطابق جس چیز کو پائے گا اسے فوراً قبول کرے گا اور اگر کوئی واقعہ اس کے برعکس ہوگا، تو اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ تاریخ کی اس کتاب سے کوئی فائدہ اٹھا نہ سکے گا۔

علمِ تاریخ کی اہمیت و افادیت ۔ ہمارے علمائے کرام کا بیان ہے کہ قرآن حکیم میں چھ قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ تاریخ سے متعلق ہے اور ان تاریخی بیانات کی افادیت یہ بتائی گئی ہے، کہ ہم ان تاریخی واقعات کا بغور مطالعہ کریں اور ان میں فکر پیدا کریں اور عبرت پکڑیں، تاکہ قرونِ ماضیہ کے حالات کی روشنی میں اپنے حال اور مستقبل کیلئے ایک قابلِ عمل راہ متعین کر سکیں۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہمارے نبیؐ تو ان لوگوں کو گزشتہ قصے سنا" تاکہ وہ فکر کریں اور نصیحت پائیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم اس تاریخ سے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل پر قیاس کر کے اپنے لئے ایک صدق و صفا کی راہ متعین کر سکتے ہیں۔ اور قرونِ ماضیہ کے واقعات کی روشنی میں ہمیں ایسے اسباب تلاش کرنے کا موقع ملتا ہے، جنہیں اختیار کر کے ہمارے اسلاف نے دنیا میں ایک خوشحال اور قابلِ عمل زندگی بسر کی۔ اور اس کے نقوشِ تاریخ کے اوراق میں چھوڑے اس کے برعکس ہم ان عوامل اور عوارض پر بھی غور کرتے ہیں۔ جن سے وہ رو بہ تنزّل ہو کر صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے کہ نشان تک باقی نہ رہا۔

یہی تاریخ ہمیں دنیا کے حالات و واقعات سے روشناس کراتی ہے۔ اس سے ہم بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اور یہی تاریخ اِنسانی زندگی کے ابتدائی حالات سے ہمیں واقف کراتی ہے۔ اور یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں اِنسانی زندگی کی یہ ریل پیل کب اور کیسے ہوئی، ان قوموں اور سلطنتوں کے قیام کس طرح عمل میں آئے اور ان مختلف قوموں کی نمو کیسے ہوئی، اور وہ کیسے صفحۂ ہستی پر اُبھریں اور ابھر کر مٹ گئیں۔ ان کے کمال و زوال کے اسباب و علل کیا تھے اور ان کی کشور کشائی کے طُرق و انداز کیا؟

یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک شہنشاہ وقت کو تاریخ سے دلچسپی ہے، وہاں ایک عام آدمی بھی تاریخی واقعات سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ تاریخ دانی اگرچہ ہر قوم میں مروّج و متداول رہا ہے۔ مگر بادیہ نشین عربوں کو اس سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اپنے اسلاف کے تذکرے اور حالات سینہ بہ سینہ یاد رکھتے تھے اور انھیں ایام العرب کے موقع پر بیان کر کے ان پر فخر محسوس کرتے تھے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا[1]
اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ سلسلے چلائے، تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔

جس طرح ایک آدمی اپنے ذاتی خصائص اور حسن اخلاق کی وجہ سے دوسرے سے شریف سمجھا جاتا ہے اسی طرح ایک خاندان یا قبیلہ اپنی انہیں صفات کے باعث دوسرے خاندان اور قبیلے سے شریف و نجیب ہوتا ہے۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی بیان کرتے ہیں "تاریخ میں چونکہ اچھے آدمیوں کی خوبیاں اور برے لوگوں کی برائیاں لکھی جاتی ہیں۔ لہذا کسی رذیل یا کمینہ خاندان والے کو علم تاریخ سے بہت ہی کم محبت ہو سکتی ہے۔ اشراف قوموں کو اپنے آباؤ اجداد کے کارہائے نمایاں یاد ہوتے ہیں۔ جس کی پیروی کو وہ اپنی شرافت قائم رکھنے کیلئے ضروری سمجھتے ہیں۔ رذیل قومیں امتدادِ زمانہ کے سبب اپنے بزرگوں کے بزرگ کاموں کو بھی بھول جاتی ہیں۔ کسی خاندان یا قوم کو جس کے باپ دادا نے خدا پرستی، جوانمردی، علم و ہنر، جاہ و حشمت وغیرہ میں خصوصی امتیاز حاصل کیا ہو اور وہ اس کو بالکل فراموش نہ کر چکے ہوں، تو ان بزرگوں کے کارنامے بار بار یاد دلا کر عزم و ہمت اور غیرت و حمیت ان میں پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر رذیل قوموں کے اندر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ علم تاریخ کا شوق رکھنے والے اکثر شریف القوم عالی نسب بزرگ زادے اور نیک آدمی ہوتے ہیں۔ کوئی کمینہ خاندان کا آدمی کوئی بزدلی میں شہرت رکھنے والا دنیا میں اعلیٰ درجہ کا مورخ اور تاریخ کا امام نہیں گزرا۔[2]

علم الانساب۔ تاریخ دانی کے ساتھ ساتھ عربوں کو نسب دانی سے بھی بڑا شغف تھا اور وہ اپنے اسلاف کے نسب نامے کئی کئی پشتوں تک حفظ رکھتے تھے۔ وہ صرف اتنا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب نامے یاد رکھتے اور انہیں محفوظ رکھتے تھے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ علم تاریخ میں نسب دانی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ بادیہ نشین عرب اسلاف کے تاریخی تذکروں کے ساتھ ان کے احساب انساب کا بھی خاص خیال رکھتے تھے، عربوں نے جہاں تاریخ کو کمال تک پہنچایا، وہاں پر انہوں نے

[1] الفرقان [2] مقدمہ تاریخ اسلام از اکبر شاہ خان نجیب آبادی ص ۲۸۔

علم الانساب کو بھی ایک مستقل فن بنا دیا۔ اور یہ فن اسلام کے بعد بھی قائم رہا، حضرت ابوبکر صدیق رض اپنے وقت کے بڑے نسّاب تھے۔ اسی طرح مسلمانوں میں اور بھی کئی اس فن کے ماہر ہو گزرے ہیں۔ جن میں ابن سیرین، سعید بن مسیّب اور محمد بن صائب کلبی شامل ہیں، اور انہوں نے اس فن پر متعدد کتابیں لکھیں۔ اسی طرح سبائک الذہب کے مصنف علم الانساب اور شرافتِ نسبی کے متعلق لکھتے ہیں، کہ علم الانساب کی معرفت یعنی جاننا مطلوبہ امور میں سے ہے۔ کیونکہ اس پر احکام شریعت کا انحصار ہے۔ اور اسی پر وراثت کے احکام مرتب ہوتے ہیں، جنکی رو سے ایک آدمی دوسرے کو محروم کر دیتا ہے، اور اسی پر نکاح میں ولایت کے احکام مرتب ہوتے ہیں۔ اور ایک آدمی دوسرے پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح نسب کا جاننا زوج اور زوجہ ہر دو فریق کی کفوئیں بھی ضروری ہے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورت سے چار وجوہ کی بنا پر شادی کی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک وجہ عورت کی نسبی شرافت ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ بہت سے ائمہ، محدثین اور فقہا جیسے امام بخاری، ابن اسحاق اور طبری وغیرہ نے علم الانساب کی بلندی اور رفعت کا اعتراف کیا ہے۔

عورت کی نسبی شرافت کا جاننا اس لئے بھی ضروری ہے، کہ تمدن زیادہ تر عورتوں کے ذریعہ سے پھیلتا ہے جس گھر میں جس خاندان کی عورت ہو گی، اس میں اسی قسم کے تمدن کا غلبہ اور اثر ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ہم اونٹ، گھوڑا، بیل اور دیگر قسم کے جانوروں کی اعلیٰ قسم کی نسلیں ڈھونڈتے اور پسند کرتے ہیں۔ دوسری طرف انسانوں میں ہم سب کو برابر سمجھتے ہیں۔ جبکہ روزمرہ کے مشاہدات بھی ہمارے سامنے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

کذالک تنشألینۃ حوعرقہا — وحسن نبات الارض من کدم البذلہ

یعنی درخت اسی طرح اگتا ہے جو اس کی پیدائش کی اصل ہے۔ اور زمین کی سبزیوں کی خوبی تخم کی عمدگی کا نتیجہ ہے[1]

مولانا سعدی بیان کرتے ہیں:۔

[1] کتاب مذکور ص ۵۶

ے باراں کہ بر لطافتِ طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اور کہا

ے زمین شور سنبل بر نیارد
در و تخمِ عمل ضائع مگرداں

شرافت نسبی پر علامہ ابنِ خلدون لکھتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ہونگے جنہیں صلۂ رحمی کا خیال نہ ہو۔ کیونکہ قرابت کی شفقت و صلۂ رحم سے عزیز و اقارب کو ظلم و بلا اور ہلاکت، و مصیبت میں دیکھ کر آدمی کا خون جوش میں آتا ہے، اور غیرت و حمیت ابل پڑتی ہے اور اسے روحانی صدمہ ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو مہالک و خطرات میں ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ آگے بیان کرتے ہیں، اگر قرابت بہت قریب ہے، اور دونوں کا خون ایک ہے، تو شفقت اور خیر اندیشی بھی زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اور اگر قرابت بعید ہے۔ اور تعلقات واقعی فراموش ہو کر محض اتحاد نسب کی شہرت باقی رہ گئی تو اس حالت میں بھی ہر شخص اپنے ایسے اقرباء کی نصرت و حمایت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس صورت میں وہ رنج اور ملال نہیں ہوتا، جو معلوم التحقیق عزیز کی تکلیف سے ہونا چاہیئے۔

آگے لکھتے ہیں۔ نسب کا فائدہ ہے کہ قرابت، صلۂ رحم و شفقت خاندانی پر مجبور کرتی ہے اور ضرورت کے وقت حمایت و نصرت پر اقارب کو آگاہ کر دیتی ہے۔ جب نسب ظاہر معلوم ہوتا ہے تو بالطبع ایک نسب سے تعلق رکھنے والے اپنے خاندان کے کسی فرد کو بھی بدحالی میں نہیں دیکھ سکتے۔ اور غیرت اور حمیت انھیں بے چین کر دیتی ہے۔ اسی لئے تو فرمایا گیا ہے "تعلموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم" یعنی نسب کا علم حاصل کرو تاکہ صلۂ رحمی کر سکو۔ صلۂ رحمی سے لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔[1]

حضرت عکراش بن ذویب کے حوالے سے لکھا گیا ہے، کہ میں اپنی قوم کے صدقہ کا مال لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ زکوٰۃ کے بہت سے اونٹ تھے آپ نے دریافت فرمایا تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا، عکراش بن ذویب۔ فرمایا اپنا نسب نامہ دور تک بیان کر دو۔ میں نے مرہ بن عبید تک کہہ سنایا، اور ساتھ ہی کہا کہ زکوٰۃ مرہ بن عبید

ے[1] تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۸۶ تا ۸۸

کی ہے۔ پس حضورؐ مسکرائے، اور فرمانے لگے، یہ میری قوم کے اونٹ ہیں۔ یہ میری قوم کے صدقہ کا مال ہے۔

الغرض اگر رشتۂ نسبی بعید ۔۔۔ سے معلوم و مستنبط ہوتا ہے۔ تو صلۂ رحم و شفقت کا خیال بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ اور علم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، رہا اس سے زیادہ نسب کا خیال تو وہ بالکل فضول ہے۔ اس لیئے نسب کا علم محض صلۂ رحم کے لیئے ہونا چاہیئے، نہ فخر و مباہات کیلئے۔ ایسے ہی نسب کے بارے میں عقلا کا قول ہے "النسب علم لاینفع وجہالۃ لا تضر" نسب کا جاننا غیر مفید علم ہے اور غیر نقصان دہ جہالت،

علامہ ابن خلدون حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں "تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط السواد اذا سئل احد من اہلہ قال من قریۃ کذا وحذا" نسب کو جانو اور عراق کے کسانوں کی طرح نہ ہونا، کہ ان کے آدمی سے جب اس کی اصل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، تو کہتا ہے، اس بستی سے اس بستی سے۔

یعنی اسے اپنی بستی کی بجائے اپنے خاندان سے نسبت جوڑ کر بتانا چاہیئے، کہ میں فلاں قبیلے یا خاندان کا فرد ہوں۔

سبائک الذھب میں لکھا ہے کہ "نسب کا فائدہ لوگوں کے درمیان باہمی تعارف ہے تاکہ کوئی شخص اپنے غیر آباؤ احداد کی طرف منسوب نہ ہو" اور اسی نکتہ کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے" اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہارے خاندان بنائے تاکہ تم پہچانے جاؤ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب ط

(سورہ یوسف)

(اگلے لوگوں کے ان قصّوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کیلئے عبرت ہے۔)

سرزمین ڈیرہ غازیخان مختلف تاریخی دور میں

جیسا کہ معلوم ہے کہ جنت الفردوس سے نکالے جانے کے بعد آدم علیہ السلام[1] اور ان کی چہیتی بیوی حوّاؑ کو فرشِ زمین پر بقصدِ عزّ و شرف اتارا گیا اور انہیں کہا گیا کہ زمین کو کاشت میں لاکر اس سے اپنی روزی حاصل کریں اور رزقِ حلال کھائیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو جزائر سراندیپ (لنکا) اور حوّاؑ کو عدن میں اتارا گیا تھا۔ لنکا میں کوہ آدم نام کا ایک پہاڑ اب تک موجود ہے۔ اور اس پر قدمِ آدم کا نشان تا حال قائم ہے۔ جو اولادِ آدم کیلئے زیارت گاہ بنا ہُوا ہے[2]

اس واقعہ کے دو سو سال بعد آدمؑ اور حوّاؑ کو جبلِ عرفات پر دوبارہ ملا دیا گیا اور اس عظیم انسانی جوڑا سے نسلِ آدم چلی۔ آدم علیہ السلام کے تین پسر بیان کئے گئے ہیں۔ قابیل، ہابیل اور شیث علیہ السلام یہ انسانی آبادی کا سب سے پہلا دور سمجھا جاتا ہے۔ جس کے متعلق علمائے سائنس نے آج سے تقریباً پانچ لاکھ برس قبل کا زمانہ بتایا ہے۔

نوحؑ اور قومِ نوحؑ۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ کہ آپ عراق میں اس مقام پر رہتے تھے جو دریائے دجلہ اور فرات کے دوآبہ کے نام سے مشہور ہے۔ یونانی اس خطہ کو میسوپوٹیمیا کا نام دیتے ہیں۔ جبکہ عرف عام میں "وادیٔ دجلہ و فرات کہلاتی ہے۔ عربوں نے اس کا نام "میدیا" رکھا اور اب وہ کردستان کہلاتا ہے۔

حضرت نوحؑ نے ایک ہزار برس سے پچاس سال کم عمر پائی تھی۔ آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبیؑ تھے۔ آپ کے وقت کا سب سے بڑا واقعہ وہ عالمگیر طوفان ہے۔ جو طوفانِ نوح کے نام سے مشہور چلا آتا ہے طوفانِ نوح کے بعد جب پانی اترنا شروع ہُوا۔ اور نوحؑ کی کشتی کوہستان اراراٹ کے اس حصّہ پر جاکر ٹھہری جو اس وقت کوہ جودی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق میں واقع ہے اس کشتی میں سوار اسّی آدمی بیان کیۓ جاتے ہیں اور وہ اس وقت غرق ہونے سے باقی بچ رہے تھے۔ بعد میں انہیں لوگوں کی اولادیں خطۂ زمین پر پھیلیں اور آباد ہوئیں قرآن حکیم میں ہے۔ کہ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں

[1] - ابن جریر کا بیان ہے خلق آدم من ادیم الارض فسمّی آدم - یعنی آدم کی پیدائش ادیم (مٹی) سے ہوئی تھی اس لئے اس کا نام آدم پڑ گیا اور راغب اصفہانی لکھتے ہیں قیل سمّی بذالک لکونہ جسدہ من ادیم الارض وقیل لبسمۃ فی لونہ آدم اپنے جسم کی جلد کی سرخی کے باعث آدم کہلائے۔ [2] اردو سائیکلو پیڈیا ص ۳ سورہ بنی اسرائیل۔

سوار کیا تھا۔[۱] ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت نوحؑ کی عمر چھ سو سال کی تھی۔

سوق الثمانین :۔ عام لوگوں کا خیال ہے۔ کہ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوحؑ کے تین بیٹے تھے۔ سام، حام اور یافث۔ اگرچہ بعض روایات میں ان کے چوتھے بیٹے کنعان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو خود تو طوفان میں غرق ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی اولاد زندہ باقی رہی، اور کنعانی مشہور ہوئی۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ کیونکہ کنعان حضرت نوحؑ کا پوتا اور حام کا بیٹا تھا۔ جیسا کہ اسرائیلی روایات میں ہے۔ نوحؑ کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سم (سام)، حام اور یافث تھے، اور حام، کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نوح کے بیٹے تھے، اور ان ہی کی نسل ساری زمین پر پھیلی۔[۲]

طبقات الارض کے ماہرین نے اس دور کو آج سے تقریباً چھ ہزار برس قبل قرار دیا ہے اور یہی دنیا کا دوسرا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد دنیا میں سب سے پہلی آبادی جو کرۂ ارض پر قائم ہوئی، وہ سوق الثمانین کے نام سے مشہور ہے۔ جس سے مراد اسّی ۸۰ آدمیوں کا بازار لیا جاتا ہے، اور یہ آبادی عراق کے مشہور شہر موصل کے قریب تھی۔

دنیا کی پہلی بادشاہت :۔ اسی دور میں دنیا میں جو سب سے پہلی بادشاہت قائم ہوئی وہ عراق کے ایک شہر "کش" میں تھی اور اس وقت جس خاندان کو یہ شاہی منصب ملا وہ حضرت نوحؑ کے بڑے بیٹے سام کی اولاد سے تھا۔ سام، اپنے باپ کا وصی بھی تھا۔ حضرت سام کی اولاد سامی کہلاتی ہے۔ جو کئی قبائل میں بٹ چکی تھی۔ ان میں سے سُمیری خاندان سلطنت کُش کا بانی ہوا۔

سرزمین ڈیرہ غازیخان پر پہلی بادشاہت :۔ اسی سمیری خاندان کے بھائی بند سرزمین ہند اور سندھ پر چلے آئے تھے۔ اور یہاں آکر انہوں نے جا بجا اپنی آبادیاں قائم کیں۔ جن میں سے سندھ کا قدیم شہر جو اس وقت موئن جو دڑو کے نام سے مشہور ہے، آباد ہوا، اور پنجاب کا قدیم تاریخی شہر ہڑپہ ہے۔ انہیں قدیم شہروں کا ہم پلہ اور سرزمین ڈیرہ غازیخان پر آباد ہونے والا شہر جو ھٹیٹر دلورائے کے نام سے مشہور ہے، آباد تھا۔

چنانچہ ماہرین آثارِ قدیمہ کا خیال ہے۔ کہ وادیِ سندھ (موئن جو دڑو اور ہڑپہ)، بلوچستان، سیستان

[۱] سورۃ بنی اسرائیل - [۲] طبقات ابن سعد ص ۷ - ۶ - پیدائش ص ـــــ

ضلع ڈیرہ غازیخان

(سابق)

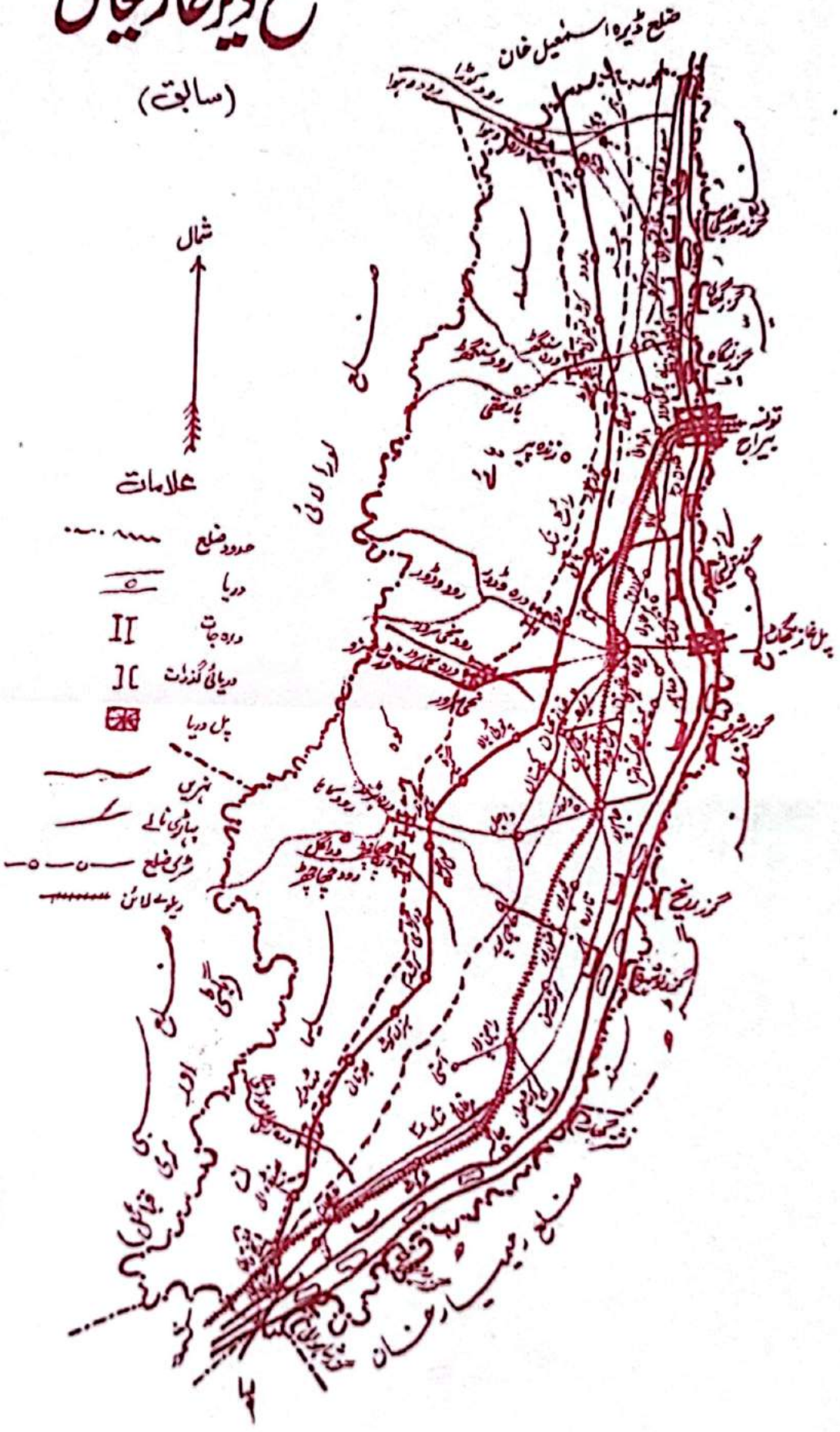

اور وادیٔ دجلہ دفرات کے قدیم باشندے ایک ہی نسل سے تھے۔ اور ان مقامات سے نکلنے والی تاریخی اشیاء، انسانی کھوپڑیوں اور ممیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان وادیوں میں بسنے والے یہ قدیم لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ ایک ہی تہذیب کے امین اور بانی تھے اور عراق کے سمیریوں کے بھائی بند تھے۔

چنانچہ یہ روائتیں ان کے اس بیان کی تصدیق اور تائید کرتی ہیں، جن کے متعلق ابن سعد کا بیان ہے، اور عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عرب، ایرانی، نبطی، ہندوستانی، سندھی، اور ہندی سام بن نوح کی اولاد سے ہیں[۱]۔

مؤرخین نے یہ بھی کہا ہے یہ لوگ عراق سے چل کر بلوچستان کے راستے سے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے تھے اور یہی لوگ بعد میں دراوڑ مشہور ہوگئے[۲]۔ اور اسی چیز کو تاریخ فرشتہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "بعد از طوفان نوحؑ ہر سہ پسر خود سامؑ، یافثؑ و حامؑ را بحکم خالق ارض و سماء باطراف ربع مسکون فرستاد و بکشت کار امر فرمود۔ حام بامر پدر عالی مقام متوجہ ارض جنوب گشتہ در معموری آں ملک سعی فرمود۔ واز وی شش فرزندان بوجود آمدند۔ یکی ہند دومگری سند وسومی حبش وچہارمی زنج وپنجمی ہرمز وششمی نوبہ بود۔ وممالک مذکور بنام ایشاں موسوم گشتہ۔ اما پسر ارشد حام کہ ہند نام داشت بملک ہندکہ بدو موسوم است شتافتہ توجہ بر معموری او گماشت۔ وبرادرش سند در ملک سند فرود کش کردہ شہر ٹھٹھہ و ملتان باسم فرزندان خود بنا کرد[۳]"

یعنی طوفانِ نوح کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے تینوں بیٹوں سامؑ یافثؑ اور حامؑ کو زمین و آسمان کے خالق اللہ تعالیٰ کے حکم سے دنیا میں چاروں طرف پھیلا دیا اور حکم دیا کہ وہ زمین کی کاشت کریں اور اس سے اپنی روزی حاصل کریں۔

حام نے اپنے عالی مرتبت باپ کے حکم سے کرۂ ارض کے جنوبی خطہ کی طرف کوچ کیا اور ان اطراف میں وہ آباد کاری میں معروف ہوگیا۔ حام کے چھ لڑکے تھے، جن میں ہند، سند حبش، زنج، ہرمز اور نوبہ تھے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نام پر ملک آباد کیئے۔

مگر حام کا بڑا لڑکا جو کہ ہند نام رکھتا تھا اور اس کے نام پر ملک ہند وجود میں آیا اس ملک کی آبادکاری میں معروف ہوگیا، چنانچہ اس کا دوسرا بھائی سند سرزمین سندھ میں ٹھہر گیا اور اس

---

[۱] طبقات ابن سعد ص ۴۷۔ [۲] ماہنامہ برہان دہلی نومبر ۱۹۶۲ء شمارہ ۶ ص ۲۲۰۔ [۳] تاریخ فرشتہ ص ۱۰۔

نے اپنے دو بیٹوں کے نام پر شہر آباد کیئے، ایک ٹھٹھ اور دوسرا ملتان۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے شہر موئن جو دڑو کی اصل ٹھٹھ شہر ہے، جو اِمتدادِ زمانہ اور انقلابات عالم کے باعث اجڑ کر ایک قدیم اور بلند و بالا ٹیلہ کی شکل میں رہ گیا۔ اس کا اصل نام چونکہ تاریخ کے اوراق میں دب کر رہ گیا اِسیئے لوگوں نے اسے موئن جو دڑو (مردوں کا ٹیلہ) کا نام دیا۔

یہی صورت حال ڈیرہ غازیخان کی سرزمین پر واقع بھٹیڑ دلورائے کی ہے۔ بھٹیڑ دراصل آبادی یا شہر کو کہتے ہیں جو کسی آفت ارضی و سماوی کے باعث اپنی ہی بنیادوں پر گر کر تباہ ہو چکا ہو، اور اس کی تباہی کے آثار بدستور موجود اور موقع پر واقع پائے جائیں۔ حالانکہ یہ نام (بھٹیڑ) کسی شہر یا اصل آبادی کا نہیں ہوتا۔ چونکہ بعد کے لوگ اس شہر اور آبادی کے نام سے بے خبر ہوتے ہیں، چنانچہ اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اسکا نام رکھ لیتے ہیں وہی نام بعد میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اور آبادی کے اصل نام کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس لیئے ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ بھٹیڑ دلورائے سندھ کے شہر موئن جو دڑو، ملتان اور پنجاب کے قدیم شہر "ہڑپہ" سے اپنی تاریخ وابستہ رکھتا ہے۔ اور اسی دور میں آباد ہوا تھا جو ایک نامعلوم مدت سے تباہی کے بعد بھٹیڑ دلورائے مشہور ہو گیا۔ اور وقت کے آخری راجہ دلورائے کی نسبت سے بھٹیڑ دلورائے کہلایا جانے لگا

غرضیکہ اس قدیم شہر کے کھنڈرات سے اب بھی بڑی مقدار میں قدیم دور کے سکے، زیورات، کھلونے، برتن، اور پختہ گلی گولے جو منجنیق میں استعمال ہوتے تھے ملتے ہیں۔ بھٹیڑ دلورائے اب تک بھی ایک بلند و بالا اور سفید براق ٹیلہ کی حالت میں موجود ہے۔ بسے لوگوں نے اگرچہ خورد برد کر لیا ہے۔ پھر بھی وہ ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے، بس کا ذکر بہرحال کسی اور موقع پر کیا جائیگا۔ نیز بھٹیڑ دلورائے کے ان قدیم آثار اور کھنڈرات اور تواریخی شواہد سے بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے کہ سرزمین ڈیرہ غازیخان دنیا کے ان خطوں کی صفِ اوّل میں واقع ہے جہاں پر دنیا کی آبادی کے دوسرے دور میں انسان نے قدم رکھا اور بادشاہت قائم کی۔

آریاؤں کا ورود۔ لفظ آریا عام طور سے کاشتکار کے معنی میں بولا جاتا ہے مگر بعض نے اس سے مراد شریف و نجیب آدمی کیلیئے ہیں اِبتداء میں یہ قوم بحیرہ خزر کے ساحل پر آباد تھی۔

دو ہزار سال قبل از مسیح میں ان لوگوں نے گروہی صورت اختیار کی اور وہاں سے چل کھڑے ہوتے اور ایران کے سلسلہ ہائے کوہ میں چلے آئے۔

اس کے ایک ہزار سال بعد آریا قبائل نے دوسری ہجرت شروع کی اور یہاں سے پھر ترک سکونت کی۔ ان کے کچھ قبائل نے وادیٔ سندھ کا رخ کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو مغلوب کر کے دلیر نکالا کردیا وہ جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئے جبکہ آریا وادیٔ سندھ اور اس کے متعلقات پر قابض و متصرف ہو گئے چنانچہ یہاں کے قدیم شہر موئن جو دڑو، ہڑپہ اور بھٹیڑ دلورائے وغیرہ ویران ہو کر رہ گئے۔

مید قبائل۔ عام روایات کے مطابق مید (Med) انڈو یورپین قوموں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ گلاسری آف پنجاب ٹرائبز اینڈ کاسٹس میں بلوچی ملاح کو مید کے نام سے موسوم کیا گیا ہے[1] علامہ بلاذری نے لفظ مید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "لغت عرب میں ایسے لوگوں کو جو کشتی رانی کے فن میں طاق اور سمندر کے احوال اور راستوں سے خوب واقف ہوں، مید کہتے ہیں۔ سواحل سندھ پر ملتان کے علاقے سے بحر فارس تک بکثرت خانہ بدوش قومیں آباد تھیں ان میں اکثر ملاح اور جہاز ران تھے۔ مقامی حکومتوں کی کمزوریوں کے باعث وہ بحری ڈاکو بن گئے۔ چھوٹی بڑی مضبوط کشتیوں (بوارج) پر منڈلاتے پھرتے، دریاؤں اور سمندروں کے ساحلی علاقوں میں لوٹ مار کرتے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں "مید کے لفظ میں ڈاکو کا مفہوم ہندوستان کا عطیہ ہے"[2]

اوہیوز بلر کا بیان ہے کہ میدوں کے چار قبائل ہیں۔ چلمار زئی، جلار زئی گرٰبز اور اُرماڑی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ چلمار زئی لس بیلہ کے لومڑی کہلاتے ہیں گرٰبز بلوچ اور ارماڑی افغان مشہور ہیں۔ مکران کے میدوں کے متعلق کہا ہے جو اس وقت گوادر پسنی، اور ارماڑہ میں آباد ہیں۔ ماہی گیری کرتے ہیں شروع میں ان کا پیشہ لوٹ مار اور رہزنی تھا تاریخ شام میں اس قوم کو خونیقی قوم کا حصہ کہا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ مید قوم کو عبرانی زبان میں کنعانی اور عربی میں آرامی کہتے تھے[3]۔

غرضیکہ لفظ مید میں بحری یا بری ڈاکو کا مفہوم عربوں اور ہندوستانیوں کے اپنے اپنے اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں نے مید قوم کو جنگلوں، اور پہاڑوں میں لوٹ مار کرتے دیکھا

[1] کتاب مذکور ج ۳ ص ۷۶ [2] فتوح البلدان ص ۶۱۵ [3] تاریخ شام ص ——

تو انہیں "مید" کہا اور اگر یہ لوگ سمندروں میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے دیکھے گئے تو عربوں نے انہیں "مید" کا نام دیا، گویا کہ عرب و ہند کی مشترکہ زبان میں "مید" کو ایک ڈاکو کا مترادف سمجھا گیا خواہ وہ بری ڈاکو تھا یا بحری بہرکیف مید لوگ نویں صدی قبل مسیح میں بحیرہ خفر سے اٹھ کر عراق میں چلے آئے جہاں پر انہوں نے "میدیا" نام کی ایک ریاست قائم کرلی، جو اب کردستان کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت ریاست میدیا کا صدر مقام ہمدان تھا۔

ہنڈرک ون لون کا بیان ہے کہ "ہنوں نے اہل مید اور اہل فارس دو نیم خود مختیار قبیلوں کی بنیاد رکھی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں قبیلہ مید نے اپنی ایک سلطنت "میدیا" نامی قائم کرلی۔ لیکن جب "انشان" نامی قبیلے کا سردار "سائرس" فارس کے تمام قبیلوں کا سردار بن بیٹھا تو یہ سلطنت تباہ ہوگئی۔"[1]

میدیا کے پہلے بادشاہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلطنت کی حدود میں ملتان شامل تھا گویا کہ میدوں کی حکومت میں ڈیرہ غازیخان کا خطہ موجود تھا اور یہ حکومت ۵۵۰ ق۔م تک رہی، جو بعد میں آشوریوں کے زیر تسلط آگئی تھی تاہم اس کے ایک سو سال بعد میدوں نے ایک بار پھر سنبھالا لیا اور بابلیوں کے ساتھ مل کر "نینوا" کو تباہ کر دیا اور ان سے اقتدار دوبارہ چھین لیا۔

بہرحال اس کے ایک سو سال بعد ایران کا ہخامنشی (کیانی) خاندان ابھر آیا اور اس کے پہلے بادشاہ کیخسرو نے میدیا کے بادشاہ "اسٹیاگس" کو معزول کرکے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اسی بادشاہ نے دوسری طرف فارس کی آرین حکومت کا خاتمہ کرکے اسے بھی اپنی قلمرو میں ملا لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میدا اقوام نے میدیا کو خیرباد کہا اور یہ لوگ ایران کے جنوب مغربی صوبوں اور مکران، بلوچستان اور سندھ کی طرف نقل مکانی کر آئے۔ چنانچہ ان علاقوں میں اس قوم کے لوگوں کا بڑی تعداد میں اور کافی عرصہ تک پایا جانا تاریخ سے ثابت ہے انشاءاللہ خان انشاء نے توسیستان کی میدنی سے متعلق یہ شعر قلمبند کیا ہے یعنی:۔

دستانہ دیکھ انشاء کو قشون شاہ
سب یہ کہتے ہیں کہ آئی سیستان کی میدنی

ڈسٹرکٹ گزیٹیر ملتان میں ہے کہ زیرین سندھ کے میدوں کے شرمناک بحری حملوں نے خلیفہ

[1] نوع انسان کی کہانی ص ۴۰۔

کے ضمیر کو بیدار کیا اور ایک اٹھارہ سالہ کم سن جرنیل کی رہنمائی میں فاتح لشکر دریائے سندھ کی وادی تک باقی ماندہ "بچ" خاندان کو شکست دیتا ہوا اور قلعہ پر قلعہ فتح کرتا ہوا امڈ آیا۔ یہاں تک کہ یہ ملتان آپہنچا۔[1]

الغرض کیخسرو نے ایران میں سلطنت کی بنیاد رکھی اور اسے مشرق میں دریائے سندھ تک بڑھا لیا گویا کہ اس وقت ڈیرہ غازیخان کا خطہ کیانی حکومت کا ایک حصہ بن گیا اس خاندان کے تین بادشاہ ہوئے جن میں سے آخری بادشاہ دارا سوم تھا جو ۳۳۶ء ق م میں سکندر اعظم کے حملہ کے وقت لڑائی میں مارا گیا۔

سکندر اعظم کا حملہ۔ سکندر اعظم نے جب ایران پر حملہ کیا اور وہاں کے آخری کیانی بادشاہ دارا سوم کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا تو سکندر فتح کے شادیانے بجاتا ہوا پنجاب کی طرف بڑھا ٹیکسلا میں اس وقت راجہ امبھی حکومت کرتا تھا۔ اس نے سکندر کی اطاعت قبول کرلی، چنانچہ سکندر آگے بڑھا اور دریائے جہلم کے کنارہ پر پہنچ گیا یہاں پر راجہ پورس کے ہاتھی لڑائی کیلئے تیار کھڑے تھے۔ راجہ پورس نے دریا اس وقت عبور کیا جبکہ رات کے وقت طوفان باد و باراں آیا ہوا تھا۔ صبح ہوئی تو راجہ نے اپنے مقابلہ پر سکندر کو صف آرا پایا۔ لڑائی ہوئی مگر راجہ کے ہاتھی سکندر کے تیراندازوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے خود اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ گئے۔ راجہ پورس گرفتار ہو کر سکندر اعظم کے پیش ہوا۔ سکندر نے پوچھا تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پورس نے جواب دیا ایک بادشاہ دوسرے سے جس طرح سلوک کرتے ہیں۔ سکندر نے پورس کا یہ جواب سنا اور اسے معاف کر دیا ساتھ ہی اس کا ملک اسے واپس کر دیا۔

سکندر اعظم ڈیرہ غازیخان میں۔ سکندر اب ملتان پہنچ چکا تھا۔ ملتان کے علاقہ میں اس وقت ملی قوم آباد تھی۔ چنانچہ اس قوم نے سکندر پر اچانک حملہ کر دیا اس حملہ میں سکندر سخت زخمی ہوا، اور آگے کو سندھ کی طرف بڑھ گیا۔ سکندر کی فوج اب تھک چکی تھی اس نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ بحری راستہ سے دوسرا سندھ اور بلوچستان کی راہ سے روانہ کر دیا جبکہ خود سرزمین ڈیرہ غازیخان سے گزر کر موجودہ مقام "ٹھیٹر دلو رائے" پر پہنچا یہاں سے وہ ہڑند گیا اور وہاں سے درّہ چھاچھڑ کے راستے اندر پہاڑ داخل ہو گیا۔

[1] گزیٹیر ڈی جی خان ص ۲۲۔

اور بلوچستان سے ہوتا ہوا وطن کو واپس لوٹا سکندر جب بلوچستان سے گزر رہا تھا، تو یہاں کی میدقوم کے لشکر نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے بڑی مشکل سے جان بچا کر نکل جانا پڑا۔ اسی طرح سکندر کے بحری فوجی دستے پر مید قوم کے سمندری ڈاکوؤں نے جزیرہ استوالہ کے قریب حملہ کر دیا جس میں سکندر کی بحریہ میں فنیقی اور مصری ملاح تھے اور وہ اس مقابلہ میں سمندر میں ڈوب کر مر گئے اور سکندر کا امیرالبحر نیرکوس جان بچانے میں کامیاب رہا۔

چندر گپت موریہ۔ سکندر نے یہاں سے جاتے وقت "پتھن" نامی ایک یونانی سردار کو اپنا نائب بنا دیا تھا۔ مگر ایک اور یونانی امیر "سیلوکس" نے برصغیر کے شمال میں اپنی حکومت قائم کر لی جو سرحد ہند سے بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا صدر مقام شام کا مشہور شہر انطاکیہ تھا۔ لیکن چندر گپت موریہ نے اس سے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور کابل و قندھار کے صوبے آزاد کرا لئے اب ڈیرہ غازیخان کا خطہ یونانی حکمرانوں سے نکل کر یہاں کے مقامی خاندان موریہ کے تحت آ گیا۔

ستھین قبائل۔ دوسری صدی قبل مسیح میں وسط ایشیا سے بعض وحشی قبیلے اٹھے اور برصغیر کی طرف چلے آئے یہ لوگ "ستھین" یا "شاک" کے نام سے مشہور تھے۔ علامہ شبلیؒ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "ترکوں کے حالات سے عام ناواقفیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ لوگ ان کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب ایک ہی خاندان کے مختلف شخصوں کے نام ہیں۔ چینی ترکی قوموں کو "ہیانگ" کہتے ہیں اور قدیم یونانی اور روم میں ان کا نام "سیتیا" (ستھین) یا "اسکاتا" (شاک) تھا۔ عبرانی زبان میں ان کو یاجوج کہتے ہیں[1]"

غرضیکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ستھین قبائل کی اصل ترک ہے اور انہوں نے یہاں آ کر زرخیز میدانوں پر قبضہ کر لیا اور رہ پڑے۔ ان کے بہت سے قبیلے تھے جن میں "کشان" قبیلہ زیادہ اہم تھا۔ اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور اور نامور بادشاہ "راجہ کنشک" ہوا ہے۔ جس کی سلطنت کی حدود کابل سے بنارس تک اور کوہ وندھیاچل تک پھیلی ہوئی

[1] مقالات شبلیؒ ج ۴ ص ۱۲۹۔

تھیں۔ اس وقت پایۂ تخت پشاور تھا۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق صوبہ سرحد کی اکثر آبادی کشان خاندان سے تعلق رکھتی ہے[1]۔

کشان خاندان بدھ مذہب کا پیرو تھا جس نے سندھ میں بدھ مذہب کو فروغ دیا۔ چنانچہ اس دور میں ڈیرہ غازیخان کا خطہ ستھین یا کشان حکومت کے ماتحت تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہڑند کا عظیم شہر اور قلعہ اسی دور کا آباد کردہ ہے۔ جسے ہرناکش نامی ایک راجہ نے آباد کیا تھا۔ جو غالباً اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا ہرناکش خود ملتان میں تھا۔ اور اس کا بیٹا پرلادھ (پرہلاد) ایک خدا پرست اور موحد شخص تھا، توحید پرستی بدھ مت کا ایک بنیادی عقیدہ تھا۔ لفظ ہرناکش سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ اسی کشان خاندان میں سے تھا۔

جاٹ قبائل۔ ابتدا میں یہ قوم یہوچی، یوواچی یا جیٹی کے نام سے مشہور تھی۔ یونانی اسکو "انڈوسیتھیا" اقوام میں شمار کرتے ہیں اور پاک و ہند میں یہ قوم "جٹ" اور جاٹ کہلاتی ہے اور عام طور سے کھیتی باڑی کرنے والے کو جاٹ کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین نے لفظ جٹ (جاٹ) کو معرب کر کے "زط" بنا دیا ہے۔ چنانچہ عربی کا ایک مقولہ ہے "تفیتین فناد الزط" یعنی مچھر زطیوں (جاٹوں) کا گانا گاتا ہے۔ نیز، عربی لغت المنجد میں جاٹوں کو زط کو، البیان میں خلیفہ مامون کے خلاف شورش برپا کرنے والے گروہ اور الحیوان میں جنوں سے مشابہت رکھنے والی قوم کہا گیا ہے[2]۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان میں لکھا ہے، دراصل لفظ جاٹ یا جدگال بلوچی زبان میں ان زراعت پیشہ قبائلی مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے۔ جو بلوچی نسل سے مختلف ہے اور جنرل کننگھم (   ) کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ساتویں صدی کے خاتمہ پر جب مسلمان پہلی مرتبہ سندھ میں آئے تو یہاں کی بڑی آبادی جاٹ اور مید قبائل پر مشتمل تھی پنجاب گزیٹیر میں جاٹوں کے متعلق بیان کیا ہے کہ زیرین سندھ میں جملہ مسلمان کاشتکار جو کہ نہ بلوچ ہیں نہ پٹھان، نہ عربی اور نہ ہی مغل، جاٹ کہلاتے ہیں۔

الغرض تاریخی روایات کے مطابق جاٹ قبائل شمال مغربی چین میں آباد تھے۔ دوسری

[1] تاریخ پاک و ہند ص ۱۶۷۔ [2] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ج ۲ ص ——

صد خاتبں مسیح میں انہیں ہُن قبائل نے وہاں سے بیدخل کیا اور یہ لوگ صحرائے گوبی سے گھومتے پھرتے دریائے جیحوں کے کنارے پر آکر آباد ہوئے۔ جہاں پر صدیوں ان کا بسیرا رہا۔ پھر وہاں سے ترک سکونت کی اور ترکستان، افغانستان کی وسیع چراگاہوں میں پھیل گئے۔ ۲۰۰ء قبل مسیح میں جاٹ قبائل نے متحد ہو کر باختر کے ستھین حکمرانوں کو شکست دی اور وہاں پر اپنی حکومت قائم کر لی چنانچہ انہیں قبائل میں سے ایک خاندان نے آگے چل کر برصغیر پاک و ہند میں "کوشانی" سلطنت کی بنیاد رکھی، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین ڈیرہ غازیخان بر شہر دلود کے بعد جن قدیم شہروں کے نام ملتے ہیں جاٹ قبائل کے آباد کردہ ہیں ان قدیم شہروں میں ہڑنند، سنگھڑ کِن، آسنی، اجو ڈیوڑہ وغیرہ اسی قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہُن قبائل - پانچویں صدی عیسوی میں ہُن قبائل وادیٔ جیحوں سے نکل کر افغانستان میں چلے آئے تھے اور یہاں پر انہوں نے "کوشانی" سلطنت کو ختم کر دیا جو زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی - پھر پنجاب اور سندھ کی طرف بڑھے - اس وقت ان علاقوں میں گپت خاندان کی حکومت تھی اور اس کی راجدھانی میں موجودہ پاکستان کا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ یہ علاقے انہوں نے غالباً کشان خاندان سے پہلے حاصل کر لیئے تھے۔

ہُن قبائل کا سردار اس وقت "تُورمان ہُن" تھا جس نے ۴۶۶-۶۷ء میں گپت خاندان کا اقتدار چھین لیا اور یہاں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر یہ حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور اس کے ایک صدی بعد ساسانی شہنشاہ نوشیرواں نے ہُن حکومت پر حملہ کر کے ان سے یہ علاقہ چھین لیا اور اپنی سلطنت کی حدود کو دریائے سندھ تک وسیع کر دیا۔ اس طرح ڈیرہ غازیخان کا یہ خطہ نوشیرواں کی حکومت میں چلا گیا۔

ملتان ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں ہُن قبائل کو سفید ہُن کہا گیا ہے اور بیان کیا ہے کہ تقریباً ۴۷۰ء سے ۵۵۰ء تک ایفس تھیلائٹس یا وائٹ ہنوں کو حکمران سمجھا جاتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ ملتان شہر کے عین بیچ میں ہنو را کا چھجہ اور گزشتہ بلوچستان میں ہنہ جھیل انہیں کی یادگار ہیں۔ خود تورمان ہُن کی مصدقہ قصبہ بارکھان ضلع لورالائی

ٹھیٹر دلورا ئے

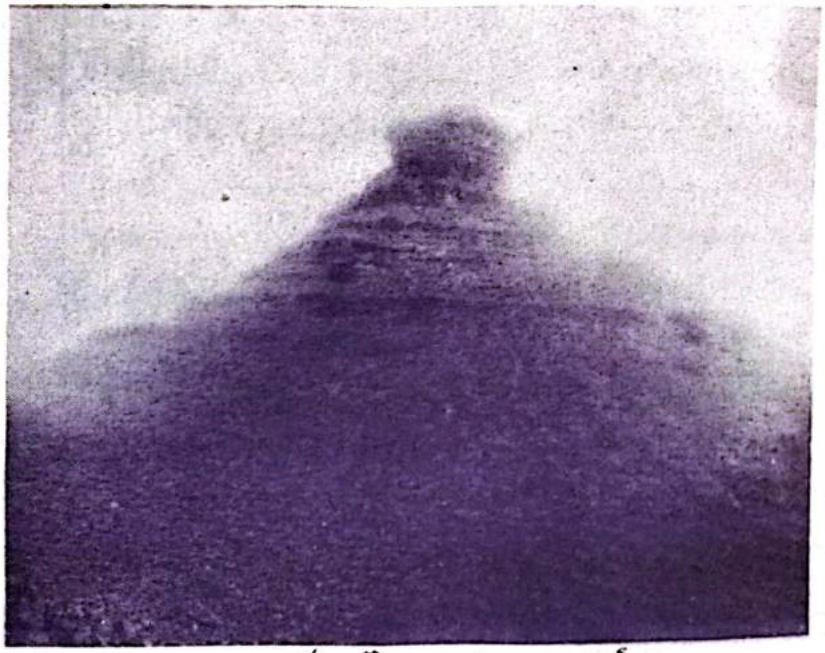

ہُن مینار واقع بارکھان

میں ایک پہاڑی پر آج بھی موجود ہے ایک پہاڑ کی چوٹی کو تراش کر تو رمان ہُن کی مورتی بنائی گئی ہے۔ اس کا چہرہ اور خد و خال بالکل صحیح حالت میں ہیں اس کا منہ مغرب کی سمت کو بنایا گیا ہے۔ یہ مجسمہ یا مورتی بارکھان سے کوہلو کو جانے والی سڑک پر دائیں طرف واقع ہے اور دور دور سے دکھائی دیتی ہے اس سے دو فرلانگ شمال کو ایک درّہ ہے اسے ہُن درّہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ ہَن نہیں بلکہ ہُن ہے۔ استدادِ زمانہ سے اس کے تلفظ میں تبدل واقع ہوگیا۔ اس درہ سے نکلنے والی پانی کی ندی کا نام ہُن ندی ہے۔

ہَن ندی بارکھان کے مغرب سے گزر کر جنوب میں ڈھاکرڑی کی طرف چلی گئی ہے اور رود کاہا میں مل جاتی ہے۔ اس ندی کا ذکر وہاں کی تیسری جماعت کے جغرافیہ میں اس طرح کیا گیا ہے۔ یعنی "یہ (ڈھاکرڑی) بہت پرانا قصبہ ہے۔ یہاں دریائے ہُن (ہُن ندی) دھولہ اور واہی ندیاں ملتی ہیں"۔

رائے خاندان۔ سنہ ۵ء میں سندھ پر رائے خاندان جس کا تعلق راجپوت قبیلے سے تھا، برسرِ اقتدار آچکا تھا۔ اس خاندان کا بانی "رائے سہرس" تھا جو ذات کا شودر تھا اور بدھ مت کا پیرو کار تھا۔ ٹاڈ صاحب کے بیان کے مطابق رائے، رانا، راول، راؤ اور رانگڑ ایک ہی خاندان کے سب مختلف نام ہیں۔ رانا کا خطاب بارھویں صدی عیسوی میں اختیار کیا گیا۔

بہرکیف رائے خاندان کا صدر مقام سندھ کا قدیم اور مشہور شہر "اروڑ (الور) تھا جو دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر واقع تھا۔ مولانا ظفر احمد صاحب ندوی لکھتے ہیں کہ موجودہ قصبہ روہڑی کے قریب ایک گاؤں کی شکل میں اروڑ اب بھی موجود ہے۔

سندھ کے رائے خاندان نے ایک سو تیس ۱۳۰ برس تک حکومت کی اور ان کے پانچ راجے ہوئے آخری راجہ "رائے ساہسی" ثانی تھا اس کی مملکت چار صوبوں پر مشتمل تھی، جن میں ایک صوبہ "ملتان تھا" اور ڈیرہ غازیخان کا خطّہ اس کے ماتحت تھا۔

چچ خاندان۔ رائے ساہسی بیمار ہُوا تو اس کی بیوی "رانی سوندھی" نے جس کے

چچ کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور وہ برہمن زادہ تھا۔ اس کے ولیعہد ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور وہ راجہ ساہسی کی وفات پر سندھ کا حکمران ہو گیا یہ واقعہ ۶۳۲ء کا ہے۔ چچ نے ۶۷۱ء میں وفات پائی اور اس کا بھائی چندر جانشین ہوا۔

راجہ داہر راجہ چندر سات سال تک حکمران رہا۔ اور وفات پائی اب راجہ چچ کا چھوٹا لڑکا جو راجہ داہر کے نام سے مشہور ہے، تاج و تخت کا وارث ہوا۔ سندھیوں اور ایرانیوں میں اکثر و بیشتر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جس حکومت کا پلہ بھاری ہوتا وہ اپنی حدود کو دوسرے ملک تک وسیع کر لیتی تھی۔ چنانچہ راجہ داہر نے اپنے دور حکومت میں مکران اور سیستان کی سرحد پر کھجور کے درخت لگوا کر ایک مستقل حد بندی کر دی تھی۔ چنانچہ چچنامہ کا بیان ہے "پس چچ (داہر) از مہمات بر بنا و پرداخت و اندیشہ حد مکران بر(؟) استیلا یافت کہ آں نواحی با ملوک و بلاد ہند ضم بود و آں را دوشن کنم ------ و درمیان کرمان و مکران ایں درخت خرما انت، بر لب جوئی ابوہ نہادہ کرد و داغ کرد کہ ایں آں حد است"[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت بلوچستان اور سیستان کی سرحد پر "تارا" نام کا ایک مقام تھا جو فارس کے شہر "ہرمز" سے سات میل کی مسافت پر تھا۔ اب وہ مقام (لاشار) مشہور ہے۔ الغرض راجہ داہر کے عہد حکومت میں سندھ کی حدود کا تعین اس طرح کیا گیا ہے۔ جس میں صوبہ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، مکران، اور افغانستان کا وہ علاقہ جو دریائے ہلمند تک واقع ہے۔ اقلیم سندھ کہلاتا تھا اس میں کچھ کاٹھیاواڑ اور گجرات کا علاقہ شامل تھا اور اس کے پانچ صوبے تھے۔

صوبہ طوران، صوبہ سندھ، صوبہ قندھار، صوبہ قنوج اور صوبہ ملتان، غرضیکہ اس دور میں ڈیرہ غازیخان سندھ کی مملکت کا ایک مرکزی خطہ تھا۔

---

[1] چچ نامہ قلمی نسخہ ص ۲۵-۲۶۔

اسلامی دور

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عتبان نے ۲۳ھ میں ایران کے صوبہ کرمان کو فتح کیا عاصم بن عمر اور عبداللہ بن عمیر نے سیستان پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر لیا، جبکہ حکم بن عمر تغلبی نے مکران پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس وقت یہاں کا حاکم (رتبیل) تھا اس طرح یہ علاقے فتح ہو کر خلافت اسلامیہ کے زیر حکومت آ گئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں مکران اور بلوچستان کے لوگ باغی ہو گئے اور سرکاری محصول دینا بند کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے راشد بن عمران کو محصول کی وصولی کیلئے قلات بھیجا۔ راشد نے قلات کے حاکم کو دوبارہ مطیع کیا اور تین سال سے رکا ہوا محصول اور مال غنیمت لے کر واپس لوٹ رہا تھا۔ جب وہ سیستان کے راستے سے "سندر" اور "بہرج" کے درمیان پہاڑی علاقہ میں پہنچا تو یہاں کی میداقوام نے راشد پر حملہ کر دیا صبح سے سہ پہر تک لڑائی جاری رہی بالآخر راشد بن عمران شہید ہو گیا۔ میدوں کا یہ لشکر پچاس ہزار تھا چچنامہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"خبر چنیں می آرند ...... کہ چوں راشد بن عمران بناحیت سند رسید و مال کوہ پایہ حاصل کرد، و بکیکان رفت، و مال گزشتہ و حاصل تحصیل رسانید و غنائم بردہ... بجنگ آورد۔ و بعد کہ از آنجا باز گشت و از راہ سیوستان رواں شد۔ تا بکوہ سندر و بہرج رسید و مرداں آں کوہ جمعیتے ساختند و قریب پنجاہ ہزار مرد جملہ شدند۔ و راہ بگرفتند و از بامداد تا نماز دیگر جنگ کردند و تا راشد شہید شد"[1]

محمد بن ہارون گورنر بلوچستان۔ ۸۵ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی مشرقی ممالک کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے مجاعہ کو مکران و بلوچستان کا ناظم بنا کر بھیج دیا۔ لیکن وہ جلد ہی وفات پا گیا۔ اب حجاج نے محمد بن ہارون بن ذرع النمری کو یہاں کا گورنر بنا دیا اور وہ ۹۱ھ تک مکران میں رہا۔

---

[1] چچنامہ قلمی نسخہ ص ۴۲۔

اِس دوران میں سندھ کے بحری قزاقوں نے سمندر میں ایک ڈاکہ ڈالا اور عربوں کے دو جہاز لوٹ لیئے۔ جو لنکا کے راجہ نے خلیفہ ولید کے پاس بھیجے تھے اور ان میں عرب تاجروں کے یتیم بچے، بیوہ عورتیں اور ان کا مال و متاع تھا۔ جونہی حجاج بن یوسف کو ان جہازوں کے لٹ جانے کی اطلاع ہوئی تو اس نے سندھ کے راجہ داہر کو لکھا کہ وہ ان بحری ڈاکوؤں کو سزا دے اور لوٹا ہوا مال واپس کر دے۔ مگر داہر نے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔

محمد بن قاسم کا حملۂ سندھ ۔ حجاج بن یوسف گورنر عراق نے محمد بن قاسم کو جو اس کا داماد اور بھتیجا تھا سندھ کی مہم پر راجہ داہر کو سزا دینے کی غرض سے بھیجا۔ محمد بن قاسم اس وقت سترہ سال کا نوجوان تھا۔ اور شیراز میں ایک فوجی مہم پر گیا ہوا تھا چنانچہ وہاں سے وہ مکران پہنچا اور پھر لس بیلہ کے صدر مقام "دارمن بیلہ" میں آیا۔ محمد بن ہارون والیٔ مکران بھی اسی مقام پر اس سے آملا۔ مگر اچانک وفات پاگیا اور وہیں پر دفن ہُوا[1] بلوچیوں میں بعض قبائل اپنا سلسلہ اسی محمد بن ہارون سے ملاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اسی کی اولاد بتاتے ہیں اور یہی محمد بن ہارون النمری ہارون مکرانی کے نام سے مشہور ہے۔

غرضیکہ سنہ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے سندھ کے قدیم صدر مقام دیبل[2] کو فتح کرلیا۔ راجہ داہر اس موقع پر لڑائی سے بھاگ کر جارہا تھا۔ کہ راستہ میں پانی کی ایک ندی کو عبور کرتے ہوئے ڈوب مرا۔ دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان کا رخ کیا جہاں راجہ داہر کا بھتیجا بجیراؤ حکمران تھا اور شہر بہردج میں رہتا تھا۔ وہ بھی فتح کرلیا گیا۔ سنہ ۹۵ھ میں ملتان کی مہم پیش آئی۔ محمد بن قاسم نے اسے بھی فتح کرلیا۔ ملتان میں راجہ داہر کا ایک اور بھتیجا گورسنگھ گورنر تھا۔ چونکہ ڈیرہ غازیخان کا خطہ زیادہ تر صوبہ ملتان کے ماتحت رہا ہے۔ چنانچہ ملتان کی فتح کے ساتھ ڈیرہ غازیخان بھی اسلامی قلمرو میں شامل ہوگیا۔

ڈیرہ غازیخان آغوشِ اسلام ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ کہ ملتان کی

[1] چچنامہ قلمی نسخہ ص ۹۳ تا ۹۴ ۔ [2] دیبل سے مراد ٹھٹہ ہے۔ (عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۰۲)

فتح کے بعد سرزمین ڈیرہ غازیخان بھی نظریاتی اور سیاسی ہر لحاظ سے ہندوستان سے آزاد ہوگیا تھا۔ چنانچہ اِس خطہ میں جا بجا کھجوروں کے جھنڈ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عرب فاتحین نے اِس علاقہ میں پہنچ کر کفر کی تاریکی کو مٹایا اور اس کے ذرہ ذرہ کو اِسلام کے نور سے منوّر کردیا تھا۔

محمد بن قاسم چھ ماہ تک سندھ میں رہا۔ "ارور" (الور) کو اپنا پایۂ تخت بنایا سندھ کی سرزمین پر اس نے مسلمانوں کے چار ہزار گھر آباد کیئے۔ جن میں یہ عرب قبائل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ قریش، کلب، اسد، تمیم، حجازی، یمنی، صدیقی اور فاروقی وغیرہ۔

محمد بن قاسم سندھ کا پہلا گورنر تھا جس نے ملتان کے انتظام کیلئے یہاں پر امیر داؤد نصر بن ولید عمانی کو گورنر بنایا۔ خود ملتان کی نظامت ایک اور عرب سردار عکرمہ بن ریحان شامی کے سپرد کی۔ اور کوٹ کروڑ (لعل عیسن کروڑ) میں ایک اور عرب سردار احمد بن خزیمہ بن عتبہ مدنی کو نائب ناظم مقرر کردیا[1] انتظامی معاملات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت ڈیرہ غازیخان کوٹ کروڑ کے نائب ناظم کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

بہرحال محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد یہاں پر ایک مستقل اسلامی ریاست قائم ہوگئی تھی۔ اور اسی روز سے سندھ کا نام باب الاسلام پڑگیا۔ اور سندھ کے انتظام کیلئے عراق سے مسلمان گورنر تعینات ہوکر آنے لگے۔

---

[1] تاریخ سندھ ص ۔

CamScanner

والیانِ سندھ و ڈیرہ غازیخان

سندھ کا سب سے پہلا فاتح اور گورنر خود محمد بن قاسم ثقفی تھا۔ اس نے نہ صرف اس علاقہ کو فتح کیا بلکہ اسے کفر کی ضلالت سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لا کھڑا کیا۔ اور یہاں کے خوش نصیب قبائل کو دینِ اسلام سے روشناس کرایا اور مسلمان کیا۔

سنہ ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کی وفات ہوئی اور اس کے چھ ماہ بعد سنہ ۹۶ھ میں خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک بھی فوت ہو گیا اور اس کی جگہ سلیمان بن عبدالملک اموی نے زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس نے خلیفہ ولید کے دور کے بعض گورنروں کو واپس بلا لیا۔ جن میں محمد بن قاسم بھی تھا۔ اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔

سنہ ۹۹ھ میں سلیمان کا اِنتقال ہو گیا۔ اب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہُوا۔ آپ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی سندھ کے چھوٹے بڑے راجاؤں کو اِسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس میں بعض تو مسلمان ہو گئے اور بعض نے اِسلام قبول نہ کیا۔ اِسلام قبول کرنے والوں میں راجہ داہر کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام "جے سنگھ" تھا۔

سنہ [illegible] میں جبکہ ہشام بن عبدالملک خلیفہ تھا۔ تو تمیم بن زید سندھ کا ناظم بن کر آیا۔ مگر اس کی غلط حکمت عملی کے باعث سندھ میں آباد عربوں میں قبائلی عصبیت پھیل گئی۔ اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے راجے بھی اِسلام سے برگشتہ ہونے لگے۔ اور باغی ہو کر اپنی اپنی خود مختیاری کا اِعلان کر دیا۔ ان باغیوں میں ایک "دلورائے" نامی سردار تھا۔ غرضیکہ تمیم بن زید ناکام ہو کر واپس لوٹ گیا۔

راجہ دِلورائے اوّل - "دِلورائے برہمن آباد (موجودہ بھکر واقع سندھ) کا راجہ تھا۔ وہ مُرتد ہو کر اِسلام سے پھر گیا اور خلافتِ اِسلامیہ کا باغی ہو بیٹھا۔ دِلورائے کی حدودِ سلطنت میں ڈیرہ غازیخان کا علاقہ شامل تھا۔ بدقسمتی سے یہ خطۂ اِسلام کی گود سے نکل کر ایک بار

پھر کفر و ضلالت میں چلا گیا۔

تحفۃ الکرام کا مصنف دلورائے نام کے دو راجاؤں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتا ہے۔ دلورائے اوّل کے متعلق لکھا ہے۔ "جب سندھ پر بنو اُمیہ کے گورنر سلطنت کر رہے تھے۔ تو سندھ کے بعض حکمران محض ظاہر داری کے طور پر وقت کے بادشاہوں کی اِطاعت کرتے رہے۔ ان ہی میں دلورائے بھی تھا۔ وہ رائے خاندان کی نسل سے تھا۔ اور شہر الور میں رہتا تھا۔"[1]

دِلورائے ثانی کے متعلق بیان کیا ہے۔ کہ وہ پہلے دلورائے کی اولاد سے تھا۔ اور سومرہ خاندان کے دور میں ایک سردار تھا۔ اس کی حدود سلطنت میں سیت پور کا علاقہ شامل تھا[2] سیت پور اس وقت علی پور ضلع مظفر گڑھ سے دس میل جنوب مغرب میں اور دریائے سندھ کے مشرق میں پانچ میل پر واقع ایک قدیم قصبہ ہے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ راجہ دلورائے ایک فاسق فاجر، ظالم اور جابر بادشاہ تھا۔ اس کا دستور تھا کہ وہ ہر کسی شخص کی نو بیاہتہ بیوی کو پہلی رات اپنے پاس رکھتا تھا اور اس کے جبر پر کسی کو مجالِ اِنکار نہ ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اس کی اپنی خواہر زادی کا کسی شخص سے نکاح ہُوا۔ تو اس نے دستور کے مطابق اسے اپنے حرم سرا میں بلا بھیجا۔ جب اس عفیفہ بی بی نے محل میں قدم رکھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی عفت کی دُعا مانگی۔ اور اس کے حضور میں گڑگڑائی۔ تو اس مستجاب الدعوات ذات نے اس پاک دامن عروس کی دعا قبول کر لی۔ اور آناً فاناً ایک زبردست زلزلہ آیا جس سے زمین کا طبق بل گیا۔ اور "دلور نامی شہر اسی وقت غرق ہو گیا"[3]

ایک اور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ دلورائے کا بھائی چھٹو اِمرانی جو مسلمان ہو چکا تھا۔ اور بھائی کے ظلم و جور کو دیکھ کر مدینہ منورہ کو چلا گیا۔ اور وہاں پر اس نے کلام پاک پڑھا اور فاطمہ نام ایک عورت (عرب خاتون) سے شادی کر لی۔ اور وطن واپس آ گیا۔ چھٹو کی یہ بیوی اپنے حسن و جمال میں یکتا تھی۔ دلورائے کو اس کے حسن کا پتہ چل گیا۔ اور اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔ چنانچہ ایک روز وہ جبکہ چھٹو اِمرانی گھر پر نہیں تھا۔

[1] تحفۃ الکرام ص ۱۷۵، ۱۷۶ [2] ایضاً ص ۱۴۱، ۱۴۳ [3] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۰ -

اس کے گھر پر چلا گیا۔ جب فاطمہ زوجہ چھٹو نے ایک اجنبی شخص کو گھر میں آتے دیکھا۔ اور اسے معلوم ہُوا کہ وہ راجہ دلورائے ہے۔ اور کسی اچھی نیّت سے نہیں آیا ہے۔ تو وہ اللہ ربّ العزّت کے حضور سجدہ ریز ہو گئی اور گڑگڑا کر اس نے اپنی عزت کی پناہ مانگی۔ اور اس فاسق فاجر کیلئے بد دعا کی۔ تو رب کی غیرت جوش میں آئی۔ اور پل بھر میں ہی زمین و آسمان ہل گئے۔ اور ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ برہمن آباد کا شہر زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔

مؤرخین نے اگرچہ یہ واقعات سندھ کے قدیم اور مشہور شہر "اروڑ" اور "برہمن آباد" کے متعلق لکھے ہیں۔ مگر ہماری مقامی کتب تاریخ میں دلور نامی ایک قدیم شہر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے۔

سیف الملوک اور بدیع الجمال کا واقعہ:- اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سیف الملوک نامی ایک شہزادہ تھا۔ جو کاروبار تجارت کرتا تھا۔ وہ ایک موقع پر مال تجارت لے کر مکہ معظمہ کو اس غرض سے چلا گیا کہ وہاں پر یہ مال بیچے گا اور خرید بھی کرے گا۔ ساتھ ہی فریضہ حج ادا کرے گا۔ چنانچہ جب وہ شہر الور میں آیا اور دلورائے نے جو کہ اپنے ملک میں سے گزرنے والے مال پر محصول لیا کرتا تھا۔ سیف الملوک کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ چونکہ دلورائے کو معلوم ہو چکا تھا کہ شہزادہ کی بیوی بدیع الجمال حسن و جمال کی ایک پیکر ہے۔ اس لئے محصول کے معاملہ میں شہزادہ کو تنگ کرنے لگا۔ اس سے اس قدر محصول طلب کیا جسے وہ ادا نہ کر سکتا تھا۔ شہزادہ کو بھی دلورائے کی بدنیتی کا پتہ چل گیا تھا۔ کہ وہ اسے تنگ کر کے اس کی بیوی اس سے ہتھیالے گا۔

چنانچہ سیف الملوک نے ایک رات راتوں رات کو ہکن بلائے۔ اور انہیں گراں قدر رقم دی کہ انہوں نے دریائے سندھ کے مغربی کنارہ کو کاٹ کر پہاڑ میں ایک نہر بہادی۔ وہ خود کشتی کے ذریعے اندر پہاڑ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور کوہکن مزدوروں نے صبح ہونے سے قبل اس نہر کو بند کر دیا۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال اس طریقہ سے بخیر و خوبی یہاں سے بھاگ گئے اس اثناء میں شہر "الور" بھی تباہ ہو گیا۔ دلورائے اس

وقت برہمن آباد کو چلا گیا۔

تحفتہ الکرام کے بیان کے مطابق سیف الملوک اور بدیع الجمال حج بیت اللہ ادا کر کے واپس آ گئے اور تعلقہ سیت پور کے رتو کوٹ میں جا کر قیام کیا ان کے دو لڑکے "رتو" اور "چنو" تھے ان سب نے رتو کوٹ میں وفات پائی اور وہیں پر دفن ہوئے تھے۔

راقم الحروف نے سیت پور میں جا کر اس رتو کوٹ کو دیکھا ہے وہاں کے مقامی لوگ اسے "رتا کوٹ" کہتے ہیں یہ سیت پور سے بجانب غرب ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک قدیم ٹھیٹر کی شکل میں واقع ہے اور کھجور کے جھنڈوں میں گھرا ہوا ہے، ٹیلہ کے شمال مغربی کونہ پر ایک برج کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اس ٹھیٹر پر سات قبریں رکھی ہیں جن میں کچھ قدیم اور کچھ جدید ہیں۔ مگر وہاں کے لوگ اس بارہ میں کچھ بتا نہیں سکتے ہیں۔ ٹھیٹر کے متصلہ اور قریبی رقبہ پر مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے لوگ قابض ہیں۔ اب اس ٹھیٹر کی مٹی بھی لوگوں نے اٹھانا شروع کر دی ہے۔

دلو رائے ثانی ۔ تحفتہ الکرام کا مصنف اگرچہ دلو رائے نام کے مختلف دور کے راجاؤں کا ذکر کرتا ہے مگر اس نے یہ سب واقعات دلو رائے ثانی کے عہد سے متعلق لکھ دیئے ہیں۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے " ارور اور برہمن آباد کی تباہی کے بعد جو دلو رائے کی ظلم رانی کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے۔ دلو رائے کا بھائی چھٹو امرانی خلیفۂ بغداد کے پاس فریادی بن کر گیا اور دلو رائے کے ظلم و ستم کی یہ سب داستانیں سنائیں۔ اور اس سے دلو رائے کے ظلم سے رہائی کی مدد چاہی چنانچہ خلیفۂ وقت نے " سید علی موسوی " کو کچھ لشکر دے کر چھٹو امرانی کے ہمراہ بھیج دیا۔ دلو رائے نے جب یہ دیکھا تو سید علی موسوی کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے عقائد اور افعال بد سے توبہ کی اور مسلمان ہو گیا۔ اور اطاعت گزاری کے طور پر اپنی لڑکی کا عقدِ نکاح اس سید سے کر دیا الغرض سرزمین ڈیرہ غازیخان نے بہر کروٹ لی۔ اور کفر کی ظلمت سے نکل کر نورِ اسلام میں داخل ہو گیا۔ میر سردار خان بلوچ نے اپنی تصنیف دا گریٹ بلوچ (The Great Baluch) کے صفحہ ۶۶ پر تاریخ طاہری کے حوالہ سے لکھا

۵۱۔ تحفتہ الکرام ص ۱۲۲-۱۲۳ - ۵۴۴ تا ۷۴۴

ہے کہ چھٹو امرانی نے سیوستان (SEWISTAN) میں وفات پائی تھی جہاں پر اس کا مقبرہ موجود ہے۔ مگر انہوں نے یہ تحریر نہیں کیا ہے کہ اس کی موت یہاں پر کیوں کر اور کیسے ہوئی تھی۔

ڈیرہ غازیخان کے خطہ پر واقع تین ایسے تباہ شدہ مقامات ہیں جو ٹھیڑ دلو رائے نام سے مشہور ہیں ان میں سب سے بڑا اور اہم مقام جام پور سے داجل کو جانے والی سڑک سے ہٹ کر تین میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ یہ مقام بعینہٖ موئن جو دڑو اور ہڑپہ کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کا مفصل حال باب آثارِ قدیمہ میں آئے گا۔

جُنیدؒ بن عبدالرحمٰن مری ۔ بہر حال سندھ کے ان حالات کو دیکھ کر عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ نے جنید بن عبدالرحمٰن مری کو سندھ کا ناظم بنا کر بھیجا جنید ۱۰۷ھ سے ۱۱۱ھ تک یہاں رہا اس نے یہاں آ کر ہر طرف فوجی مہمات بھیج دیں اور خود بھیلمان اور گجرات کی طرف چلا گیا اور جلد ہی اس نے شورشوں کو دبایا اور وہ علاقے فتح کر لیے جو سندھ سے کٹ گئے تھے جنید نے کیرج پر لشکر کشی کی۔ اور اس کی فصیل کو قلعہ شکن آلات کے ذریعے توڑ ڈالا اور داجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ کو جو مرتد ہو چکا تھا قتل کر دیا۔

جنید نے علاقہ مارواڑ، مانڈل، مینج، بہروج، اُجین اور مالوہ تک اپنی فوجوں کو بھیجا جو کامیاب و کامران واپس لوٹیں۔ اس طرح اس نے سندھ کی حکومت کو از سر نو متحد اور مضبوط بنا دیا۔[۵۳]

یہاں پر یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ بلوچوں کے معروف بہادر مری قبیلے کا تعلق انہی جنید بن عبدالرحمٰن سے ہے جنید کو اب کابل اور قندھار کی فوجی مہمات پر بھیجا گیا اور اس کی جگہ تمیم بن زید عتبی سندھ کا والی بن کر آ گیا۔ تمیم نے سندھ کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ مگر وہ اس قدر کمزور ثابت ہوا کہ سندھ میں اٹھی ہوئی خانہ جنگی کی ان چنگاریوں کو نہ دبا سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ چھوٹی بڑی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں بٹ کر رہ گیا اور ان میں دو بڑی مسلم ریاستیں منصورہ (سندھ) اور ملتان کی تھیں۔

حکم بن عوانہ تمیم بن زید کی وفات کے بعد حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا گورنر

۵۲۔ جنید بن عبدالرحمٰن بن عمر بن حرث بن سنان بن ابی حارثہ مری تاریخ اسلام ج ۲ ص ۲۲۸،
۵۳۔ تاریخ اسلام ص ۲۸۶۔

بنا کر بھیجا گیا اس کے ہمراہ عمر بن محمد بن قاسم ثقفی بھی چلا آیا۔ حکم نے تمام ملکی معاملات اس کے سپرد کر دیئے اور جملہ امور کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھما دی، سندھ میں اس وقت خانہ جنگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ حکم نے دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر "محفوظہ" نام کا ایک شہر آباد کر کے اسے اپنا صدر مقام بنا لیا اور جملہ عرب قبائل کو اس میں جمع کر دیا۔ مگر خود اس خانہ جنگی میں شہید ہو گیا۱؎ یہ واقعہ ۱۲۱ھ کا ہے۔

عمر بن محمد بن قاسم ۔ حکم بن عوانہ کلبی کی شہادت کے بعد عربوں نے عمر بن محمد بن قاسم کو اپنا امیر چن لیا۔ اس نے ساحل سمندر پر برہمن آباد کے پاس ایک اور شہر آباد کیا اس کا نام اس نے "منصورہ" رکھا، اور یہی شہر بعد میں زیریں سندھ کا صدر مقام قرار پایا۔

سید سلیمان ندوی رح لکھتے ہیں کہ منصورہ موجودہ بھکر سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ عمر بن محمد بن قاسم نے بڑی مشکل سے ملک میں اٹھی ہوئی شورشوں کو دبایا ہی تھا کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ولید بن یزید ۱۲۵ھ میں خلیفہ ہوا۔ ولید نے اقتدار سنبھالتے ہی ہشام کے وقت کے تمام گورنروں کو واپس بلا لیا۔ جن میں عمر بن محمد بن قاسم ثقفی بھی تھا، چنانچہ اس کے بعد سندھ میں کئی گورنر بھیجے گئے یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں اموی خلافت ختم ہو گئی اور ان کی جگہ عباسیہ نے لے لی۔ عباسیوں نے دمشق کی بجائے بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔

موسیٰ بن کعب ۔ ۱۳۲ھ میں ابوالعباس سفاح عباسی خلیفہ ہوا اس وقت سندھ میں اموی دور کا حاکم منصور بن جمہور کلبی تھا جو عراق سے بھاگ کر یہاں چلا آیا تھا اور سندھ کے گورنر ابن عرار کو قتل کر کے خود حکومت کرنے لگا۔

عباسی دور خلافت شروع ہوا تو ابومسلم خراسانی مشرقی ممالک کا گورنر بنایا گیا تھا اس نے ۱۳۴ھ میں موسیٰ بن کعب کو جو انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر مامور تھا۔ سندھ کا گورنر بنا دیا۔ اس نے ایک زبردست جنگ کے بعد منصور کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ موسیٰ بن کعب نے ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

عمر بن حفص ۔ موسیٰ بن کعب کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عیینہ نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور خلیفۂ وقت کے احکامات کی تعمیل بند کر دی۔ یہ ابوجعفر منصور عباسی کا دور حکومت تھا۔

۱؎ عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۳۳۔

چنانچہ اس نے عمر بن حفص بن عثمان بن ابی صفرہ العتکی کو سندھ کی حکومت کا پروانہ دے کر روانہ کیا۔ یہ شخص "ہزار مرد" کے لقب سے مشہور تھا۔ ابوجعفر منصور نے عتبہ بن مسلم کو بھی اس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ یہ دونوں سردار ۱۴۲ھ میں سندھ پہنچے۔ اور عیینہ بن موسیٰ بن کعب کو گرفتار کر کے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عمر بن حفص ۱۵۱ھ تک سندھ کا حکمران رہا۔

ہشام بن عمر تغلبی ۔ اب خلیفہ منصور نے ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کی ولایت کا پروانہ دے کر بھیجا۔ اس نے یہاں پہنچ کر عبداللہ الاشتر کو قتل کیا۔ جو منصور کے خوف سے سندھ کی طرف بھاگ آیا تھا۔ اور شیعیت پھیلا رہا تھا۔ ہشام نے ملتان پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے قندھار کو چلا گیا۔ اس موقع پر ظفر احمد صاحب ندوی لکھتے ہیں کہ ۱۱۱ھ کے بعد ملتان کا تعلق زیریں سندھ سے کٹ گیا اور اس وقت سے ہشام بن عمر تغلبی کے حملہ ملتان تک اس بارہ میں تاریخ خاموش ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں صوبہ ملتان پر کس کی حکومت رہی۔ لیکن ان کا یہ خیال ہے کہ یہاں پر کوئی مسلمان ہی حکومت کرتے رہتے ہیں۔ بصورت دیگر ہشام ملتان کو فتح کرنے کے بعد یہاں پر کوئی انتظام کیے بغیر واپس نہ چلا جاتا کیونکہ اس کے علاوہ اس نے ملتان پہ کوئی مزید کارروائی نہیں کی۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں سرزمین ڈیرہ غازیخان بدستور ملتان کے گورنروں کے زیر قبضہ چلی آتی ہے۔

الغرض ہشام بن عمر تغلبی گورنر سندھ نے ۱۵۷ھ تک سندھ کے انتظام کو سنبھالے رکھا اور وفات پائی۔

مصبح بن عمر تغلبی ۔ ہشام کی وفات کے بعد سندھ میں خلافت مرکزیہ کی طرف سے کئی گورنر آئے آخر میں ہشام کا بھائی مصبح بن عمر تغلبی سندھ کی ولایت پر مامور ہوا۔ یہ خلیفہ المہدی کا دور حکومت تھا مصبح کے وقت سندھ کے عرب قبائل حجازی اور یمنی کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے۔ جو مصبح سے نہ سلجھائے جا سکے اور وہ ناکام ہو کر عراق کو واپس چلا گیا۔

طیفور بن عبداللہ حمیری ۔ طیفور سے قبل عراق سے کئی گورنر سندھ کے انتظام کیلئے بھیجے گئے بالآخر طیفور بن عبداللہ حمیری سندھ کا گورنر بن کر آیا اس دور میں ہارون الرشید کی خلافت تھی طیفور کے یہاں پہنچتے ہی نزاری (حجازی) اور قحطانی (یمنی)، قبائل میں پھر قبائلی عصبیت

عود کر آئی۔ اور فریقین میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی۔ طیفور بھی عربوں کی اس خانہ جنگی پر قابو نہ پا سکا اور ہارون کے حکم سے واپس چلا گیا۔

داؤد بن یزید مہلبی۔ ہارون الرشید نے ۱۸۳ھ میں داؤد بن یزید مہلبی کو سندھ کی حکومت سونپ دی۔ داؤد نے سندھ پہنچ کر انتظام سنبھال لیا اور نزاریوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گیا اور ان پر تابڑ توڑ حملے کر کے ان کی قوت کو کچل ڈالا۔ اس اثنا میں ہارون وفات پا گیا اور اس کا بیٹا امین الرشید خلیفہ ہوا مگر وہ خود خانہ جنگی میں مصروف ہو گیا اور اسے ان دور دراز علاقوں کی طرف توجہ دینے میں فرصت نہ مل سکی۔ آخر کار وہ اپنے بھائی مامون الرشید کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہوا۔ یہ ۱۹۸ھ کا واقعہ ہے اب مامون الرشید خلافت اسلامیہ پر متمکن ہوا۔

خلافت مرکزیہ میں یہ تبدیلی اور ملک میں خانہ جنگی کے ان حالات کے ساتھ داؤد کو سندھ میں حکومت کرتے ہوئے بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ۲۰۵ھ میں اس نے انتقال کیا۔ مولانا ظفر احمد ندوی ۱۸۴ھ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں کہ ہشام بن عمر تغلبی کے حملہ ملتان ۱۵۱ھ کے بعد صوبہ ملتان کے متعلق مؤرخین خاموش ہیں اور کتب تواریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ہشام کے بعد صوبہ ملتان پر کون لوگ حکمران رہے چنانچہ بیان کیا ہے کہ ۱۸۴ھ میں داؤد بن یزید مہلبی سے قبل محمد بن عدی سندھ کا گورنر تھا۔ اس نے بھی ملتان پر حملہ کیا تھا جس میں وہ ناکام رہا۔

ندوی صاحب اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس وقت بھی ملتان میں کوئی مسلمان حکمران تھا اور ملتان کی ریاست سندھ سے علیحدہ تھی اور اگر یہ دو باتیں نہ ہوتیں تو صوبہ ملتان کا ذکر کتب تاریخ میں ضرور ملتا یہاں پر بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈیرہ غازیخان کا خطہ بدستور ملتان کے تابع حکومت تھا اور اس پر کسی مسلمان حکمران کا حکم چلتا تھا۔

موسیٰ بن یحییٰ برمکی۔ مامون الرشید نے خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، اور ملکی انتظام کی طرف توجہ مبذول کی چنانچہ سندھ میں بھی اس نے کئی گورنر بھیجے ان میں سے ایک موسیٰ بن یحییٰ برمکی تھا۔ موسیٰ ۲۱۳ھ میں سندھ کا پروانۂ حکومت لے کر یہاں پہنچا اور صدر مقام منصورہ میں آیا اور نظام مملکت سنبھالا وہ ۲۲۱ھ تک

یہاں رہا اور وفات پائی۔

ہارون بن ابی خالد۔ موسیٰ بن یحییٰ برمکی کے بعد اس کا بیٹا عمران بن موسیٰ برمکی سندھ کی سند حکومت لے کر یہاں پہنچا یہ المعتصم باللہ کا عہد خلافت تھا۔ عمران کے وقت قلات کے جاٹوں نے بغاوت کر دی جسے اس نے ختم کیا۔ اب عمران برمکی نے ان جاٹوں کو اپنے ساتھ لیا اور سندھ کے مید قبائل پر جو بغاوت کا علم بلند کر چکے تھے حملہ آور ہوا۔ ان پر کامیابی حاصل کی اور ان کی شوریدہ سری کو دبا دیا۔

یہ بات پہلے سے عیاں ہے کہ سندھ کے حجازی اور یمنی قبائل میں دیرینہ مخاصمت اور دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جو پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ عمران بن موسیٰ نے اس وقت یمنیوں کو مظلوم سمجھ کر ان کی حمایت کی، جس کا نزاریوں کو بڑا رنج ہوا اور وہ اس کے مخالف ہو گئے چنانچہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز ہباری کو اپنا سردار بنا لیا اور خاموشی کے ساتھ عمران برمکی پر حملہ آور ہوئے اور اسے شہید کر دیا یہ واقعہ ۲۲۶ھ میں رونما ہوا تھا۔

اب معتصم نے عنبسہ بن اسحاق ضبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیج دیا اس نے سندھ میں پہنچ کر تمام سرشوروں کی شورش کو دبا دیا اور ملک میں سکون کی فضا پیدا کر دی اس دوران میں المعتصم باللہ فوت ہو گیا اور اس کی جگہ الواثق باللہ خلیفہ ہوا۔ الواثق بھی ۲۳۲ھ میں انتقال کر گیا اب المتوکل خلیفہ بنا۔ المتوکل نے عنبسہ کی جگہ ہارون بن ابی خالد کا تقرر کر دیا۔ چنانچہ ۲۳۵ھ میں وہ سندھ پہنچا اس نے یہاں آ کر دیکھا کہ حجازی اپنے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری کی سیالداری میں بہت طاقت حاصل کر چکے ہیں۔ اور ان کو چھیڑنا گویا کہ موت کو دعوت دینا ہے، تاہم وہ موت کے منہ سے نہ بچ سکا اور عمر بن عبدالعزیز نے اس غریب پر حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور منصورہ (سندھ) کی حکومت سنبھال لی۔

اب اس نے المتوکل باللہ کی خدمت میں اپنی اطاعت اور وفاداری کا لکھ کر سندھ کی حکومت کا پروانہ اپنے نام حاصل کر لیا اور نیم خود مختیار رہ کر سندھ میں

عرب ہباری خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھ دی اور سندھ کی ہباری سلطنت کا بانی بنا۔

والیانِ مُلتان و ڈیرہ غازیخان

بنو منبہ

مؤرخین لکھتے ہیں کہ سندھ کے گورنر محمد بن عدی نے جب ۱۸۴ھ ہجری میں ملتان پر حملہ کیا اور اس میں شکست کھائی تو اس کے بعد ملتان کی تاریخ خاموش ہے۔ اور اس کے متعلق کچھ حالات معلوم نہیں ہیں۔ کم و بیش ایک سو سال تک اس علاقہ کے حالات پر تاریخ کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے جسے ہٹایا نہیں جا سکتا۔

چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ۲۹۰ھ ہجری میں ابن رُستہ آیا اور اس نے اپنی کتاب "الاعلاق النفیسہ" کے حصۂ جغرافیہ میں لکھا "ملتان میں ایک قوم رہتی ہے جو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہے۔ ان کو لوگ بنو منبہ کہتے ہیں۔ اور وہی وہاں کے بادشاہ ہیں اور وہ امیر المؤمنین کا خطبہ پڑھتے ہیں"۔ [1]

اس کے بعد مسعودی ۳۰۰ھ ہجری، اصطخری ۳۴۰ھ ہجری اور ابن حوقل ۳۶۷ھ ہجری میں عرب جغرافیہ نویس آئے۔ اور یہ بھی اسی خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ یہ خاندان عقائد میں سُنّی مسلک رکھتا ہے اور بنو منبہ کی شاخ سامہ بن لوئی کی نسبت سے لوئی کہلاتا ہے۔ مگر ان مؤرخین کے چند سال بعد ۳۷۵ھ ہجری میں بشاری مقدسی آتا ہے تو بیان کرتا ہے کہ "ملتان والے شیعہ ہیں اذان میں حیّ علیٰ خیر العمل کہتے ہیں اور اقامت میں دو دفعہ تکبیر پڑھتے ہیں"۔ [2]

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۰۸۔ [2] ملتان کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ لفظ ملتان کے متعلق مؤرخین میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ وہ تھوڑے سے تغیر لفظی کے بعد لکھتے ہیں کہ ابتداء میں ملتان ملی استھان تھا۔ بعض نے اسے مول استھان کہا ہے۔ پہلی صورت میں وہ ملتان کے نواح میں آباد ملی قوم سے نسبت دیتے ہیں جس قوم نے ۳۲۶ھ ق م میں سکندر اعظم کو زخمی کیا تھا۔ دوسری صورت میں وہ ڈیرہ غازیخان کے علاقہ تمن لنڈ کے راجہ ہرناکش جس نے اپنا لقب دیوتا رکھا ہوا تھا سے منسوب کرتے ہیں اس نے ملتان کے مندر میں اپنی طلائی مورتی رکھی ہوئی تھی ملتان اسی مورتی کی نسبت سے مول استھان مشہور ہو گیا۔ اور وہ مندر ہرناکش کے بیٹے پرہلاد کے نام پر ہوگر (آشفتہ)

جلم بن شیبان

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سامہ بن لوئی کا یہ خاندان جو ملتان میں حکمران چلا آرہا تھا مصر میں فاطمی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ان کا مسلک بھی سنی سے شیعہ میں تبدیل ہوگیا ۔ اور اس تحریک کا بانی جلم بن شیبان تھا ۔

یہاں پر میرے ان فاضل بلوچ مؤرخین کی بصیرت والی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو یہ تأثر دیتے ہیں کہ میر چاکر خان رند بلوچ کے دو صاحبزادوں میر شہید اور شہداد نے ملتان میں آکر سب سے پہلے شیعیت کی بنیاد رکھی اور اسے فروغ دیا تھا اور ملتان میں وہ اس مسلک کے بانی تھے ۔ یہ بلوچوں کے مایۂ ناز سپوتوں پر ایک ناجائز اتہام کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے ۔

الغرض تیسری ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک تین سو سال صوبہ ملتان پر یہی لوئی خاندان حکمران چلا آیا ۔ اور سرزمینِ ڈیرہ غازی خان بھی اسی خاندان کے زیرِ حکومت چلی آئی ۔ جس کا مفصل بیان اپنے موقع پر آئے گا ۔

جلم بن شیبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ملتان میں جب اس نے شیعہ حکومت قائم کی تو موجودہ قلعہ کہنہ پر محمد بن قاسم ثقفی کی بنوائی ہوئی مسجد کو ایک اموی یادگار سمجھ کر گرادیا تھا ۔ اور ملتان کے مشہور مندر "پر بلاد" کو مسجد میں تبدیل کردیا ۔ [1]

(بقیہ) بدھ مت کا پیروکار تھا اور موحد آدمی تھا "پرلادھ" کا مندر مشہور ہوگیا ۔ یہ مندر محمد بن قاسم کی فتح سندھ و ملتان کے وقت موجود تھا ۔ اب یہ قلعہ کہنہ ملتان (قاسم باغ) پر حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مزار سے چند قدم دور جنوب میں واقع ہے ۔
حضرت امیر خسرو جب ملتان میں آئے تو انہوں نے یہاں کی چار چیزوں کا خاص طور سے ذکر کیا اور لکھا ۔

چہار چیز است تحفۂ ملتان — گرد، گرما، گدا و گورستان

اور طالب آملی نے ملتان کے ماحول سے اثر پذیر ہو کر کہا ۔

نگارانِ لاہور و خوبانِ دہلی — بدل کردہ بودم پیوند جانم
غزالانِ ملتاں بہ نیرنگ سازی — کہ بندند غمزہ دست و دہانم

شیخ حمید لوئی

جلم بن شیبان نے تھوڑا عرصہ حکمران رہ کر وفات پائی ۔ اور شیخ حمید لوئی جو اسی کے خاندان سے تھا ملتان کا حاکم ہوا ۔

سید سلیمان صاحب ندوی اور دوسرے فاضل مؤرخین لکھتے ہیں ۔ کہ شیخ حمید کا تعلق قریش عرب کی ایک شاخ سامہ بن لوئی سے تھا ۔ جو بنو منبہ بھی کہلاتے ہیں ۔ مگر فارسی مؤرخین کو لفظ لوئی سے دھوکہ ہوا ہے ۔ اور وہ شیخ حمید کو لودھی (افغان) سمجھ بیٹھے ۔ [2]

بہرحال تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ حمید نے ڈیرہ غازی خان کا علاقہ اپنے بھائی بہادر خان کی تحویل میں دے دیا ۔ وہ اس کا نائب ناظم تھا اور ہڑند میں رہتا تھا ۔

ابوالفتح داؤد لوئی

شیخ حمید کے بعد اس کا لڑکا نصر ملتان کا حاکم ہوا ۔ اور پھر نصر کا بیٹا ابوالفتح داؤد باپ کا جانشین بنا ۔ ۳۹۵ھ ہجری میں سلطان محمود نے بھاٹیہ [3] کے راجہ بجراؤ پر حملہ کیا ۔ اور ملتان میں اس وقت یہی ابوالفتح برسرِ اقتدار تھا ۔ ابوالفتح نے سلطان کے خلاف بجراؤ کی مدد کی ۔ جس کا سلطان کو بڑا رنج ہوا ۔ اور وہ اس وقت زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا ۔ اور غزنی کو واپس چلا گیا ۔ تاہم اس نے یہ بات دل میں ٹھان لی تھی کہ ابوالفتح کو اس حرکت کا مزا ضرور چکھائے گا ۔

چنانچہ سلطان محمود اس سے اگلے سال پشاور کے راستہ سے ملتان کو روانہ ہوا ۔ اس کا مقصد تھا کہ ڈیرہ غازی خان کی راہ سے جو ایک سیدھا اور مختصر راستہ ہے جانے سے ابوالفتح مطلع ہو جائے گا ۔

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۱۵ ۔ [2] ایضاً ۳۱۹ ۔ [3] بھاٹیہ سے مراد بعض مؤرخین نے بھٹنڈا، بعض نے بھیرہ اور بعض نے اوچ لیا ہے ۔

چنانچہ وہ پشاور سے پنجاب کو روندتا ہوا ملتان پہنچا۔ مگر ابوالفتح داؤد، سلطان کے اس ارادہ سے باخبر ہوگیا اور اپنے دوست راجہ انند پال سے مدد چاہی۔ انندپال نے ایک لشکر لے کر محمود کو پشاور کے پاس روکنا چاہا لیکن وہ اس سے نہ رک سکا۔ اور سیدھا ملتان پہنچا۔ اور محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ کے دوران شرفائے شہر نے بیچ میں پڑ کر سلطان کو محاصرہ اٹھا لینے پر رضامند کر لیا۔ اور فریقین میں صلح وصفائی ہوگئی۔

ابوالفتح نے اس موقع پر شیعیّت سے توبہ کی اور سنّی مسلک قبول کر کے آئندہ کے لئے فقۂ حنفی پر احکامات جاری کرنے کا عہد کیا اور اطاعت گزاری کے طور پر خراج دینا منظور کر لیا۔ سلطان محمود ایک سچّا اور پختہ عقیدے کا مسلمان بادشاہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان سے شرک وبدعات کا خاتمہ کر کے اسے پاکستان بنا دے۔ اور توحید ورسالت کو فروغ دے کر اسلام کے پرچم کو بلند کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کئے جن میں اس کا آخری اور سومنات کا حملہ زیادہ مشہور ہے۔ سلطان کے ان حملوں کے وقت ناوک انداز مجاہدین کے ساتھ ساتھ نوکِ قلم سے کام لینے والے بھی موجود تھے۔ جو لشکریوں کے حوصلے بڑھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی نے لاہور کے راجہ جے پال پر جب حملہ کیا تو عنصری نے یہ شعر نظم کئے۔

شنیدہ خبر شاہ ہندوواں جے پال   کہ بر سپہر بلندش ہمے بسود افسر
خدائیگان خراساں بدست پیشاور   بہ حملہ پراگندہ آں ہمہ لشکر
حکایت سفرِ مولتاں ہمے دانی   دگر ندانی تاج الفتوح پیش آور
بہ ملتاں شہر درسو دولیت قلعہ کشاد   کہ ہر یکے را صد بنہ بود چوں خیبر

بلادِ تبکدۂ شاں کشاد و سوختہ ہمہ   ببرد باد ہمہ تودہا تے خاکستر [1]

الغرض ابوالفتح داؤد لودی اپنے اس عہد وپیمان پر قائم نہ رہ سکا اور باغی ہوگیا۔ اب سلطان محمود کو اس کی سرزنش کے لئے دوبارہ ملتان آنا پڑا۔ اور اس نے ۱۰۱۰ء میں ملتان پر دوسری بار حملہ کیا اور ابوالفتح کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ اور قلعہ غور میں قید وبند میں ڈال دیا۔ جہاں اس نے وفات پائی۔

سلطان محمود نے اب ملتان کو سلطنت غزنی کے تابع کر دیا۔ اور اس کے انتظام کے لئے آئندہ غزنی سے گورنر آنے لگے۔ گویا اس وقت ڈیرہ غازی خان غزنوی حکومت کی ماتحتی میں آگیا تھا۔ ملتان پر محمود کے دوسرے حملہ کے وقت ڈیرہ غازی خان کا حاکم ابوالفتح داؤد لودی کا بھائی بہادر خان تھا مگر وہ سلطان کی خبر پاکر اندر پہاڑ بارکھان کو بھاگ گیا تھا۔

سلطان محمود کا حملہ سومنات

سلطان محمود غزنوی نے سومنات [2] کے مندر پر ۴۱۶ھ ۱۰۲۶ء میں حملہ کیا تھا۔ اسے فتح کر کے مندر میں موجود

[1] شعر العجم ج ۱ ص ۵۶

[2] لفظ سومنات کی تشریح کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے کہ یہ ایک بت کا نام تھا۔ جس کے معنی چودھویں کے چاند کے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس مندر میں رکھا ہوا تھا جسے محمود نے سب سے پہلی ضرب میں توڑ دیا۔ اس موقع پر فرشتہ نے یہ شعر رقم کئے۔

لشکرِ محمود اندر سومنات   یافتند آں بت کہ نامت بود نات

اور حکیم سنائی نے کہا ہے۔

کعبہ و سومنات چوں افلاک   شد ز محمود واز محمدؐ پاک
ایں ز کعبہ بُتاں بیروں انداخت   ویں ز کیں سومنات را پرداخت

عنصری جو کہ موقع پر موجود تھا اس نے یہ شعر نظم کئے۔

گماں کہ برد؟ کہ ہرگز کسے ز راہ طراز   بہ سومنات برد لشکر و چنیں لشکر
ہوائے آں و ژم و باد آں چو دود جحیم   زمیں آں سیاہ وخاکِ آں چو خاکستر
ہمہ درخت و میانِ درخت خار کشن   نہ خار بلکہ سنانِ خلندہ و خنجر

اقبال نے یہاں پر یہ گستاخی کی۔

محمودِ غزنوی کہ صنم خانہا شکست   زناریٔ بتانِ صنم خانۂ دل است

بتوں کو توڑ دیا اور اپنا نام بت شکن رکھوایا اور غزنی کو واپس لوٹ گیا۔ سلطان نے سومنات سے واپسی پر سندھ کا راستہ اختیار کیا۔ اور سندھ کے حکمران قرمطی شیعہ سومرہ اول پر حملہ کر دیا۔ سومرہ تو سندھ پار بھاگ گیا لیکن اس کا ایک بھاری لشکر دریائے سندھ کی تیز و تند لہروں میں ڈوب کر مر گیا۔ اب محمود نے سندھ کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اور وہاں پر بھی غزنی سے گورنر بھیجے جانے لگے۔

حسین بن ابراہیم

سلطان محمود غزنوی نے ۴۲۲ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سلطان مسعود غزنی کے تاج و تخت کا وارث ہوا۔ مرقع ملتان کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان مسعود نے ابوالفتح داؤد لودی کو رہا کر دیا تھا اور اسے ملتان کی حکومت بھی دوبارہ سونپ دی۔ یہ مصنف کا سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مستند اور معتبر روایات کے مطابق ابوالفتح داؤد لودی نے قلعۂ غور میں بحالت قید، قیدِ حیات سے رہائی پائی تھی۔

ظفر احمد صاحب ندوی بیان کرتے ہیں کہ سلطان محمود کی وفات پر مسعود نے اس خاندان کے لوگوں کو آزاد کر دیا تھا۔ جو اس وقت غور کے قلعہ میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ رہائی پانے کے بعد ملتان میں واپس آگئے۔ ان میں ابوالفتح داؤد کا نواسہ عبداللہ بھی تھا۔ اسی عبداللہ نے واپس آ کر ملتان میں دوبارہ حکومت قائم کر لی۔

الغرض غزنوی دورِ حکومت ختم ہوئی اور ان کی جگہ غوری خاندان نے لی۔ ملتان میں اس وقت غزنوی حکومت کی طرف سے حسین بن ابراہیم گورنر تھا۔ اور اس نے ۱۱۵۲ء میں وفات پائی تھی۔

عبداللہ لودی

یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان مسعود نے جب غور کے قلعہ سے ملتان کے قیدیوں کو رہا کیا تو ان میں عبداللہ لودی بھی تھا۔ عبداللہ نے ملتان پہنچ کر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے سب سے زیادہ کوشش کی اور اپنی حکومت کی بحالی کے لئے پیش پیش رہا۔ بالآخر وہ ملتان کی حکومت

دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۵۷۱ھ ہجری (۱۱۷۸ء) میں جب شہاب الدین محمد غوری نے ملتان، اوچ اور سندھ پر حملہ کیا تو ملتان میں اس وقت لودی خاندان کی حکومت تھی۔ جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عبداللہ نے اپنی رہائی کے بعد ملتان کی حکومت پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عبداللہ لودی حسین بن ابراہیم غزنوی گورنر کے بعد ملتان میں برسرِ اقتدار آ گیا ہو۔

بہرحال محمد غوری نے اپنے حملۂ ملتان کے وقت ان علاقوں کو مستقل طور پر اپنی راجدھانی میں شامل کر لیا تھا۔ محمد غوری نے ۵۷۲ھ میں دہلی کو فتح کیا اور برصغیر میں اسلامی سلطنت کا بانی ہوا۔ محمد غوری نے ۱۲۰۶ء میں گکھڑ قوم کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور قطب الدین ایبک اس کا جانشین ہوا۔ قطب الدین اس کے غلاموں میں سے تھا۔ وہ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ چنانچہ اس کا سفید سنگِ مرمر کا مقبرہ جو حال ہی میں حکومت پاکستان نے بنوایا ہے لاہور میں واقع ہے۔ قطب الدین ایبک کے بعد محمد غوری کا ایک دوسرا غلام شمس الدین التمش برصغیر کا حکمران ہوا۔

ناصر الدین قباچہ

قطب الدین ایبک کے بعد اگرچہ شمس الدین التمش بادشاہ ہوا تھا۔ مگر ناصر الدین قباچہ جو قطب الدین ایبک کا داماد تھا۔ ملتان، اوچ اور سندھ کی حکومت پر قابض ہو گیا۔ قباچہ پہلے سے ہی اوچ کا گورنر چلا آ رہا تھا اور وہ ان علاقوں پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ۱۲۲۸ء میں شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ پر چڑھائی کر دی۔ جس میں وہ شکست کھا کر سندھ کی طرف نکل گیا اور دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔

اب التمش نے ملتان کی گورنری ملک عزیز الدین کو دے دی۔ اس کے آٹھ سال بعد ۱۲۳۶ء میں ملک کبیر خان کو گورنر بنایا گیا اور اس کے دس سال بعد ملک شیر خان یہاں کا صوبیدار رہا۔ اور پھر ۱۲۵۵ء میں اعزالدین بلبن ملتان کا گورنر بن کر آ گیا۔

خان شہید

خان شہید کا اصل نام محمد قاآن خان تھا۔ اور غیاث الدین بلبن کا لڑکا تھا۔ یہ ۱۲۷۰ء میں ملتان کا گورنر بنا۔ یہ سردار بڑا منتظم اور جرأت و ہمت کا پیکر تھا۔ اس کے دور میں تاتاریوں نے برصغیر پر بار بار حملے کئے اور یہ انھیں ہر موقع پر شکست دیتا رہا۔ ۱۲۸۴ء میں ایران میں جب ہلاکو خان کا پوتا ارغون خان حکمران تھا تو اس کا ایک امیر جو تیمور کے نام سے مشہور تھا

بیس ہزار سوار لے کر پنجاب پر چڑھ آیا۔ لاہور اور دیپالپور کو فتح کر کے ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد قاآن خان نے اس کا مقابلہ کیا اور برابر اسے شکستیں دیں۔ مگر نوشتۂ تقدیر کو کون ٹال سکتا تھا چنانچہ دشمن کی طرف سے ایک تیر آیا اور سلطان محمد قاآن خان کے سینے میں پیوست ہوا اور وہ شہید ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد آپ کا نام "خان شہید" مشہور ہوا۔

حضرت امیر خسرو جو اس وقت خان شہید کے پاس ملتان میں تھے گرفتار ہو کر تاتاریوں کے ساتھ بلخ پہنچے۔ وہاں پر انھوں نے کچھ پُر درد مرثیے لکھے اور غیاث الدین بلبن کے پاس دہلی بھیجے۔ ان میں سے ایک یہ تھا۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید — آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را — رخنۂ کا مسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد — برگ ریزی، گوئی اندر بوستاں آمد پدید
لبکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو — پنج آبے، دیگر اندر مولتاں آمد پدید

غرضیکہ خاندانِ غلاماں کے بعد خلجی دورِ حکومت شروع ہوا۔ جب جلال الدین خلجی حکمران تھا اس وقت ملتان کی صوبیداری اس کے بیٹے ارکلی خان کے پاس تھی اور علاؤ الدین کے دور میں ملتان کا گورنر نصرت خان تھا۔

علاؤ الدین کے دور میں منگولوں نے پھر حملے شروع کر دئے اور ۱۲۹۶ء میں برصغیر میں ان کا پہلا حملہ ہوا سلطان نے انھیں لاہور کے پاس شکست دی۔ اب یہ شکست خوردہ لشکر سندھ میں جا کر تاخت و تاراج کرنے لگا۔ خلجی فوج کے ایک بہادر جرنیل ظفر خان نے ان کا پیچھا کیا اور سندھ جا کر انھیں شکست دی اور بہت سے منگول گرفتار کر کے دہلی بھیج دیئے۔ منگول اس وقت ظفر خان سے اس قدر خوف کھانے لگے کہ ان میں ایک مقولہ مشہور ہو گیا کہ جب ان کا کوئی گھوڑا پانی نہ پیتا تو کہتے:

"مگر ظفر خان را ندیدی کہ آب نمی خوری"

بہرام ایبہ خلجی دور کے آخر میں بہرام ایبہ اوچ کا گورنر تھا اور وہ ایک ترکی امیر تھا۔ خلجی دورِ حکومت ختم ہوا تو تغلق ان کے جانشین ٹھہرے۔ محمد تغلق کے وقت بہرام ایبہ جب کہ ملتان کا گورنر تھا تو بغاوت کر دی۔ محمد تغلق فوج لے کر فوراً ملتان پہنچا اور بہرام ایبہ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اس کی جگہ غازی ملک کو صوبہ دار بنا دیا جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق شاہ کے نام سے برصغیر کا بادشاہ بنا۔ تغلق شاہ کے عہد

میں سندھ کے سومروں نے بغاوت کر دی اور ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا اس وقت سلطان تغلق نے ملتان کی زمام حکومت ملک تاج الدین کے سپرد کر دی۔

غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا "جونا خان" محمد تغلق کے لقب سے برصغیر کا بادشاہ ہوا۔ محمد تغلق کے دور میں گجرات کے صوبہ دار طغی نے بغاوت کی اور محمد تغلق اس کی سرکوبی کے لئے سندھ پہنچا اور وہ ۱۳۲۶ء سے ۱۳۵۰ء تک وہاں پر بیٹھا رہا۔ طغی اس کے ڈر سے جنگلوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار اس نے سندھ کے سومروں کے پاس جا کر پناہ لی۔ سلطان محمد تغلق بھی سمندر کے راستے سے اس کے پاس پہنچا مگر وہ ابھی ٹھٹھہ سے چودہ میل دور ہی تھا کہ ۱۳۵۱ء میں اجل کا فرشتہ پہنچ گیا اور وفات پائی۔

اس وقت فیروز شاہ تغلق بھی سلطان کے ہمراہ تھا اور سلطان کی وصیت تھی کہ اس کے بعد فیروز شاہ کو اقتدار حکومت سونپا جائے، چنانچہ محمد تغلق کی وصیت کے مطابق اس نے شاہی اختیارات سنبھال لیئے۔ سوئے اتفاق کہ شاہی فوج سندھ کے دہقانوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت کی زد میں آچکی تھی اور سخت پریشان تھی اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر جان بچانے کی فکر میں تھی لیڈروں نے ان کے خیمے اور خرگاہیں تک لوٹ لی گئیں اور یہ لٹی پٹی فوج دہلی واپس پہنچی اس وقت سندھیوں نے کہا:

برکت شیخ بیٹھا، اِک مُوا، اِک نٹھا

الغرض ان دِنوں ملتان کا حاکم قطب الملک نام کا کوئی سردار تھا۔

سید خضر خان ۔ تغلق دورِ حکومت میں ملتان کے گورنروں میں سے ملک مردان دولت سید خضر خان اور ملو اقبال وغیرہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا اور اسے لوٹا۔ سید خضر خان اس وقت تیمور سے ملا، لاہور اور ملتان کی حکومت کا پروانہ اس سے لے لیا۔ سید خضر خان ۱۴۱۲ء تک برابر لاہور اور ملتان کا حکمران چلا آیا۔ ۱۴۱۲ء میں تغلق خاندان کا آخری تاجدار محمود خان فوت ہو گیا تو لوگوں نے دولت نامی ایک سردار کو دہلی کا بادشاہ بنا دیا مگر جلد ہی خضر خان نے اس سے دہلی کا تاج و تخت چھین لیا اور برصغیر میں سید خاندان کی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔

بہلول لودھی ۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جب ملک مردان دولت ملتان کا حاکم بنا تو اس کے پاس ملک بہرام لودھی آیا اور ملازم ہوگیا۔ ملک مردان کے بعد سید خضر خان ملتان کا گورنر بنا تو ملک بہرام کے بیٹے ملک سلطان لودھی نے اس کی ملازمت اختیار کرلی۔ خضر خان نے ملک سلطان لودھی کی اعلیٰ خدمات کے عوض میں اسے سرہند کی حکومت سونپ دی اور اسلام خان کا خطاب بخشا۔

اسلام خان لودھی نے پھر اپنے بھتیجے بہلول خان لودھی کو اپنا جانشین بنا دیا سرہند اور ملتان کی حکومت اس کے حوالے کی۔ بہلول لودھی نے ۱۴۳۵ء میں ملتان کی حکومت سنبھالی تھی۔ اور ۱۴۵۱ء میں اس نے سادات خاندان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دہلی کے تخت پر قبضہ کرلیا تھا اس وقت بہلول لودھی نے ملتان کی حکومت اپنے چچا اسلام خان کے حوالے کردی۔ اسی اسلام خان نے آگے چل کر ڈیرہ غازیخان کی ایک علیحدہ ریاست قائم کرلی تھی۔ جو ناہڑ لودھی خاندان کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ یوسف ۔ شیخ یوسف حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی اولاد میں چھٹی یا ساتویں پشت پر تھا۔ امیر تیمور کے حملۂ دہلی کے بعد ملک میں طوائف الملوکی نے جنم لیا۔ اور ہر طرف انارکی پھیل گئی جس کے پاس جو ٹکڑا ملک تھا دبا کر بیٹھ گیا۔ ملک کا امن و امان تباہ ہو کر رہ گیا اس موقع پر ملتان کے شرفاء نے فیصلہ کیا کہ ملتان کی نظامت کسی مقامی آدمی کے انتظام میں دے دی جائے جو اس کے لئے موزوں ہو۔ چنانچہ اس وقت ان کی نگاہ ملتان کے قدیم روحانی پیشوا قریشی گھرانے پر پڑی اور شیخ محمد یوسف کو ملتان اور اوچ کا حاکم بنا دیا، اور اسے حاکم وقت تسلیم کرکے اس کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کردیا یہ ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) کا واقعہ ہے[1]۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب میں آئین اکبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ یوسف نے ستر سال تک حکومت کی۔ مگر فرشتہ اسے صرف دو سال کا عرصہ بیان کرتا ہے پہلی روایت درست معلوم نہیں ہوتی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

رائے سہرہ (قطب الدین لنگاہ) رائے سہرہ کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ افغان

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۲۴۔

قبیلے سے تھا تحفۃ الکرام کے مصنف نے اسے سومرہ کہا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان میں اسے جاٹ لکھا ہے اور تاریخ شیر شاہی نے اسے (شہر لنکا) کا باشندہ بیان کیا ہے ٹاڈ صاحب نے تاریخ ابوالفضل کے حوالے سے سبتی (بلوچستان) کے لومڑی قبیلہ سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "تاریخ ابوالفضل کی رو سے ساکنان (سبتی) کی قوم لومڑی معلوم ہوتی ہے۔ یہ قوم جٹ (جاٹ) کی کثیر التعداد شاخ مذہب اسلام قبول کرکے مشہور ہوگئی۔ بھٹی تاریخیں ایک جگہ اسے راجپوت لکھتی ہیں دوسری جگہ پٹھان .... چنانچہ رائے کے خطاب سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قوم ہندو تھی"[1]۔

بہرصورت رائے سہرہ کے شیخ یوسف کے ساتھ تعلقات کی ابتداء اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ سید خضر خان جب دہلی کا بادشاہ ہوا تو اس نے ملتان میں شیخ یوسف کو صوبہ دار بنا دیا اس وقت رائے سہرہ جو سوی (سبتی) کا سردار تھا ملتان آیا اور شیخ یوسف کو ملتان پر برسراقتدار آنے کی مبارک باد پیش کی اور اپنی اور اپنے بزرگوں کی شیخ بہاؤالدین زکریا سے ارادتمندی ظاہر کی اور اپنے قدیم تعلقات جتائے۔ اور بہاؤالدین زکریا کے مزار پر نذرانہ پیش کیا اور عقیدت کے پھول چڑھائے خود شیخ یوسف کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کئے اور سوی کو واپس چلا گیا۔

اسی طرح وہ گاہے بگاہے ملتان آتا مزار بہاؤالدین زکریا پر چڑھاوے چڑھاتا تحفے پیش کرتا اور نیازمندی کا دم بھرتا اور چلا جاتا تھا چند بار ایسا کرنے کے بعد اس نے شیخ یوسف سے اپنی ایک لڑکی کا عقدِ نکاح کردیا اس طرح اسے زیادہ قرب حاصل ہوگیا اب وہ ملتان میں بے تکلف آنے جانے لگا۔

چنانچہ ایک بار رائے سہرہ جب ملتان میں آیا تو اپنے ساتھ بلوچی لشکر کے جانباز بھی لایا[2]۔ اور ملتان سے باہر آکر ٹھہرا اور اپنے چند مصاحبین کے ہمراہ شیخ یوسف کی خدمت میں پہنچا اور شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ ساتھ ہی اپنی فوجی خدمات پیش کیں اور کہا کہ میں ایک دستۂ فوج ساتھ لایا ہوں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کی خدمت میں چھوڑ جاؤں الغرض وہ شیخ صاحب سے فارغ ہوکر اپنی بیٹی سے ملنے کیلئے حرم سرا میں پہنچا اور شب بسر کی۔

[1] ٹاڈ راجستان ص ۸، ۱۴ [2] تاریخ اوچ ص ۱۴۵۔

رات کا جب کافی وقت گزر گیا تو رائے سُہرہ بستر سے اُٹھا اپنے ایک ساتھی سے بُزغالہ ذبح کرایا اَور اس کا گرم گرم خون پی گیا پھر اس خون کی قے کر ڈالی اَور پیٹ کے درد کا بہانہ بنا کر کراہنے اَور لوٹنے پوٹنے لگا اس کی اس نازک صورتحال کی شیخ یوسف کو اطلاع کر دی گئی شاہی طبیب آئے نسخہ جات لکھے گئے اَور دوائیاں پلائی گئیں مگر آرام نہ آنا تھا نہ آیا بالآخر رائے سُہرہ نے کہا کہ میرا وقت اخیر ہے اور مرتا ہُوں میرے فلاں فلاں سردار کو بلایا جائے تاکہ میں انہیں کچھ وصیت کر سکوں چنانچہ شیخ یوسف کی اجازت سے قلعہ کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھیوں کو اندر بُلا لیا گیا جونہی قلعہ کا دروازہ کھُلا رائے سُہرہ کا فوجی لشکر جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا قلعہ میں داخل ہو گیا اَور محافظین قلعہ کو تہہ تیغ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اَور شیخ یوسف کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جہاں سے وہ موقع پا کر بعد میں فرار ہو گیا اور بہلول لودھی کے پاس دہلی پہنچا اس سے یہ تمام ماجرا سُنایا اَور مدد کا خواستگار ہُوا۔

بہلول لودھی ابھی اپنے ملکی اِنتظام و انصرام میں مصروف تھا اس لئے فوری طور پر شیخ صاحب کی مدد نہ کر سکا البتہ اُسے عزت اور تکریم سے اپنے پاس رکھا اَور اس کے لڑکے عبداللہ سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی اَور اپنی مکمل عقیدتمندی کا ثبوت دیا۔

ادھر رائے سُہرہ نے ملتان پر قبضہ کرتے ہی قطب الدین لنگاہ کا شاہی لقب اختیار کیا اَور ملتان کا بادشاہ بن بیٹھا۔ قطب الدین لنگاہ نے ملتان میں اپنے نام کا سِکّہ جاری کیا اَور خطبہ پڑھوایا اِس طرح اس نے ملتان میں بائیس ۲۲ سال تک حکومت کی اور ۸۷۴ھ (۱۴۶۹ء) میں اِنتقال کیا۔

سُلطان حسین خان لنگاہ ۔ قطب الدین لنگاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان حسین خان تخت نشین ہُوا یہ بڑا لائق مُنتظم، منصرم اور قابل حکمران تھا اس نے اپنے دورِ اقتدار میں ملتان کی سلطنت کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ اُسے وُسعت دی اس نے شورکوٹ، چنیوٹ، خوشاب اور بھیرہ کے علاقوں کو فتح کر کے سلطنت ملتان میں شامل کر لیا۔ اس طرح ملتان کی لنگاہ حکومت کے جھنڈے سیت پور سے دھنکوٹ تک پھیل گئے دریائے سندھ کے مغرب کا علاقہ دامن پہاڑ تک صوبہ کوٹ کروڑ کے

ماتحت تھا۔ کوٹ کروڑ (لعل عیسن کروڑ) میں اس وقت سلطان حسین خان کا بھائی شہاب الدین لنگاہ سلطنت ملتان کی طرف سے صوبہ دار تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ شیخ محمد یوسف ملتان کی حکومت چھن جانے کے بعد دہلی کے بادشاہ بہلول لودھی کے پاس چلا گیا تھا اَور اس سے فوجی مدد چاہی تھی بہلول لودھی نے اب اپنے ملکی حالات سے فراغت پا کر ملتان کی طرف رجوع کیا اَور اپنے بیٹے باربک شاہ کو لشکر جرار دیکر ملتان کی مہم پر بھیج دیا۔ اس فوج کا سپہ سالار تاتار خان کو بنایا گیا تھا اَور پنجاب کے گورنر دولت خان کو حکم دیا کہ وہ بھی اس لڑائی میں شریک ہو۔

اِتفاق سے اس وقت کوٹ کروڑ کا ناظم شہاب الدین خان لنگاہ اپنے بھائی حسین خان کے خلاف بغاوت کر چکا تھا اور سلطان حسین اس کی بغاوت کو کچلنے کی غرض سے کوٹ کروڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اِسی اثنا میں سلطان حسین خان لنگاہ کو ملتان پر باربک شاہ کے حملہ کی اطلاع ہوئی لیکن یہ اِطلاع اس وقت ملی جبکہ باربک شاہ ملتان سے باہر عیدگاہ کے قریب خیمہ زن ہو چکا تھا اَور صبح کو اٹھ کر اس نے ملتان پر قبضہ کر لینا تھا۔

حسین خان لنگاہ جو لڑائی کے میدان کا مرد تھا یہ خبر پاتے ہی راتوں رات کوٹ کروڑ کا محاصرہ چھوڑ ملتان کی طرف روانہ ہو پڑا وہ رات کے آخری پہر میں ملتان پہنچ گیا اَور بارہ ہزار کے لشکر کی ٹولیاں بنا کر غنیم کے سامنے آموجود ہُوا اس نے فوج کو حکم دیا کہ پو پھٹتے (صبح صادق) ہی جنگ کا طبل بجا دیا جائے اَور اس طبل کو سن کر بیک وقت بارہ ہزار تیر دشمن پر چھوڑ دیئے جائیں۔ اِسی طرح دوسرے طبل پر دوسری سمت سے اَور تیسرے طبل پر تیسری طرف سے غنیم پر تیر چھوڑے جائیں چنانچہ وہ پہلے خود پیدل ہُوا اَور پھر لشکر کو پیدل ہونے کا حکم دیا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ پہلی بار طبل ہونے پر حسین خان کے لشکر نے غنیم پر یکبارگی بارہ ہزار

[1] سلطان اپنے بھائی شہاب الدین کو اس وقت پا بہ زنجیر کر کے ملتان ساتھ لے آیا تھا ایک نامعلوم عرصہ کے بعد جب اسے رہا کیا گیا تو وہ سنگھڑ کے علاقہ میں چلا آیا۔ غالباً اس نے اس علاقہ میں وفات پائی اور ٹب میں دفن کیا گیا جہاں پر چند سال پیشتر اس کے مقبرہ کے آثار ظاہر ہوئے تھے جس کھیت میں شہاب الدین لنگاہ کے مقبرہ کے آثار پائے گئے اس کا نام اس وقت ہندیرا (حظیرہ) والا بند ہے

تیر برسائے اِس تیر باری پر لودھی لشکر سراسیمہ ہؤا، دوسری بار تیر چھوڑنے پر وہ لشکر منتشر ہونے لگا۔ اَور تیسری دفعہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ سلطان حسین کے لشکر نے بڑی دور تک اس بھاگتے لشکر کا تعاقب کیا اَور فتح مبین سے ہمکنار ہو کر ملتان کو واپس لوٹ آیا۔[۵۱]

اسی موقع کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ملک سہراب خان دودائی بلوچ اپنے پسران اِسمٰعیل خان اور فتح خان اور اپنے دیگر مصاحبین حاجی خان میرانی وغیرہ کے ہمراہ کیچ مکران سے چل کر حسین خان لنگاہ کے پاس چلا آیا تھا اَور اسی لڑائی میں حسین خان لنگاہ کی بھرپور مدد کی اَور اس کی شکست کو فتح میں بدل دیا تھا حسین خان نے سہراب خان دودائی کی آمد کو اپنے لئے ایک نیک فال سمجھا اور کوٹ کروڑ سے دھنکوٹ تک کا علاقہ اُسے جاگیر میں دے دیا اِس جاگیر میں دریائے سندھ کا مغربی علاقہ (ڈیرہ جات) شامل تھا۔

چنانچہ اس وقت بلوچوں نے اپنی نوآبادیات قائم کیں اَور آباد ہوئے حاجی خان میرانی کے حصّہ میں ڈیرہ غازیخان کا خطّہ آیا تھا جہاں پر اس نے ڈیرہ غازیخان کی ایک نیم خود مختیار حکومت قائم کر لی۔

---

۵۱ تاریخ فرشتہ ص ۳۲۵ تا ۳۲۸

ہڑند و داجل کی ناہڑ لوئی حکومت

ناہڑ قوم کے لوگ اپنے آپ کو افغان لودھی بیان کرتے ہیں اپنا مورثِ اعلیٰ ابو الفتح نامی یک سردار کو کہتے ہیں یہ ہڑند و داجل کے ناہڑ لوگوں کا بیان ہے لیکن سیت پور کے ناہڑوں کا کہنا ہے کہ اِسلام خان ان کا پہلا سردار ہؤا ہے حقیقت یہ ہے کہ اِن دونوں خاندانوں میں نسلی فرق ہے جیساکہ ان روایات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب میں ہے کہ " ناہڑوں کی اصلیّت نامعلوم ہے غالباً یہ راجپوت یا جاٹ تھے "[۵۲] تواریخ ڈیرہ غازیخان کا بیان ہے کہ علاقہ ہڑند و داجل کا ناہڑ خاندان سیت پور کے ناہڑ خاندان سے علیحدہ ہے۔ پہلے خاندان کا بانی بہادر خان تھا جبکہ دوسرا خاندان عیسن خان کی اولاد سے ہے اَور یہ بھی کہا ہے کہ ابو الفتح جو کہ بہادر خان کا بھائی تھا اَور ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) میں ملتان کا صوبہ دار تھا اَور سلطان محمود غزنوی ایک حملہ کے دوران اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا تھا اس وقت بہادر خان یہاں سے بھاگ کر اندر پہاڑ علاقہ بارکھان کو چلا گیا اَور سلطان محمود کے چلے جانے کے بعد بہادر خان واپس آگیا اَور ہڑند و داجل پر دوبارہ قابض ہوگیا۔ چنانچہ بہادر خان کی اولاد ایک مدت تک یہاں پر حکمران رہی۔[۵۳]

بندوبست ۱۸۷۲ء محکمہ مال کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الفتح حکومت خراسان کی طرف سے ہڑند و داجل کے علاقہ میں گورنر تھا اس نے ہڑند کا قلعہ مرمت کرایا اور اِس میں اپنی رہائش رکھی اور حکومت کی۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان میں ابو الفتح کو شیخ حمید کا پوتا بیان کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابو الفتح داؤد بن نصر بن شیخ حمید لوئی وہ شخص ہے جس کا تعلق افغان لودھی سے نہیں بلکہ وہ قریش عرب کی ایک شاخ سامہ بن لوئی بن غالب کی اولاد سے تھا۔ جس کا مفصّل ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے اور دوسرے ناہڑ خاندان کے متعلّق کہا جاتا ہے۔ کہ ۱۴۳۵ء میں جب کہ بہلول لودھی سادات خاندان کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا اُس نے یہ علاقہ اپنے چچا اسلام خان لودھی کے حوالے کر دیا۔

---

۵۲ کتاب مذکور ص ۔ ۵۳ ۔ تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۲۷۔

تو اس نے سیت پور کی ریاست قائم کی اور وہ ناہڑ لودھی کی حکومت کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان دونوں ناہڑ خاندانوں کے درمیان جہاں عصری فرق پایا جاتا ہے، وہاں پر یہ بھی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں برصغیر پاک و ہند میں افغان لودھی خاندان کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس عصری فرق میں کم و بیش چار سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔

اور سید سلیمان ندوی کے اس بیان کے بعد مزید کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ لکھتے ہیں" فارسی مؤرخین کو ملتان کی عربی تاریخ سے مطلقاً آگاہی نہیں تھی۔ اس لئے وہ ملتان کے ان مسلمان رئیسوں کو افغانی سمجھنے پر مجبور تھے ورنہ شیخ حمید وغیرہ کا اصل افغانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔[1]

غرضیکہ ہڑند و داجل کے ناہڑ خاندان کا سیت پور کے ناہڑ خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ دونوں علیحدہ خاندان ہیں۔ بہرکیف مؤرخین نے لفظ ناہڑ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ناہڑ یہاں کی زبان میں بھیڑیئے کو کہتے ہیں اور بھیڑیئے کا کام کمزور اور ناتواں جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھا جانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس جنگل میں شیر نہ ہو اس میں بھیڑیا ہی شیر ہوتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے ابتداً میں یہاں کی غریب عوام کو لوٹا اور ان کی جائیدادوں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا جس وجہ سے وہ ناہڑ (بھیڑیئے) مشہور ہو گئے۔

شیخ حمید لوئی - مؤرخین کے بیان کے مطابق جب خلافتِ اسلامیہ میں تبدیلی واقع ہوئی اور سنی عباسی خاندان کے بعد شیعہ فاطمی خاندان برسر اقتدار آگیا تو جلم بن شیبان ایک اسمٰعیلی مبلغ سندھ اور ملتان کے لوگوں کو ایک خفیہ تحریک کے ذریعے شیعہ مسلک پر تیار کر لیا اور ملتان کی سنی نواحیہ حکومت کی جگہ اس قبیلہ کی شیعہ حکومت قائم کر لی اور خود تھوڑا عرصہ حکومت کر کے ۳۴۰ھ (۹۵۱ء) میں وفات پا گیا۔

جلم بن شیبان کے خاندان میں شیخ حمید برسر اقتدار آگیا اور اس دور میں سلطان سبکتگین نے لاہور کے راجہ جے پال پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ اور اس کا علاقہ دریائے سندھ سے مغرب میں اور ملتان کا کچھ حصہ چھین کر شیخ حمید کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ دریا کے دائیں کنارہ پر اس نے اپنا ایک نائب مقرر کر دیا جو ہڑند میں رہتا تھا۔

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۱۹۔

ابوالفتح داؤد بن نصر - شیخ حمید کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصر جانشین ہوا۔ پھر اس کے لڑکے ابوالفتح داؤد نے ملتان کی اقتدار سنبھالی۔

۳۹۵ھ (۱۰۰۵ء) میں سلطان محمود غزنوی نے بھاٹیہ کے راجہ بجے راؤ پر چڑھائی کی تو اس وقت ابوالفتح نے سلطان کے خلاف بجیراؤ کی مدد کی تھی، جس کا سلطان کو بہرحال دکھ تھا۔ اس وقت وہ خاموش ہو کر غزنی کو واپس چلا گیا۔ اور اگلے سال واپس آیا اور ملتان کا محاصرہ کیا اس وقت اہالیان ملتان نے فریقین کے درمیان صلح کرا دی۔

ابوالفتح نے شیعیت سے توبہ کر لی اور سنی مسلک اختیار کر لیا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ اہل سنت کے احکام جاری کرے گا اور خراج دینا بھی منظور کر لیا۔ مگر وہ اپنے اس عہد و پیمان سے جلد منحرف ہو گیا اور باغی ہو بیٹھا چنانچہ سلطان محمود نے دوبارہ حملہ کر دیا ابوالفتح گرفتار ہو کر قلعہ غور میں قید کر دیا گیا جہاں پر اس نے قید کی حالت میں وفات پائی۔

اس وقت سلطان نے ملتان کے صوبہ کو غزنی کے تابع کر دیا اور یہاں پر اپنے گورنر غزنی سے بھیجنا شروع کر دیئے۔

بہادر خان - بہادر خان جو کہ شیخ حمید لوئی کا بھائی تھا اور ڈیرہ غازیخان میں حکومت کرتا تھا ہڑند اس کا صدر مقام تھا سلطان محمود نے جب یہاں پر حملہ کیا تو وہ اندر پہاڑی علاقہ بارکھان کو بھاگ گیا۔ جب سلطان غزنی کو واپس چلا گیا تو بہادر خان نے بارکھان سے واپس آکر ڈیرہ غازیخان کی حکومت دوبارہ سنبھال لی۔

مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ بہادر خان اور اس کے خاندان نے ہڑند اور داجل کے علاقہ پر کافی عرصہ تک حکومت کی۔ ہڑند کا یہ ناہڑ خاندان بادشاہ دہلی سے غازیخان اول کی دست درازیوں کے خلاف جب شکایت لے کر گیا تو اس نے غازیخان کے مؤقف کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا قبضہ بحال رکھا۔ اور ناہڑ خاندان کو اس روز سے اس علاقہ سے بیدخل کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ زیادہ تر بارکھان کو ترک سکونت کر گئے جہاں پر یہ لوگ اب بھی آباد ہیں اور تمن کھتران کا ایک جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کا اس وقت و ڈیرہ عمر خان ہے۔

عام حالات - بارکھان کے مغرب میں بارہ میل کے فاصلہ پر ناہڑ کوٹ، نیلڑہ، جھلی

اور لغاری بارکھان کی ناہڑ آبادیاں ہیں۔ یہ لوگ معمولی زمیندار ہیں اور زیادہ تر کاروبار تجارت کرتے ہیں۔ ہتیورام نے ناہڑ لوئی خاندان کے ان باقیات کے متعلق لکھا ہے کہ" یہ وہ ناہڑ ہیں جو کسی زمانہ میں ملک داجل و ہڑند کے مالک و نواب تھے ..... انقلاب زمانہ سے جب حکومت کو زوال ہوا تو علاقہ ہڑند سے یہ لوگ سیدھے اس طرف علاقہ بارکھان میں چلے گئے اور سکونت اختیار کی۔ بسبب خوف جنگ و جدل قوم مری، شامل کھتران ہو گئے لغاری بارکھان کی زمینات ناہڑ لوگ آباد کرتے ہیں[۵]۔

الغرض اس وقت ناہڑ کوٹ کا وڈیرہ عمر خان ہے بھتیجا کا کمال خان، حیلی کا دلیل اور لغاری کوٹ کا فاضل خان۔ ان کی مہمان نوازی کا یہ عالم ہے کہ میں صبح کو بارکھان سے ناشتہ کر کے ان لوگوں کے پاس گیا ان سے ملا اور علاقہ کے حالات معلوم کئے لیکن شام کو خالی پیٹ بارکھان واپس لوٹ آیا۔ ان میں سے کسی نے کھانے اور ستانے کا نہیں پوچھا۔ خصوصاً عمر خان اور کمال خان سے میری ملاقات رہی، اور وہ اس معاملہ میں کنی کتراتے رہے اور میں نے بھی چپ سادھ لی۔ اس خاندان کا ایک شخص حکیم خان محمد خان ہے، وہ اس وقت ہڑند میں رہتا ہے، خوش اخلاق، نیک کردار اور مہمان نواز ہے اور اچھا اثر و رسوخ رکھتا ہے ساٹھ سال سے زائد عمر کا ہے۔

داجل

داجل - قصبہ داجل، جام پور شہر سے بجانب غرب بائیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے داؤد خان ناہڑ سردار نے اسے آباد کیا تھا۔ اس وقت وہ ہڑند سے اٹھ کر یہاں چلا آیا اور جال کے ایک درخت کے نیچے آکر اپنا خیمہ نصب کیا۔ جہاں پر بعد میں ایک آبادی قائم ہو گئی۔ اور داؤد جال کے نام سے مشہور ہوئی، جو امتداد زمانہ سے داجل بن گیا، داجل کے بازار میں داؤد خان کی قبر اور درخت جال تا حال موجود ہیں۔

ناہڑ کوٹ

ناہڑ کوٹ - یہ آبادی قصبہ بارکھان سے مغرب کی طرف بارہ میل کے فاصلہ پر موجود ہے کوٹ کی فصیل بدستور قائم ہے اور اس کے اندر ناہڑ کوٹ کی ایک مختصر آبادی ہے وہاں کا وڈیرہ عمر خان ہے آٹے کی چکی لگا رکھی ہے زمینداری کاروبار کے علاوہ تجارت بھی کرتا ہے۔ لمبا تڑنگا سرخ اور لمبوترے چہرے والا پچپن سالہ جوان ہے۔ مگر آدابِ گفتگو

[۵] گل بہار ص ۲۶۸۔

اور مہمان نوازی سے کورا ہے۔

سہران

سہران - مہران بلوچی زبان میں سونے اور طلائی چیز کو کہتے ہیں یہ ایک مثمن شکل کی عمارت ہے اور بوسیدہ حالت میں ہے چھت اور قبہ گر چکے ہیں۔ ناہڑ کوٹ سے تقریباً دو میل مغرب میں ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ اس کے پاس ہی مشرقی ٹیلہ پر مسجد تھی جس کے آثار اب مٹ چکے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر شہزادہ جہانگیر قندھار کی مہم پر جاتے ہوئے اس راستہ سے گزرا تھا۔ اس کا سپہ سالار مہابت خان یہاں پر بقضائے الٰہی فوت ہو گیا اور اسے اس موقع پر دفن کر دیا گیا، اور قبہ بنا کر اس کی یادگار (مقبرہ) تعمیر کر لیا گیا ساتھ ہی مسجد تعمیر ہوئی اس وقت اس مقبرہ کی عمارت پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں ہے۔

لالہ حکم چند نے ایک کتبہ کا نقش دیا ہے جو اس موقع سے متعلق ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

نقش اوّل

نقش اوّل -" بتاریخ ہفتدہم ماہ رمضان ۱۰۱۸ھ بحکم بندگان حضرت نور الدین محمد جہانگیر شاہ، بادشاہ غازی بکمک قندھار تعین شدہ بود، ازیں نیز منزل عبور نمود۔ خسراہ میر بزرگ ایں نواب مرحومی میر معصوم بکری المتخلص بنای "

نقش ثانی

لیکن لالہ ہتیورام نے اس نقش کے ساتھ دو اور نقش دیئے ہیں، جو یہ ہیں:۔

نقش ثانی -" از ماہ ذوالحج روز دو شنبہ از ماہ ذوالحج "

نقش ثالث

" اللہ "

" بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم "

" بنا شد مسجد از ال ملک بو باتور ترینی فرد خیل لوسیانی در عہد سلطان فیروز شاہ شانزدہم ماہ ذوالحج روز دو شنبہ نقل گردید و بستم از ماہ ذوالحج روز آدینہ مسجد برآوردہ شد۔ سنہ سبعین و سبع مائیۃ ۷۷۰ھ ہجریہ مقدسہ۔ خدائی برآں بندہ رحمت کند ہر کسے دریں مقام رسد فاتحہ باخلاص مدد نماید۔ حسن خیر جستن خیر۔ شخص سنگ گا فین استاد سند زرگر تمایو"

" تمت "

در دار یکے کفکف رخشندہ نماند　　زاں خواجہ پیشینہ یکے زندہ نماند
آں کرہ آتشیں بر تودہ سل　　خواہندہ کجا رود کہ بخشندہ نماند[1]

ان کتبات کو نقل کرنے سے قبل بہتورام نے لکھا ہے۔ کہ " پارسال عندالدورہ علاقہ بارکھان ایک پرانی خانقاہ قریب تغاری بارکھان کے دیکھی گئی جس کے اوپر چند اینٹ سنگ مشبتہ الفاظ تواریخ وسبب تعمیر وغیرہ حالات لگے ہوئے تھے۔ نقل اس کی جس قدر پڑھنے میں آئی کی گئی

ان روایات اور کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سہراں کا مقبرہ اور اس کے ساتھ مسجد فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت ۷۷۲ھ میں تعمیر ہوئے اور جہانگیر بادشاہ صرف اپنی تحریر چھوڑ گیا جو غالباً اس مقام پر پہنچا تھا۔ اور فیروز شاہ کے کتبہ کو دیکھ کر اس نے اپنی قلمی یادگار تحریر کر دی۔ بہرحال سرزمین ڈیرہ غازیخان سے ہوکر یہ دونوں شہنشاہ اس طرف سے گزرے ہیں اور یہ راستہ بڑرند اور درہ چیا چیڑ کا ہے۔

---

[1] گل بہار ص ۷۷، ۷۸ - تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۹۵۔

سیت پور کی ناہڑ لودھی حکومت

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سیت پور کا ناہڑ خاندان افغان لودھی سے ہے جبکہ بڑرند اور داجل کے حکمران ناہڑ قبیلہ عرب کے لوئی قبیلہ کی شاخ ہے خود سیت پور کے ناہڑوں کا بیان بھی یہی ہے کہ وہ اسلام خان لودھی کی اولاد سے ہیں۔ اسلام خان برصغیر کے بادشاہ بہلول لودھی کا چچا تھا[1] اگرچہ بعض لوگوں نے اسے بہلول لودھی کا بھتیجا کہا ہے، مگر یہ غلط ہے۔

لودھی خاندان کی برصغیر میں آمد: بیان کیا جاتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں جبکہ ملک مردان دولت ملتان کا گورنر تھا۔ ان ایام میں ملک برام لودھی اپنی قوم وقبیلے سے ناراض ہوکر ملتان چلا آیا، اور ملک مردان دولت کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ملک مردان دولت نے وفات پائی اور اس کی جگہ سید خضر خان ملتان کا حاکم ہوا۔ ملک برام لودھی کے پانچ لڑکے تھے جن میں سے ملک سلطان بڑا تھا۔ اور وہ سید خضر خان کی سلکِ ملازمت سے منسلک ہوگیا اور اس نے کچھ قابل قدر نمایاں کام انجام دیں جس سے متاثر ہوکر سید خضر خان نے اسے سرہند اور ملتان کی صوبہ داری سونپ دی۔ ساتھ ہی اسلام خان کا خطاب دیا[2] کچھ عرصہ بعد اسلام خان نے یہ حکومت اپنے بھتیجے بہلول لودھی کے سپرد کر دی، جو آگے چل کر برصغیر پاک و ہند میں لودھی سلطنت کا بانی ہوا۔ چنانچہ سید خاندان میں زوال آجانے پر بہلول لودھی نے سلطنت دہلی پر قبضہ کر لیا اور ملتان کا صوبہ اپنے چچا اسلام خان (ملک سلطان) کو واپس دے دیا۔ جس نے بعد میں سرزمین ڈیرہ غازیخان پر سیت پور کی ناہڑ لودھی حکومت قائم کر دی سیت پور اس وقت دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع تھا۔

اسلام خان اوّل: - اسلام خان نے جب سیت پور میں اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی اور سیت پور کو اپنا صدر مقام بنایا تو اس کی حدود یہ تھیں۔ دریائے

---

[1] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۹۵۔ [2] حیات افغانی ص ۲۸۸۔

سندھ کا وہ درمیانی علاقہ جو اوچ کے مقام پر دریائے چناب سے ملا ہوا تھا اور سلسلہ کوہ سلیمان تک اسی طرح جنوب میں ہڑند سے اوچ تک اور سندھ کو شکارپور کا علاقہ اس میں شامل تھا۔ اور جب اسلام خان نے ان علاقوں کے لوگوں پر ہڑند اور داجل کے ناہڑ حکمرانوں کی طرح ظلم و جبر روا رکھا اور ان پر اپنے انداز ملوکانہ مسلط کئے تو مظلوم رعایا نے یہی کہا کہ یہ بھی کسی ناہڑ سے کم نہیں ہیں اور یہ خاندان بھی ناہڑ مشہور ہو گیا۔

اسلام خان سے متعلق زیادہ مفصل حالات میسر نہیں ہو سکے اور نہ ہی اس کے عرصہ حکومت اور انتظام مملکت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا۔ طرہ اس پر یہ ہے کہ جب کسی اسلام خان کا ذکر کیا جاتا ہے تو مؤرخین اس سے مراد اسلام خان سوم ہی لیتے ہیں اور اسی کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب میں ہے کہ بہلول لودھی نے اسی دور میں جبکہ وہ ملتان اور سرہند کا گورنر تھا۔ اپنے چچا اسلام خان کو مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازیخان کے جنوبی حصے اور سندھ کے شمالی حصہ پر مشتمل علاقہ کا ناظم بنا دیا۔[1]

بہاولپور گزیٹیر میں بیان کیا ہے کہ اسلام خان لودھی جو کہ بہلول لودھی کا چچا تھا اور بعد میں دہلی کا بادشاہ ہوا اس نے ایک ریاست کی بنیاد رکھی جس کا صدر مقام سیت پور تھا اور مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں کہا گیا ہے کہ سیت پور میں ناہڑوں کی حکومت مظفر گڑھ کی تاریخ کی بنیاد ہے اور لکھا ہے دہلی کی حکومت سے قبل بہلول لودھی صوبہ ملتان کا گورنر تھا اس نے اپنے ایک رشتہ دار اسلام خان کو سیت پور کا علاقہ بطور عطیہ دیا تھا۔ جو ہڑند اور داجل سے اوچ اور قندکوٹ (سندھ) تک اور کوہ سلیمان سے دریائے سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ جب ڈیرہ غازیخان کے حکمران غازیخان نے ہڑند اور داجل کی حکومت پر قبضہ کیا اور وہاں کے ناہڑ سردار لودھی حکومت کے پاس جا کر فریادی ہوئے تو بادشاہ دہلی نے غازیخان کا قبضہ بحال رکھا جبکہ سیت پور کے ناہڑ سرداروں کے ساتھ سرحد قائم کر دی گئی جو پیلی براہم شاہ قرار پائی تھی۔[2]

ان تواریخی بیانات کے بعد موضع بھاگسر کے نمبردار صادق محمد خان ناہڑ نے راقم الحروف

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفر گڑھ ص ۲۷، ۱۹۰۰ [2] کتاب مذکور ص

کو اپنا شجرہ نسب بھجوایا ہے اس میں انہوں نے اسلام خان کو بہلول لودھی کی پشت میں چھٹے مقام پر دکھایا ہے، مگر اس کی محکمہ مال کے ریکارڈ سے تصدیق نہیں ہو سکتی۔

عیسن خان اول ۔ بعض مؤرخین نے عیسن خان ناہڑ کو اس حکومت کا بانی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ عیسن خان جو کہ خاندان بہلول لودھی سے تھا براودی سے ناراض ہو کر بہلول کے دادا بہرام خان لودھی کے ہمراہ اس طرف چلا آیا اور سیت پور کا صوبیدار بن گیا۔[1] محکمہ مال کے ریکارڈ میں بھی ناہڑ خاندان کی اس حکومت کا بانی عیسن خان کو بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فیروز شاہ تغلق کے دور میں سیت پور کا حاکم تھا۔

اسلام خان ثانی ۔ اسلام خان اول کے دو بیٹے تھے اسلام خان اور جلال خان اول الذکر سیت پور کی حکومت کا وارث ہوا جبکہ ثانی الذکر کے حصہ میں کن کا علاقہ آیا۔ اسلام خان کی اولاد سیت پور میں اور جلال خان کی اولاد کن میں حکمران رہی یہاں تک کہ اسلام خان اول کی اولاد میں اسلام خان سوم حکمران ہوا اور یہ [illegible] مطابق ۱۶۷۳ء اورنگ زیب کا دور حکومت تھا۔ اس وقت اسلام خان سوم نے سیت پور کے علاوہ کن پر بھی قبضہ کر لیا اور جلال خان کی اولاد سرزمین ڈیرہ غازیخان کو چھوڑ کر بہاولپور (خانپور) میں جا کر آباد ہوئی۔

سلطان محمد خان اور سخی طاہر خان ۔ اسلام خان دوم کے بعد اس کا بیٹا اکرام خان جانشین ہوا اور اس کے دو بیٹے سلطان محمد خان اور شاہ عالم خان تھے شاہ عالم کا ایک لڑکا بہادر خان تھا جو لاولد فوت ہو گیا، اور سلطان محمد خان ریاست سیت پور کا حکمران ہوا یہ بڑا طاقتور اور منتظم سردار تھا۔ اس کی حکومت دور دور تک مشہور تھی مگر افسوس ہے کہ ایسے سردار کے متعلق تاریخ بالکل خاموش ہے۔ بہرحال سلطان محمد خان کے بعد اس کا بیٹا طاہر محمد خان حکمران ہوا اور وہ اپنے جود و سخا اور دینداری کے باعث سخی طاہر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ان نیک صفات کی مثال سیت پور کی وہ مسجد ہے جو مسجد سخی طاہر خان کے نام سے معروف ہے وہ یقیناً زر کثیر خرچ

[1] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۶۶۔

کرکے بنوائی گئی ہے۔ اور اپنی اعلیٰ صناعی کے باعث شاہی مسجدوں کی نظیر پیش کرتی ہے۔ سخی طاہر نے اپنے باپ کا ایک عظیم مقبرہ بنوایا جس کی مثال اس پایہ کے کسی حکمران کے زیرِ تعمیر کی نہیں مل سکتی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں باپ بیٹا اسی مقبرہ میں دفن ہیں اور یہ مقبرہ سلطان محمد خان کے مقبرہ کے نام سے منسوب اور مشہور ہے۔

اسلام خان ثالث۔ سخی طاہر خان کا ایک لڑکا سلطان حسن خان تھا لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے تاریخی حالات نہیں مل سکے ہیں۔ سلطان حسن خان کا بیٹا اسلام خان سوم تھا اور یہ وہی اسلام خان ناہڑ سردار ہے جسے اکثر مؤرخین اسلام خان اوّل سمجھ کر اس سے ناہڑ خاندان کی ابتدا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان روایات سے روشن ہے اسلام خان لودھی کے تین بیٹوں نے اس علاقہ کو آپس میں تقسیم کر لیا جن میں سے بڑا لڑکا قاسم خان، منجھلا اسلام خان اور چھوٹا طاہر خان تھا۔ سیت پور طاہر خان کے حصّہ میں آیا۔[۱]

ایک اور روایت میں اسلام خان اوّل کا لڑکا عیسن خان بتایا گیا ہے اور لکھا ہے "بہلول خان لودھی ناظم ملتان نے ۱۴۵۱ء میں دہلی کی بادشاہت حاصل کی اس نے اپنے چچا اسلام خان کو دریائے سندھ اور کوہ سلیمان کے درمیانی علاقہ کی حکومت بخشی۔ اس علاقے میں مظفرگڑھ، ڈیرہ غازیخان اور مغربی سندھ کے علاقے شامل تھے اسلام خان کے پوتے نے یہ ملک اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا اور اس کے بڑے لڑکے طاہر خان کے حصّہ میں سیت پور کا علاقہ آیا۔ جو اب تحصیل علی پور کہلاتا ہے۔"[۲]

اسی طرح ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان میں بیان کیا ہے کہ میرانیوں نے ناہڑوں سے ہڑند اور داجل کا علاقہ حاصل کر لیا . . . ناہڑوں کی بقیہ حکومت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ جنوبی علاقہ اسلام خان کے پوتے قاسم خان کے حصّہ میں آیا جو عمرکوٹ سے کشمور تک واقع ہے۔ اور دوسرا حصّہ اس کے بھائی اسلام خان کے قبضہ میں تھا۔ جو شمالی حصّے پر مشتمل تھا اور اس کا صدر مقام سیت پور تھا۔[۳]

یہ حالات ۱۴۸۲ء کے دور میں بیان کیے گئے ہیں۔ بہرکیف اسلام خان سوم کے دور کے حالات سے ناہڑ لودھی خاندان کے دور پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور ان کے دور کے حالات معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان نے تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفرگڑھ ص ۴۶۳ - [۲] تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد ا ص ۵۳۲ - [۳] گزیٹیر مذکور ص ۲۲

بھاگوان سردار۔ بھاگسر کے بیانات میں کہا گیا ہے کہ اسلام خان سوم ایک سعادتمند اور نیک بخت سردار تھا اسے ملتانی زبان میں بھاگوان سردار کہا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس وقت اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ عیسن خان اوّل کے دو بیٹوں اسلام خان دوم اور جلال خان نے ملک کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ پہلا سردار سیت پور کا حاکم تھا جبکہ دوسرے نے کِن کی ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی۔ چنانچہ اس روز سے برابر ان کی اولاد میں حکمران چلے آئے۔ اب جبکہ اسلام خان سوم نے اقتدار سنبھالا تو اس نے علاقہ کِن بھی ہتھیا لیا اور ملک کے دونوں حصّوں سیت پور اور کِن کے درمیان ایک جدید شہر آباد کیا اور اسے اپنا صدر مقام بنایا، یہ شہر بھاگسر تھا۔ اس کا نام اسلام خان کی بخت آوری اور "بھاگوندی" کی وجہ سے بھاگسر رکھا گیا۔

اس وقت جلال خان کی اولاد کِن کو چھوڑ کر خانپور علاقہ بہاولپور میں چلی گئی اور اسلام خان سوم اس پورے علاقہ پر حکومت کرنے لگا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے سلطنت مغلیہ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا وہ سیت پور اور کِن کی حکومتوں کو آپس میں ملا لے اور یہ سلطنت دہلی کی طرف سے اس علاقہ کا ناظم ہوگا۔

بھولا بادشاہ - رائے بہادر ہتھو رام لکھتے ہیں۔ اسلام خان ناہڑ ایک سادہ لوح اور بھولا بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں ایک دفعہ رات کے وقت جبکہ سخت سردی پڑ رہی تھی جنگل کے گیدڑوں نے بھاگسر کے باہر آ کر ہینکنا اور چیخنا شروع کر دیا۔ اسلام خان نے سُنا تو مصاحبوں سے پوچھا یہ گیدڑ شور کیوں مچا رہے ہیں اور اس وقت انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایک مصاحب نے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ یہ بیچارے سردی کے مارے چلّا رہے ہیں اور گرم کپڑے اور رضائیاں مانگتے ہیں۔ حکم دیا کہ متصدّی سے رقم لے کر انہیں ابھی ابھی کپڑے اور رضائیاں دِلا دو۔ چنانچہ ان مصاحبوں نے متصدّی سے رقم لے کر آپس میں بانٹ لی اور سردار سے کہہ دیا کہ جناب کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔

اِتفاق کی بات کہ دوسری شب بھی گیدڑوں نے بھاگسر کے قریب آکر چیخنا چلانا شروع کر دیا اب اسلام خان نے ان کا شور سُنا تو کہا جب انہیں گرم کپڑے اور رضائیاں دیدی گئی ہیں تو پھر یہ کیوں شور مچا رہے ہیں۔ مصاحبین نے یک زبان ہو کر جواب دیا، حضور والا! آج وہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں اور آپ کے سر بخت کو دعا دے رہے ہیں۔ یہ سُن کر اسلام خان بڑا خوش ہوا اور کہا کہ اِنہیں کہو سردار تمہیں حکم دیتا ہے کہ اب تم اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔[1]

اِسلام خان رابع اور قاسم خان

۔ اِسلام خان ثالث کا ایک لڑکا محمد خان تھا اور اس کے تین لڑکے اِسلام خان، طاہر خان اور قاسم خان ہوئے مؤرخین کا بیان ہے کہ ان تینوں بھائیوں نے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا اِسلام خان رابع کے حِصّہ میں بھاگسر، طاہر خان کے حِصّہ میں سیت پور اور قاسم خان کے حِصّہ میں کِن آیا انہیں ناہڑ سرداروں کے وقت مزاری اور دریشک بلوچ قبیلے پہاڑ سے نکل کر باہر میدان میں آکر آباد ہوئے۔ چنانچہ بیان کیا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے کا علاقہ قوم ناہڑ کے قبضہ میں تھا۔ اس قوم کا سردار محمد قاسم خان اور اس کا صدر مقام قصبہ کِن تھا۔ ناہڑوں کے ایک دوسرے گروہ نے مقام بھاگسر کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ نیز

دوسرے مقام پر ہے " نواب محمد قاسم خان قوم ناہڑ اس وقت علاقہ روجھان پر قابض و مُتصرف تھا۔ جو خاص قیام گاہ اس کی موضع کِن میں اور علاقہ کشمور سے تا بدلی و عمر کوٹ اس کے تحت میں تھا۔[2] غالباً انہیں ناہڑ سرداروں کا دور تھا جبکہ میاں نصیر محمد خان کلہوڑہ حاکم سندھ کو شہزادہ معزالدین گرفتار کر کے دہلی لے گیا تھا اور وہ کچھ عرصہ وہاں پر قید رہنے کے بعد اس وقت فرار ہو گیا جبکہ فوجی سپاہی اسے دہلی سے قلعہ گوالیار کی طرف لئے جا رہے تھے اور یہ ان کی گرفت سے بھاگ نِکلا تھا۔ چنانچہ جیسلمیر اور اوچ کے راستے سے سیت پور اور پھر علی پور پہنچا۔ یہاں کے ناہڑ سردار اس کی گرفتاری کی پوری تیاری کر چکے تھے۔ لیکن وہ اِن سے آنکھ بچا کر ڈیرہ غازیخان کے مزاریوں کے پاس پہنچ گیا۔ جسے انہوں نے امیر بہادر خان کے پاس شکار پور (سندھ) بھجوا دیا۔

[1] گل بہار ص ۵۔ [2] گل بہار ص ۶-۱۶۳

ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ میاں نصیر محمد خان کلہوڑہ مبارک خان داؤد پوترہ پر حملہ کرنا چاہتا تھا تو سیت پور کے ناہڑ سرداروں نے شہزادہ معزالدین سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ میاں یار محمد اور مبارک خان کے درمیان لڑائی ہوئی تو زیادہ تر نقصان ہمارا ہوگا۔ شہزادہ نے میاں یار محمد کو ناہڑ سرداروں کے اس اندیشہ سے آگاہ کیا۔ جس کے جواب میں میاں یار محمد نے لکھا کہ بندہ کو ناہڑوں سے کسی قسم کی پرخاش نہیں ہے اور نہ ہی آج تک انھیں کوئی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اصل میں اِن کا دِل داؤد پوتروں کی خاطر دکھتا ہے۔ اور وہ ان پر مرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناہڑ جو چاہتے ہیں اسی کا آپ سے اِظہار کرتے ہیں۔ اِن ایام میں جس قدر داؤد پوتروں نے بے اعتدالیاں کی ہیں۔ نیازمند نے انھیں صبر و تحمل سے برداشت کیا ہے اور ان کے خِلاف کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں کی ہے۔ چنانچہ اِس روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

" بندہ را بہ ناھراں کار نیست و نہ آنہارا تا حال آسیبی رسیدہ است۔ مگر آنکہ آنہارا دِل بر مردم داؤد پوترہ می سوزد، از آں سبب در ہر رنگ کہ می دانند عرضِ خود را ظاہر می سازند، و دریں مدت بے اِعتدالیہا کہ داؤد پوترہ نمودہ اند نیازمند اغماض و تحمل کردہ بہ تلافی نہ پرداخت "۔[1]

ایک اور روایت میں بیان کیا ہے کہ ناہڑ سردار سلطنت دہلی کی طرف سے ان علاقوں کے اِجارہ دار تھے یعنی " جب اقوام بلوچی براہِ پہاڑ متصل ہڑند کے پہنچی۔ اس وقت اس پہاڑ پر افغان لوگ مالدار بستے تھے۔ اور علاقہ ہڑند میں زمین کی طرف ناہڑ لوگ منجانب بادشاہ دہلی اِجارہ دار (بطور صوبہ دار) کے تھے"[2] اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بھاگسر اور کِن کے ناہڑ سردار آپس میں لڑ بھی پڑتے تھے۔

چنانچہ مزاری جب یہاں آئے تو روجھان میں ناہڑ قبیلہ رہتا تھا۔ قاسم خان ناہڑ کن کا حکمران تھا اور اِسلام خان بھاگسر میں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے لڑ چکے تھے اسلام خان کے خلاف مزاریوں نے قاسم خان کی مدد کی[3] اور ان کی اس وقت کی طاقت اور قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کس قدر طاقتور تھے چنانچہ ایک موقع پر جب

[1] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج۔ ص ۲۶۱ [2] گل بہار ص ۱۹۶۔ تاریخ ڈیرہ غازیخان ص ۷۸ [3] ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان ص ۷۵

بستی کا حاکم بختیار خان پنی قتل ہوا تو اس کی جگہ اس کے بھتیجے ملک اللہ بخش کو وہاں کا حاکم بنایا گیا وہ اِس کا اِنتظام نہ سنبھال سکا اَور غازیخان میررانی کو بستی کی حکومت سونپی گئی، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا پھر یہ نظامت جس میں ڈھاڈر کا علاقہ بھی شامل تھا اِسلام خان اَور قاسم خان ناہڑ سرداروں کے سپرد ہوئی[1] یہ واقعات ۱۶۰۰ء سے کچھ عرصہ پہلے کے ہیں۔

طاہر خان ثانی

۔ جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ طاہر خان ناہڑ کے حصّہ میں سیت پور آیا تھا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سردار کے حالات معلوم نہیں ہو سکے ہیں اس قدر معلوم ہے کہ سیت پور کے مخادیم اس خاندان کے ملازم اَور ان کی طرف سے ناظم رہ چکے تھے۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو واپسی پر اس نے ناہڑوں سے حکومت لے کر سیت پور کے سادات اَور مخادیم کے حوالے کر دی تھی جو اس وقت ناہڑوں کی طرف سے وہاں کے عمّال اَور ناظم تھے۔

غرضیکہ جب یہاں پر انگریزی حکومت قائم ہوئی تو طاہر خان ثانی کی اولاد سے "بخش خان" ایک قابلِ قدر زمیندار اَور مُعزز آدمی موجود تھا اَور گورنمنٹ انگریزی نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جو اس کے بعد اس کے بیٹے ولی محمد کو ملتا رہا، ولی محمد کے اس وقت دو بیٹے ایک کا نام حضور بخش اور دوسرے کا نام رسول بخش ہے اَور وہ قصبہ سیت پور سے باہر ایک چاہ پر رہتے ہیں مگر اُن کی حالت اور گزران زیادہ اچھی نہیں بتائی جاتی ہے۔ اس خاندان کے باقی لوگ ترک سکونت کر کے فتح پور میں جا کر آباد ہوئے ہیں جو پرمٹ سے جتوئی جانے والی سڑک پر بیان کیا گیا ہے وہ کاشتکاری کر کے گزر بسر کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

سلطان خان اَور ابراہیم خان

۔ کن کے حاکم قاسم خان ناہڑ کا لڑکا سلطان خان باپ کا جانشین ہوا یہ ہڑند پر بھی حکومت کرتا تھا۔ دریشک بلوچ قبیلہ اِس ناہڑ سردار کے دور میں پہاڑ سے باہر آیا تھا، اور سلطان خان ناہڑ کی اجازت سے اِس علاقہ میں آکر آباد ہوا۔ چنانچہ سلطان خان کے بعد اس کا بھائی ابراہیم خان ہڑند اور کن کا حکمران ہوا اور ایک عرصہ تک حکومت کی، اس اثنا میں مزاری بلوچ قبیلہ جو ان

[1] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ۔ ص ۔

کے والد قاسم خان کے وقت سے روجھان میں آباد ہو چکا تھا، اَور کافی طاقت پکڑ چکا تھا۔ بالآخر وہ اس پر غالب آ گیا چنانچہ ابراہیم خان اور سلطان خان ناہڑ کی اولاد یہاں سے کوچ کر کے کشمور علاقہ سندھ کو چلی گئی اَور وہاں جا کر آباد ہوئی۔

اِسلام خان ثالث

۔ اِسلام خان چہارم کے دو لڑکے عیسن خان دوم اَور اسمٰعیل خان تھے اِسمٰعیل خان لاولد فوت ہوا اَور عیسن خان کا لڑکا اِسلام خان تھا، جو اِسلام خان پنجم کے نام سے مشہور ہے اس ناہڑ سردار کے متعلق بھاگسر کے بیانات محکمہ مال میں ہے کہ وہ محمود خان گوجر حاکم ڈیرہ غازیخان کا ہمعصر تھا اَور ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۸ء) میں محمود خان گوجر اور اسلام خان کے مابین ایک معاہدہ قرار پایا جس کے مطابق بھاگسر کا علاقہ ادھلائی (نصف بٹائی) پر اِسلام خان کے پاس رہنے دیا گیا۔ یعنی اِسلام خان ناہڑ سردار بھاگسر کا نصف محصول محمود خان گوجر کو ادا کیا کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگسر کے ناہڑ خاندان کی حیثیت اب ایک جاگیردار کی رہ گئی تھی اَور اب اصل حکومت ڈیرہ غازیخان کے حکمران محمود خان گوجر کی تھی اَور اصولی طور پر اُسے حکمران تسلیم کر لیا گیا تھا۔

گل بہار کا بیان ہے جب محمود خان گوجر ڈیرہ غازیخان کا نواب تھا، تو کوٹ مٹھن، ہڑند اور سیت پور کے ناہڑ سردار ایک اِجارہ دار کی حیثیت سے تھے اَور انہوں نے محمود خان سے یہ علاقے اجارہ پر لے رکھے تھے۔[1]

غرضیکہ اِسلام خان پنجم کے بعد اس کی اولاد وارث ہوئی اور اس کے تین لڑکے تھے غلام محمد خان، فتح محمد خان اور حیات محمد خان غالباً اِنھیں کے دور میں ان سے جاگیر لے کر تیمور شاہ درّانی نے قاضی نور محمد کو اجارہ پر دے دی تھی۔

غلام محمد خان کا ایک لڑکا رانجھا خان تھا اَور وہ انگریزی دورِ حکومت میں اپنے قبیلے میں ایک معزز شخص مانا جاتا تھا اِسے نمبرداری، ذیلداری اور ڈویژنل درباری کے اعزاز حاصل تھے اَور کرسی نشینان کی فہرست میں اِس کا نام درج تھا۔

رانجھے خان کے دو لڑکے اِسلام خان اور اِسمٰعیل خان ہوئے۔ اسلام خان کا لڑکا احمد خان

[1] گل بہار ص ۱۶۷

نمبردار اور ذیلدار تھا اور وہ لاولد فوت ہوا۔ اس کی جائیداد محمد خان اور محمود خان پسران اسمٰعیل خان کو ملی۔ محمد خان لاولد فوت ہوا جبکہ محمود خان کے چھ پسر تھے۔ یہ جملہ برادران ہنوز زندہ ہیں۔ ان میں بڑا لڑکا صادق محمد خان ہے جو اپنی قوم و قبیلہ کا سربراہ اور نمبردار ہے۔

عام حالات ۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب میں ڈیمز صاحب کے حوالے سے کہا گیا ہے۔ "اب ہڑند اور بھاگسر میں ناہڑوں کے صرف چند خاندان باقی رہ گئے ہیں جو معمولی زمیندار ہیں اور بھاگسر میں ان کو تھوڑا بہت رسوخ بھی حاصل ہے۔"[1]

بیتورام کا بیان ہے کہ "جب تک قوم لودھی کی بادشاہی رہی ناہڑ کچھ خراج نہ دیتے تھے" پھر لکھا ہے "لودھی کے خاندان کے بعد ہندوستان میں بادشاہی مغلیہ شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۵۲۶ء میں پہلے بابر شاہ، بادشاہ ہوا . . . . . اس بادشاہ کے عہد میں یہ علاقہ بدستور قوم ناہڑ کے تعلق بطور اجارہ منجانب بادشاہ دہلی کے رہا"[2]

الغرض بھاگسر کے اس خاندان کا وڈیرہ صادق محمد خان ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور اس قبیلے کا دوسرا سربراہ غلام اکبر خان تھا جو ہڑند میں رہتا تھا۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ وہ فوت ہو گیا۔ اس کا لڑکا جہانگیر خان ابھی کم عمر ہے اور وہ تعلیم و تربیت حاصل کر رہا ہے۔

غلام اکبر خان ایک شریف النفس، ملنسار، مہمان نواز اور مخلص آدمی تھا۔

اس بات میں کچھ شک نہیں ہے کہ ناہڑ قوم کے دو مختلف خاندان تھے اور ہر ایک نے اپنے دور میں مختلف علاقے پر حکومت کی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ہڑند کے ناہڑ خاندان نے ایک طویل عرصے تک حکومت کرنے کے باوجود اپنے کوئی تاریخی آثار باقی نہیں چھوڑے جبکہ سیت پور کے ناہڑوں کی حکومت کے نشان ابتک موجود ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر ان ہی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

سیت پور ۔ سیت پور کا قصبہ اگرچہ اس وقت ضلع مظفرگڑھ تحصیل علی پور میں واقع ہے۔ جو علی پور سے بارہ میل مغرب میں دریائے سندھ سے بجانب شرق دس میل کے فاصلہ پر ہے ابتدا میں یہ قصبہ ڈیرہ غازیخان کی سرزمین پر آباد تھا۔

[1] ۔ تذکرہ روسائے پنجاب ج ۲ ص ۵۲۶ [2] ۔ گل بہار ص ۶،۵

دریائے سندھ کے ۱۹۳۲ء میں رخ بدلنے پر اس کے مشرقی کنارہ پر چلا گیا۔ اس وقت دریائے سندھ اور اس کے معاونین کا سنگم اوچ کے پاس تھا، جبکہ ان دریاؤں کے رخ بدلنے پر یہ سنگم کوٹ مٹھن کے پاس ہو گیا۔

سیت پور کا قصبہ اپنی تواریخی روایات اور آثار کے لحاظ سے نہایت قدیم ہے۔ لفظ سیت پور دو لفظوں سیت + پور سے مرکب ہے۔ جس سے مراد سیتا رانی کا آباد کردہ قصبہ ہے۔ سیت پور کے لوگوں کا بیان بھی اسی قسم کا ہے۔ قصبہ کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی بار اجڑا اور اپنی قدیم بنیادوں پر دوبارہ آباد ہوتا رہا۔ چنانچہ قدیم عمارات کے آثار قصبہ کی موجودہ عمارتوں کی بنیادوں سے ظاہر ہیں۔

سیت پور کا بازار بھی تنگ و تاریک اور مسقف ہے جہاں پر دن کو چراغ جلتے ہیں۔

سیت پور کا قصبہ کھجور کے جھنڈوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا مغربی اور جنوبی حصہ قبرستانوں اور مڑھیوں پر مشتمل ہے۔ اس حصہ زمین پر ناہڑ سرداروں کے بوسیدہ اور قدیم مقابر بھی ہیں۔

اس قصبہ میں مولوی محمد بخش صاحب عباسی میرے شکریہ کے مستحق ہیں جن کا میں مہمان رہا وہ عالم بے بدل اور فاضل بے مثل ہیں، عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ علمی کتب کا ایک بیش بہا خزانہ ان کے پاس ہے۔ جس میں قلمی اور قیمتی نسخے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی یہ کتابیں مختلف علوم اور فنون پر لکھی ہوئی ہیں جن میں علم منقول و معقول اور دیگر علوم شامل ہیں۔

علی پور ۔ یہ قصبہ علی پور گھلواں کے نام سے مشہور ہے۔ ضلع مظفرگڑھ کی انتہائی جنوبی تحصیل ہے۔ پر رونق قصبہ ہے۔ آم وغیرہ کے باغات سے ڈھکا ہوا ضلع کا سب سے ٹھنڈا ہے۔ اس قصبہ کو علی محمد خان ایک ناہڑ سردار نے آباد کیا تھا۔

بھاگسر ۔ بھاگسر، بھاگ + سر کا مرکب ہے جس کے لفظی معنی بھاگ (بخت) والے سر والے کے ہیں۔ یعنی بختاور یا سعادتمند، چونکہ یہ قصبہ اسلام خان سوم نے آباد کیا تھا اور وہ ایک بھاگوان (سعادتمند) رئیس تھا۔ اس لئے اس قصبے کا نام بھاگ + سر (بھاگسر) ہو گیا۔ اسلام خان نے سیت پور اور کن کی حکومت کو ختم کر کے

ان کے درمیان اس قصبے کو آباد کیا اور اِسے ناہڑ ریاست کا صدر مقام بنا دیا تھا۔ یہ قصبہ عمر کوٹ ضلع راجن پور سے تین میل کے فاصلہ پر جنوب کو آباد ہے۔

کوٹ طاہر - یہ قصبہ، جام پور شہر سے انڈس ہائی وے پر آٹھ میل شمال میں سڑک سے تین میل ہٹ کر مشرق کو آباد ہے۔ کوٹ کے آثار اور آبادی موجود ہے۔ اس وقت یہاں کی زیادہ تر آبادی مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کی ہے جنہیں عرف عام میں پناہ گزیں کہتے ہیں۔ یہ کوٹ سخی طاہر خان ناہڑ سردار نے قائم کیا تھا اور یہ میرانی اور ناہڑ حکومتوں کے درمیان حد فاصل تھا۔ میری ملاقات غالباً سید غلام عباس سے ہوئی جو ایک نوجوان اور با اخلاق شخص ہے۔ درزی کا کام کرتا ہے اور سیادات کی روایات کو بحال رکھے ہوئے ہے۔ اور مہمان نواز ہے۔

مقبرہ سلطان محمد خان یہ مقبرہ، مقبرہ سخی طاہر خاں کے نام سے بھی مشہور ہے جس میں وہ اپنے باپ سلطان محمد خان کے ساتھ دفن ہے۔ یہ مقبرہ سخی طاہر نے اپنے باپ کیلئے بنوایا تھا۔ مقبرہ خوبصورت اور مضبوط بنا ہوا ہے۔ اِس پر ملتانی رنگین ٹائل لگائی گئی ہیں۔ اوچ شریف میں واقع مقبرہ مائی جوندی" کے بعد اِس صنف کے مقابر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اِبتدا میں اِس مقبرہ کی دیکھ بھال اور مجاوری میاں حکیم کریمداد اور اس کے خاندان میں چلی آئی تھی۔ اب یہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے۔

مقبرہ پر مولا بخش ولد واحد بخش محکمہ کی طرف سے چوکیدار مقرر ہے۔ دو سو بیس ۲۲۰ روپے ماہانہ تنخواہ پاتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے سال میں دو بار اُسے وردی ملتی ہے۔ چوکیدار نہایت خوش اخلاق اور خدمت گار ہے۔ مخدوم سیت پور کا نجی کاروبار بھی کرتا ہے غالباً اِس غریب کی نوکری مخدوم صاحب کے رحم وکرم پر ہے۔

اِس مقبرہ میں ایک پلیٹ پر یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی گئی۔

اِشتہار (یادگار محفوظ)

"بموجب ایکٹ ۷ سنہ ۱۹۰۴ء حفاظت آثار قدیمہ، جو شخص اِس یادگار کو نقصان پہنچائے

مقبرہ سلطان محمد خاں ناہڑ، واقع سیت پور

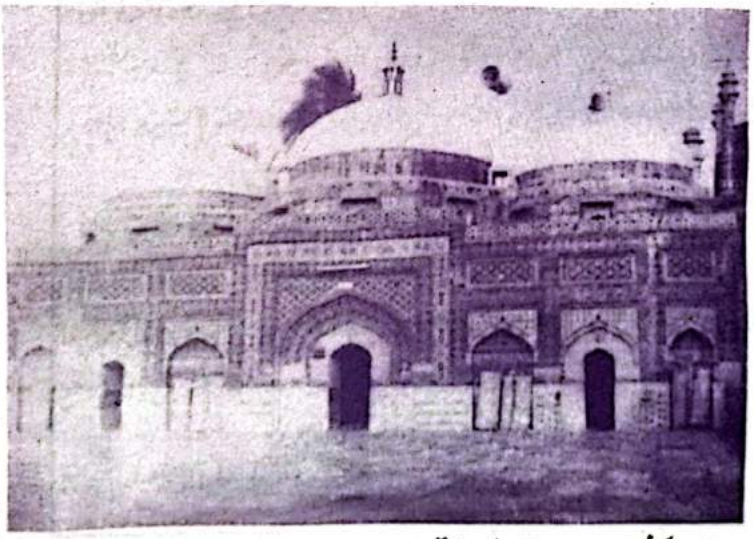

مسجد سخی طاہر خاں ناہڑ واقع سیت پور۔

یا وضع قطع لگاڈے، وہ مستوجب قید کا ہوگا جو تین ماہ تک ہو سکتی ہے۔ یا جرمانہ ہوگا۔ جو پانچ ہزار روپے تک ہو سکتا ہے۔ یا دونوں سزائیں دیجاوینگی۔
"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ"

مسجد سخی طاہر خان۔ مقبرہ سلطان محمد خان کے پاس ہی ایک نفیس اور دیدہ زیب مسجد بنی ہوئی ہے جس پر یقیناً کسی شاہی مسجد کا دھوکا ہوتا ہے۔ مسجد مغربی طرف سے چھوڑ کر باقی تین اطراف میں قبرستان میں گھری ہوئی ہے۔ اب سے پہلے یہ مسجد ویران چلی آرہی تھی۔ مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں نے اِسے آباد کیا ہے۔ قبریں تقریباً دفن کر دی گئی ہیں۔ اِس کے صحن کو وسیع کر دیا گیا، مُرمت کی گئی، فرش پر چپس لگوایا گیا اور بجلی کے قمقموں سے اِس میں روشنی کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا ہے۔

مسجد میں واقع قدیم "چاہک" کو ٹیوب ویل میں بدل دیا گیا ہے۔ متعدد طہارت خانے غسل خانے بنائے گئے۔ اور سقایہ کا خاص اِنتظام کیا گیا۔ جس پر پختہ سائبان تعمیر کر دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ اِس کارِ خیر میں حصّہ لینے والوں کو جزائے خیر دے۔

مقبرہ بی بی بگی۔ ایک مقبرہ کا صرف نصف حصّہ کھڑا ہے جبکہ باقی نِصف گر چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے وہاں سے مٹی ہٹا لینے سے ایسا ہوا ہے۔ جو وہاں کے صاحبِ علم و شعور لوگوں کی بد ذوقی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ یہ مقبرہ بی بی بگی کے نام سے منسوب ہے۔ بی بی بگی کو بعض سخی طاہر کی بیوی اور بعض ہمشیرہ بیان کرتے ہیں۔

اِس مقبرہ کے پاس ہی چند قدم مشرق کو مٹی کا ایک ڈھیر پڑا ہے جس کے متعلق بتایا گیا کہ وہ محمود خان نامی ایک ناہڑ سردار کا مقبرہ تھا۔ مگر اب اس میں کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ اِس سے علاوہ سیت پور سے متصل مغرب میں چند مقابات ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ناہڑ سرداروں کے مقابر تھے جو زمانہ کی دست بُرد سے اب مِٹ چکے ہیں۔ اسی موقع کے جنوبی جانب ہندو لوگوں کی چند مڑھیاں بھی موجود کھڑی ہیں۔

مقبرہ حامد سلطان۔ قصبہ شاہ جمال (کینجھر) سے جنوب کو چار میل کے فاصلہ پر موضع

دانی" بتایا گیا ہے۔ جہاں پر حامد سلطان ناہڑ کا مقبرہ ہے۔ جو ایک "ولی" اور خدا رسیدہ بزرگ تھا وہاں پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔ لوگ مزار پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ اور وہاں پر آباد ناہڑ لوگ بتائے گئے ہیں۔

بھاگسرواہ - بھاگسرواہ "اسلام خان سوم (بھاگوان سردار) نے کھدوایا تھا۔ یہ ایک راجباہ تھا اور مواضعات بھاگسر، بنگالہ، سبزانی اور سوگلی وغیرہ کو سیراب کرتا تھا۔ الغرض ناہڑ لودھی خاندان کے دور کے ان تاریخی آثار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سردار کس قدر منتظم اور اعلیٰ اصلاحیتوں کے مالک تھے۔

شجرۂ نسب خاندان بلوچ میرانی

حاجی خان (اوّل)

غازیخان (اوّل)

حاجی خان (دوم) — علی گوہر خان (اس کی اولاد جھنگ میں جاکر آباد ہوئی)

غازیخان (دوم)

حاجی خان (سوم)

جہان خان ملقّب بہ غازیخان (سوم)

حاجی خان (چہارم)

چاکر خان ملقّب بہ غازیخان (چہارم)

کمال خان ملقّب بہ غازیخان (پنجم) — سلطان خان — عادو خان ملقّب بہ حاجی خان (پنجم)

مُبارک خان ملقّب بہ غازیخان (ششم)

میر عالم خان ملقّب بہ غازیخان (ہفتم)

صاحب خان ملقّب بہ غازیخان (ہشتم)

غازیخان (نہم) آخر

لاولد

ڈیرہ غازیخان کی میرانی حکومت

پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ حُسین خان لنگاہ کے دورِ حکومت ۸۶۹ھ ۱۴۶۴ء میں ملک سہراب خان دودائی بلوچ اپنی قوم وقبیلہ کے ساتھ کیچ ومکران سے اُٹھ کر یہاں چلا آیا تھا اور سلطان حسین خان کی فوج میں شامل ہوکر باربک شاہ کے خلاف لڑا اور اسے شکست دی تھی۔ جس سے خوش ہوکر حسین خان نے اُسے دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر سیت پور سے دھنکوٹ تک کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ اسی سہراب خان کے مصاحبین میں ایک بلوچ سردار حاجی خان میرانی بھی تھا اس کے حصہ میں ڈیرہ غازیخان کا خطّہ آیا۔ اِس میں اُس نے ایک خودمختیار حکومت قائم کرلی۔ جو ڈیرہ غازیخان کی میرانی حکومت کے نام سے مشہور ہوئی۔ چنانچہ اس کے متعلق تاریخ فرشتہ کا بیان یہ ہے " دریں ایام ملک سہراب دودائی کہ پدرِ اسمٰعیل خان وفتح خان باشد، با قومِ رو ہیلہ خود را از نواحی کیچ ومکران بخدمت شاہ حسین پیوستند۔ وشاہ حسین لنکاہ قدوم ملک سہراب بلوچ را بر خود مبارک دانستہ از کوت کرور تا قلعہ دہنکوت تمام ولایت باو داقوام او جاگیر داد۔ از شنیدن ایں خبر بلوچ بسیار از بلوچستان بخدمت شاہ حسین لنکاہ آمدند پس روز بروز جمعیّت او زیادہ می شد۔ وشاہ حسین لنکاہ بقیۂ ولایتی کہ بر کنارِ سند معمور وآباد انست، بہ بلوچستان دیگر تنخواہ نمود۔ ورفتہ رفتہ از سیت پور تا دہنکوت ولایت بہ بلوچاں تعلّق گرفت [1]"

سیرالمتاخرین میں اِس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ " حسین خان لنگاہ ۸۹۶ھ میں اپنے باپ کا جانشین ہُوا۔ سلطان لودھی نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو تاتار خان کے ہمراہ حاکم پنجاب بنا کر بھیجا، باربک شاہ اور تاتار خان نے حسین خان سے ملتان کے نزدیک اکر لڑائی کی حسین خان بھاگ نکلا، انہیں ایام میں اِسمٰعیل خان اپنے والد ملک سہراب خان دودائی اور فتح خان اپنی قوم وقبیلہ کو لے کر کیچ مکران سے حسین خان کی خدمت میں پہنچے سلطان نے انہیں کرور کوٹ سے دھنکوٹ تک کا تمام علاقہ جاگیر میں دے دیا

[1] تاریخ فرشتہ ص ۷۴۲، ریاست بہاولپور گزیٹیئر ص ۱۴۱۔

یہ واقعہ سن کر بلوچ گروہ در گروہ کیچ مکران سے آنے شروع ہوئے۔ حسین خان نے سندھ کی باقی ولایت بلوچوں کے سپرد کردی آہستہ آہستہ اسپ پور سے دھنکوٹ تک کا علاقہ بلوچوں کے قبضہ میں آگیا۔ [1]

میرانی ۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دودائی اور میرانی بلوچ، سندھ کے سومرہ قبیلہ کی ایک شاخ ہیں۔ سومرہ کے متعلق مختلف مورّخین کی مختلف آراء ہیں۔ جن میں سے بعض انہیں عرب، بعض راجپوت اور بعض بیامرہ عرب و سندھ کی مخلوط نسل تصوّر کرتے ہیں۔

سید سلیمانؒ صاحب اور ظفر احمد ندوی لفظ سومرہ کو " سوم رائے " کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں۔ جو مُعرّب " ہوکر سومرہ بن گیا اور اس بات پر متفق ہیں کہ سومرہ قبیلہ عرب وسندھ کی مخلوط النسل سے ہے۔

مسٹر ڈیمز لفظ سومرہ کے ساتھ " ساتھا " کا اضافہ کر کے ساتھا سومرہ لکھتے ہیں اگر اس بیان کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اِس قبیلے کا تعلّق " ستھین " قبائل سے ماننا پڑے گا۔ لیکن ڈیمز صاحب کے خیال میں سومرہ قبیلہ راجپوت نسل سے ہے۔

تحفتہ الکرام کا مُصنّف سومرہ قبیلہ کو عراق کے شہر سامرہ کی نسبت سے ایک عرب خاندان بیان کرتا ہے جو وہاں سے کسی وقت نقل مکانی کر کے اس طرف چلا آیا تھا۔ مگر فرشتہ نے سندھ کے قدیم علاقہ ملیبار (مالابار) کے حالات میں " سامری " نام ایک حکمران قبیلے کا ذکر کر کے لکھا ہے " وتتیکہ تاریخ ہجری از دویست سال متجاوز گشت۔ جمعے از اہل اِسلام چہ عرب وچہ عجم در لباسِ فقر و درویشی از بنادرِ عرب بر کشتی سوار شدہ بہ قصد زیارت قدم گاہ حضرت بابا آدم علیہ السلام بجانب سراندیپ کہ آں را لنکا نیز گویند متوجہ شدند وبحسب اِتفاق کشتی ایشاں باد مخالف خوردہ بہ ملیبار افتادہ در شہر کدنکلور فرود آمدند۔ حاکم آنجا کہ موسوم بہ سامری بود، وبعقل کامل واخلاق ستودہ اتصاف داشت۔ بہ صحبت طائفہ درویشاں مشرّف شدہ از ہر باب سخن درمیان آورد۔ تا آنکہ از ملّت ومذہب ایشاں پرسید۔ گفتند، بحلیۂ اِسلام آراستہ ایم۔ وپیغمبر ما محمدؐ رسول اللہ است ... وچوں معجزہ شق القمر شنید،

[1] سیرالمتاخرین اردو ترجمہ ص۔

گفت اے قوم! ایں معجزہ بسیار قوی است . . . . پس بر سامری حقیقت دینِ محمدیؐ ظاہر شدہ کلمۂ طیبہ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ علیہ و آلہ وسلم بر زبان آورد[1]

یعنی بائیس ہجری کے بعد کی بات ہے کہ اہلِ اسلام کی ایک جماعت جس میں عربی اور عجمی دونوں قسم کے لوگ تھے۔ درویشوں کے لباس میں عرب ملکوں کی بندرگاہوں سے کشتی میں سوار ہوکر حضرت آدمؑ کے قدم کی زیارت پر لنکا کی طرف جا رہے تھے کہ اتفاق سے ان کی کشتی مخالف ہوا کے زور سے ملیبار کے ساحل کد نکلور کی بندرگاہ پر آکر رُکی۔ وہاں کا حاکم سامری نام ایک شخص تھا اور وہ عقل میں پختہ اور اچھے اخلاق کا مالک تھا۔ ان درویشوں کی صحبت میں آکر بیٹھا۔ اور ان سے حال پوچھنے لگا اور ان کا مذہب و ملت دریافت کیا۔ ان درویشوں نے جواب دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور مذہبِ اسلام رکھتے ہیں اور ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں اور پھر سامری کو معجزہ شق القمر کا حال سنایا۔ یہ سن کر وہ اپنی قوم کے سرداروں سے کہنے لگا یہ معجزہ بہت عظیم ہے۔ بالآخر سامری پر دینِ اسلام کی حقیقت اور سچائی واضح ہوگئی اور وہ کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

پس اِن سب روایات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھ کا سومرہ قبیلہ یہاں کا قدیم باشندہ تھا اور اس لفظ "سامری سے سامرہ میں تبدیل ہوگیا، جو بعد میں سومرہ مشہور ہوگیا سومرہ قبیلہ سندھ کے عرب ہباری خاندان کے بعد برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس قبیلہ کے کم و بیش چوبیس[22] حکمران ہوئے اور ۳۷۵ھ سے ۷۵۲ھ تک حکومت کی۔ اس خاندان کا پہلا حکمران سومرہ اوّل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا بیٹا دودا اوّل تھا، جہاں سے دودائی خاندان وجود میں آیا سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں "ادنر" نامی سومرہ سندھ کا حاکم تھا۔ بعض مقامات پر "ادنر" نامی خاندان آباد ہیں، وہ اسی ادنر کی نسبت سے مشہور ہیں۔ تاہم حکمران خاندان دودائی مشہور چلا آیا۔ علاؤالدین خلجی نے جب ادنر سومرہ پر فوج کشی کی تو وہ بلوچستان اور مکران کو بھاگ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دودائی قبیلہ کے اکثر لوگ سندھ سے ترکِ سکونت کرکے بلوچستان کو چلے گئے تھے، اور وہاں پر جاکر آباد ہوئے۔

ایک اور روایت سے دودائی بلوچ قبیلہ کی اصلیت اِس طرح معلوم ہوتی ہے۔

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ مقالہ یازدہم ص ۳۶۸

جیسا کہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ میر بجار کہ مندو را مقتول نمودہ، و قلات را در تصرف خود آوردہ، پس صحرا نشینی را اختیار نمود۔ تا در صحرا نشینی وفات کرد۔ و قلات بے حاکم شد۔ و مغل آمدہ قلات را گرفت۔ بعد مرورِ ایام ہمراہ دہواران قلات قسم و اقسام کرد۔ چنانچہ از ضربِ شمشیر و تفنگ و نیزہ و کارد، و زہر و سنگ و کلوخ و چوب و کفش بہ ہمدگر با ایں اسلحہ تمام نہ زنند۔ تا حرفِ دوستی مابین ما و شما باشد۔ از انجا کہ شعار مغل ظلم بود، دستِ تظلم را دراز نمود دہوارانِ قلات بہم مشورت نمودند، بہا سلحہ و زہر و غیرہ کہ اقسام نمودہ ایم، اگر مغل را ہلاک سازیم ماخذ نزدِ حق تعالیٰ خواہیم شد۔

پس اتفاق دریں قرار گرفت، کہ نان ہائے از دن سیطر سخت پختہ چند روز ہمان نان را بہ گرمئ آفتاب خشک نمودہ، یگاں نان پنہاں طور در بغل خود گرفتہ، آمدہ مغل کہ یعنی، حاکمِ وقت بود حاضر شدند۔ یکبارگی جملہ حملہ آوردہ نان ہا از بغل خود ہر یک شاں کشیدہ، زدہ، زدہ مغل را ہلاک ساختند۔ چنانچہ الحال ہماں دہواراں را ڈوڈکی میگویند[1]

یعنی میر بجار میردانی بلوچ نے جب مندو خان رند بلوچ، پر حملہ کیا اور اسے قتل کرکے قلات کی حکومت خود سنبھال لی۔ مگر وہ قلات شہر کی بجائے صحرا میں رہنے لگا۔ اور وہیں پر وفات پائی اِس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاکر مغلوں نے قلات پر قبضہ کرلیا۔ اور قلات کے گرد و نواح میں رہنے والے بلوچوں سے صلح و صفائی کرلی۔ اور فریقین نے اس بات پر حلف اٹھایا کہ آئندہ کوئی فریق دوسرے پر کسی قسم کے ہتھیار سے حملہ نہیں کرے گا۔ اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد مغلوں نے بلوچوں پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیئے۔ اس وقت قلات کے نواح کے بلوچوں نے ایک ترکیب سوچی اور کہا ہم مغلوں پر کسی قسم کے ہتھیار سے حملہ نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا گندم کی موٹی روٹیاں پکاکر انہیں دھوپ میں خوب سُکھا لیا جائے انہوں نے ایسا ہی کیا، چنانچہ جب وہ روٹیاں سُوکھ کر خشک، کر سخت ہوگئیں تو بلوچوں نے انہیں اپنے بغل میں چھپایا اور مغلوں پر حملہ آور ہوئے اور انھیں یہ سوکھی روٹیاں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا، چنانچہ اس روز سے وہ "ڈوڈکی" مشہور ہوگئے۔

اِس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہی لفظ ڈوڈکی بعد میں "دودائی" بن گیا اور وہ بلوچ

[1] تاریخ بلوچستان ص ۱۷۹۔

CS CamScanner

قبائل جنہوں نے اِس منصوبہ میں حِصّہ لیا تھا دودائی مشہور ہوئے اِس کے بعد قلات کے اِن بلوچوں نے بروہیوں کو اپنا سردار بنالیا۔ اور بروہیوں کا ایک بزرگ محمد ابراہیم خان قلات کا پہلا حکمران ہُوا۔ دودائی بلوچوں کے بارے میں یہ شعر نقل ہُوا ہے۔

نوح دودائی اوارین ای مہرلشادیک بریں
رِند لاشاری مہ ملکا سیم جوان نیمنیں [۱]

(نوحانی اور دودائی، لاشاری کے ساتھ شامل ہوتے ہیں رند اور لاشاری کا ملک ایک دوسرے سے متصل ہے)

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ دودائی قبیلہ، لاشار قبیلوں میں سے ایک ہے گلاسری آف دی پنجاب ٹرائبز میں کہا گیا ہے کہ دودائی ایک مشہور بلوچ قبیلہ تھا لیکن آجکل یہ اس نام سے مشہور نہیں ہے اس خاندان کے لوگ ڈیرہ جات اور جھنگ کے میرانی ہیں [۲]

اور میرانی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے "کہ دودا کا بیٹا زیرین سندھ کے علاقہ ٹھٹھہ کے رانی، راجہ کے دربار میں "میر" یا "ناظم" کے منصب پر مامور تھا" اور اس نسبت سے میرانی (میر + رانی) مشہور ہوگیا۔ اور اس کی اولاد میرانی کہلائی۔

حاجی خان اوّل ۔ حاجی خان میرانی، میر سہراب خان دودائی کے ہمراہ آیا تھا اور اسے دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر جاگیر ملی۔ اس نے ۱۴۷۳ء میں ڈیرہ حاجی خان نام کی ایک آبادی قائم کی اسی آبادی کے پاس اس کے بیٹے غازی خان نے بھی ڈیرہ غازیخان کے نام پر ایک آبادی بنائی یہ دونوں آبادیاں مِل کر بعد میں شہر ڈیرہ غازیخان مشہور ہوگیا [۳]

اِبتدا میں مملکت ڈیرہ غازیخان کی حدود یہ تھیں شمال میں قصبہ کالا، جنوب میں جام پور، مشرق میں دریائے سندھ اور مغرب میں کوہ سلیمان اور دامان کا علاقہ [۴]

اس وقت سیت پور میں ناہڑ لودھی اور داجل و ہڑند میں ناہڑ لوٹی حکمران اور اجارہ دار تھے کالا کے شمال میں گویا کہ سنگھڑ کا علاقہ ملتان کے ماتحت تھا۔ اور کوٹ کروڑ کے صوبہ میں شامل تھا جبکہ اپر ڈیرہ جات پر اِسمٰعیل خان ہوت بلوچ قابض تھا۔ اگرچہ یہ بات مشہور ہے کہ ملک سہراب خان دودائی بلوچ کو جب دریائے سندھ کے مغرب میں جاگیر ملی تو اُس نے

[۱] تاریخ بلوچستان ص ۹۔ [۲] کتاب مذکور ج ۲ ص ۴۴۴ [۳] تاریخ بلوچاں ص ۸۵ [۴] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۲۴۶۔

اپنے بیٹے اِسمٰعیل خان کے نام پر ڈیرہ اِسمٰعیل خان شہر کی بنیاد رکھی۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے بلکہ شہر ڈیرہ اِسمٰعیل خان کی بنیاد خود اسمٰعیل خان نے رکھی تھی۔ چنانچہ رائے بہادر چونجت لعل اپنی تصنیف تواریخ ڈیرہ اِسمٰعیل میں لکھتے ہیں "یہ شہر (ڈیرہ اِسمٰعیل خان) دریائے سندھ کے غربی کنارہ پر بفاصلہ یک نیم (ڈیڑھ کوس) از دریا آباد ہے اور صدر اسٹیشن ضلع و کمشنری ہے۔ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ دہلی میں اِسمٰعیل خان ہوت نے ۲۲ ماگھ سمت ۱۶۱۹ (۱۵۶۲ء) میں اپنے نام پر بنیاد شہر قائم کی اور باغات لگوا کر شہر کو خوب رونق دی"۔ اور یہ اسمٰعیل خان ثانی ہو سکتے ہے جب ملک سہراب کو دامان کی حکومت حاصل ہوئی۔ تو اس نے موضع "ببر" میں اپنا صدر مقام حکومت مقرر کیا۔ مگر قوم میرانی کے ساتھ حدود ریاست کی نسبت تکرار ہو کر اس قدر طوالت کو پہنچا کہ اِسمٰعیل خان ہوت تک برابر ہر دو قوم میں جنگ ہوتی رہی۔ کہتے ہیں کہ ۲۳ دفعہ دونوں حکمرانوں میں جنگ ہوئی۔ آخر اِسمٰعیل خان کے وقت میں گامن سیجار کی مداخلت سے رفع تکرار ہو کر دونوں ریاستوں کی حدود جھنگی مقرر ہو گئیں"۔

اِسمٰعیل خان سے پہلے "ببر" حکومت گاہ ریاست ہوت ہوتا تھا۔ لیکن اس نے ڈیرہ اِسمٰعیل خان اپنے نام سے آباد کر کے اس میں صدر مقام حکومت قائم کیا" اور اِسمٰعیل خان کا شجرۂ نسب کچھ اِس طرح لکھا ہے۔ اِسمٰعیل خان بن سلطان احمد خان بن ملک سہراب خان [۱]

نور احمد خان فریدی کی روایت بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ لکھتے ہیں" اسی طرح ملک سہراب اور جام اِسمٰعیل کو بھی اپنے علاقوں پر قبضہ کرنے میں خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ چونکہ ملک سہراب کو سلطان (حسین خان لنگاہ) نے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس لئے وہ مستقل طور پر ملتان میں رہتا تھا۔ جاگیر میں اس کا بیٹا بابر بن سہراب حکومت کرتا تھا۔ اِبتداً ملک بابر بن سہراب نے اپنے نام پر "کوٹ بابر" کی بنیاد رکھی اور لسکانی، کلاچی، کورائی اور دوسرے بلوچ سرداروں کے علاوہ جام اِسمٰعیل خان نے بھی اِسی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ اور جب اس کی اپنی جاگیر لٹیروں اور قبائلی حملہ آوروں سے خالی ہو گئی۔ تو اِس (اِسمٰعیل خان) نے کوٹ بابر سے بیس میل شمال کو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اپنے نام پر ڈیرہ اِسمٰعیل خان آباد کیا [۲]

اسی طرح حیات افغانی میں ڈیرہ اِسمٰعیل خان کے ذکر میں کہا گیا ہے۔ "مسمی اِسمٰعیل

[۱] تواریخ ڈیرہ اِسماعیل خان ص ۱۶۶، ۱۶۹۔ [۲] بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۲۲۸، ۲۲۹۔

خان ہوت جس کے نام سے ڈیرہ اسمٰعیل خان مشہور ہے۔ اپنی قوم کی سرکردگی میں ڈیرہ غازیخان کی طرف سے آکر مقام ببر جو بارہ کوس طرف جنوب شہر ڈیرہ (ڈیرہ اسمٰعیل خان) سے واقع ہے سکونت پذیر ہوا چند سال کے بعد جب اس کا اطمینان سے ملک پر دخل ہوگیا، تو بعد معائنہ و پسندی موقع اس نے اپنے ہاتھ سے بتاریخ ۲۲ ماگھ سمت ۱۶۱۹ بکرم میں جس کو تین سو دو سال ہوئے بہ شروع عہد سلطنت اکبر بادشاہ شہر کہنہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی بنیاد رکھ کر اپنے نام پر مشہور کیا۔[1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک سہراب خان کے کم سے کم تین لڑکے تھے۔ بابر، سلطان احمد اور اسمٰعیل خان اور دوسری صورت میں اسمٰعیل خان ملک سہراب کا پوتا تھا۔

روزنامہ امروز ملتان ۲۵ مارچ ۱۹۸۲ء میں ملک کے ممتاز دانشور اور ماہر آثار قدیمہ مسٹر ولی اللہ خان کا ایک بیان بعنوان "فن تعمیر میں مسلمانوں کے کارنامے تاریخی ہیں اس کی حفاظت ضروری ہے" شائع ہوا تھا: انہوں نے اپنے بیان میں جہاں شاہ یوسف گردیز، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور مقبرہ بی بی جوندی اوچ شریف کا ذکر کیا وہاں پر انہوں نے لعل شاہ ماڑہ نامی مقابر کی مثال بھی دی۔ افسوس ہے کہ مسٹر ولی اللہ خان نے لعل ماڑہ کے مقابر کا تعین نہیں کیا۔

ماڑہ نام کی ایک بستی پروا سے ڈیڑھ میل جنوب میں برلب شاہراہ واقع ہے۔ جبکہ قصبہ "ببر" جس کی بنیاد بابر بن سہراب دودائی بلوچ نے رکھی تھی۔ پروا سے تین میل کے فاصلہ پر مشرق میں واقع ہے۔

بستی ماڑہ سے تقریباً تین میل مغرب میں جھوک ماڑہ ہے جہاں پر ایک بزرگ لعل ماڑہ کی خام قبر ہے۔ جو مٹی کی کچی چار دیواری میں واقع ہے۔ لعل ماڑہ کے مجاور اس وقت مہوئے قوم کے لوگ ہیں جو چند پشتوں سے وہاں پر مقیم چلے آتے ہیں۔ اسی جھوک لعل ماڑہ سے عین شمال میں چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک قدیم قبرستان ہے اس قبرستان میں اس وقت بوسیدہ حالت میں چار مقبرے کھڑے ہیں جبکہ چھ کے قریب دوسرے مقبروں کے نشانات وہاں پر موجود ہیں یہ مقبرے یقیناً فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ میرے ایک ہمسایہ غلام حیدر کا بیان ہے کہ اس نے چالیس سال قبل اس مقام پر چھ مقبرے اصل حالت میں دیکھے تھے۔ بہرحال میں نے

[1] کتاب مذکور ص۔ ۸

موجودہ چار مقابر میں سے ایک کا فوٹو لیا ہے۔ جو ناظرین کی دلچسپی اور معلومات میں یقیناً اضافہ کا باعث ہوگا۔

یہ مقابر ایک چٹیل میدان میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہیں اور دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مقابر یقیناً اسمٰعیل خان اور اس کے جانشینوں کے ہیں۔ کوٹ بہر اور ڈیرہ اسمٰعیل خان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ ایسی مثالیں بلوچ سرداروں کے مقابر کی عام ہیں۔ چنانچہ غازیخان کا مقبرہ اس کے شہر ڈیرہ غازیخان سے دس میل دور مغرب میں بنایا گیا تھا۔ جو اب جدید شہر میں واقع ہے۔ اسی طرح فن تعمیر میں بھی بلوچ مقابر میں ایک خاص مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان مقابر پر گنبد، قبہ نما ہوتا ہے اور عمارت مثمن شکل کی ہوتی ہے۔ ملتانی ٹائل استعمال کی جاتی ہے عمارت کے گنبد کو بلوچ قبہ کہتے ہیں۔ ایسے ہی قبہ والے مقابر بلوچستان اور سندھ میں بکثرت پائے جاتے ہیں اس کتاب میں موجودہ بلوچی مقابر کے فوٹوؤں میں قدر مشترک کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ جناب ولی اللہ خان اور محکمہ آثار قدیمہ کے دیگر ذمہ دار اور با اختیار افراد نزدیک ڈیرہ غازیخان پر واقع مقابر کو اپنی تحویل میں لے کر انھیں زیست نو بخشیں گے اور اس تاریخی اور قومی ورثہ کی حفاظت کا اہتمام کریں گے۔

بہر حال یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسمٰعیل خان کے بھائی فتح خان نے بھی دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر اپنے نام سے ڈیرہ فتح خان آباد کر لیا تھا تاہم اس کی کسی حکومت کے قیام کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے جبکہ حاجی خان اوّل کے متعلق ہے[1] سہراب خان کے ساتھیوں میں سے حاجی خان نامی ایک شخص کے حصّہ میں ڈیرہ جات کا زیریں حصّہ ملک آیا اور اس نے یہاں پر شہر ڈیرہ غازیخان کی بنیاد رکھی پھر حاجی خان کے بیٹے غازیخان نے اس شہر کو بہت وسیع اور فراخ کر کے اس کو اپنے نام پر موسوم کیا۔

شہر ڈیرہ غازیخان کو حاجی خان نے بنایا اس کے بعد اس کے بیٹے غازیخان کے تخت نشین ہونے پر ڈیرہ غازیخان کہلایا[2]۔ یہ شہر ڈیرہ غازیخان) عہد ہمایوں بادشاہ میں غازیخان بلوچ میرانی نے آباد کر کے اپنے اسم پر نامزد کیا[3]۔ حاجی خان نے جو غازیخان کا والد تھا، حاجی غازی کی بستی بنائی جو بعدہٗ ڈیرہ غازیخان کا عظیم الشان شہر بنا[4]۔ اور یہی بات محکمہ مال کے ریکارڈ سے ظاہر ہے۔ یعنی ۱۸۷۲ء میں جب بندوبست قانونی عمل میں آئی تو اس وقت معلوم ہوا کہ ڈیرہ غازیخان شہر کے نام نہ تو کوئی ملکیت ہے اور نہ ہی اس نام کا کوئی موضع ہے یعنی شہر ڈیرہ غازیخان جس موضع میں آباد ہے۔ اس کا نام

[1] تاریخ بلوچستان ص ۸۵۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان ص ۲۲۔ [2] حیات افغانی ص ۱۰۔ [3] حیات سلیمان ص ۴۷

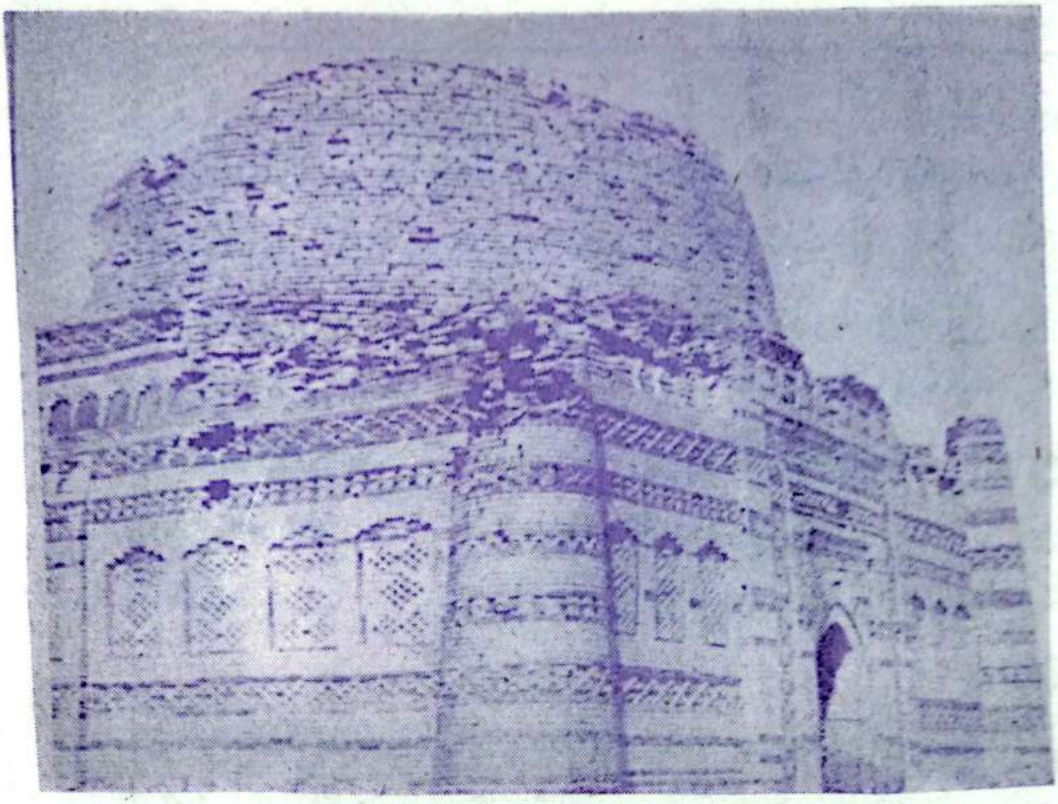

مقبرہ اسمٰعیل خاں بانی ڈیرہ اسمٰعیل خاں واقع جھوک ماھڑہ

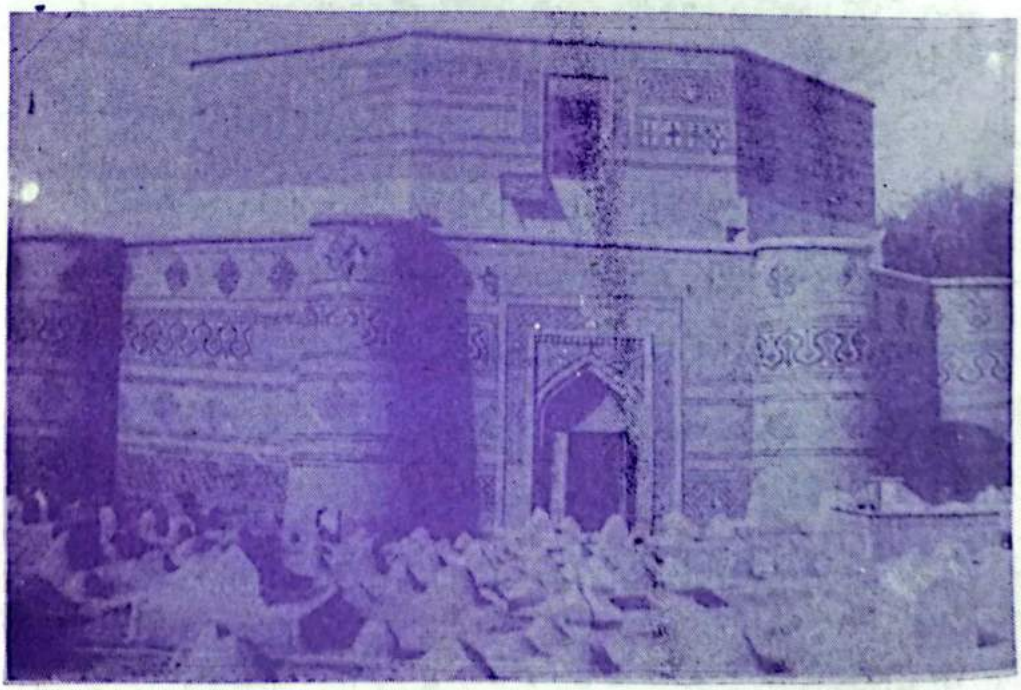

مقبرہ غازی خان

موضع حاجی غازی ہے۔

غرضیکہ حاجی خان میرانی نے ڈیرہ غازیخان کی حکومت قائم کی اس کی ترقی کے لئے جنگل شکاری کرائی اور زمینات کی سیرابی کیلئے چاہات کھدوائے گئے۔ اور بلا معاوضہ لوگوں کو زمینیں دے کر ملک کو آباد کیا گیا۔ حاجی خان نے بارہ برس کے قریب حکومت کی اور ۱۴۸۴ء میں وفات پائی مگر آپ کا مدفن معلوم نہ ہو سکا۔

غازیخان اوّل۔ عام روایت ہے کہ غازیخان، اسمٰعیل خان اور فتح خان ایک دوسرے کے بھائی تھے اور انہوں نے اپنے اپنے نام پر ڈیرہ غازیخان، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ فتح خان نام کے تین شہر آباد کئے لیکن یہ روایت صرف زبانوں تک محدود رہی ہے اور تاریخی کتب میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

میرانی سرداروں کے ناموں سے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مورخین غازی خان اور حاجی خان سے مراد ان کے اصل نام لیتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ ان کے شاہی لقب تھے جیسا کہ امیرانِ بہاولپور کے لقب بہاول خان اور صادق خان مشہور ہیں۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بیان کیا ہے کہ اسی طرح ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ہوت سردار اسمٰعیل خان اور غازیخان کے میرانی، غازیخان اور حاجی خان کہلاتے تھے[۱]

مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں ہے ۱۴۸۴ء میں حاجی خان میرانی بلوچ نے ڈیرہ غازیخان کی بنیاد رکھی اور ایک ریاست قائم کی یہاں کے حکمرانوں کے لقب حاجی خان اور غازی خان ہوتے تھے[۲]

اسی طرح میرانی حکمرانوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ لالہ حکم چند لکھتے ہیں "کوئی کہتا ہے ۲۲ پشت تک کوئی ۱۲ پشت تک کوئی پانچ پشت تک قیام ریاست خاندان غازیخان بیان کرتا ہے" پھر پالک صاحب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ۳۰ پشت تک ریاست اس خاندان میں رہی اور خود اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے "غلبہ رائے لوگوں کا سات پشت تک ہے"[۳]

لالہ ہتورام میرانی خاندان کی تاریخ غازیخان سے شروع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں نواب غازیخان میرانی بلوچ جو قوم دودائی میں تھا اکبر اعظم کے دورِ حکومت میں یہاں آیا اور شہر ڈیرہ غازیخان کو آباد کر کے اپنی حکومت قائم کی اس کا یہ بھی بیان ہے کہ غازیخان کی سات پشت میں ڈیرہ غازیخان

---

[۱] گزیٹیر مذکور ص ۳۰۔ [۲] مظفر گڑھ گزیٹیر ص ۳۰۔ [۳] تواریخ ڈیرہ غازی خان ص ۳۶۷

کی حکومت رہی جن میں چار غازیخان اَور تین حاجی خان ہوئے[۱] مگران جملہ تاریخی روایات، حالات اَور قرائن و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں چودہ حکمران ہوئے ہیں۔ جن میں پانچ حاجی خان اور باقی نو غازیخان کے لقب سے مشہور ہوئے ہیں اور اِسی ترتیب سے میں نے اِن کا ذکر کیا ہے۔ غازیخان اول نے سرزمین ڈیرہ غازیخان کا اقتدار سنبھالتے ہی اس کی توسیع و ترقی اَور انتظام کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے ہڑند کی ناہڑ لوئی سلطنت پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اِن دِنوں برصغیر میں غالباً بہلول لودھی کی حکومت تھی۔ ہڑند کا سردار دہلی میں جاکر فریادی ہُوا۔ لیکن غازیخان کا قبضہ بحال رکھا گیا، جبکہ دوسری طرف سیت پور کی ناہڑ لودھی حکومت تھی اور اس سے سرحد بندی کر دی گئی جس میں پہلی براہم شاہ فریقین میں حدِ فاصل قرار پائی[۲]

غازیخان اور اِسمٰعیل خان

مؤرخین کے بیانات کے مطابق غازیخان اور اسمٰعیل خان کے درمیان بائیس[۲۲] لڑائیاں لڑی گئیں اَور فریقین کا زبردست جانی اور مالی نقصان ہُوا۔ بالآخر غازیخان کے وزیر گاموں خان سیجار[۳] کی دانائی اَور صائب رائے سے دونوں میں صلح و صفائی ہوگئی اَور مورجھنگی حدِ فاصل قرار پائی[۴] ان مہمات سے فارغ ہو کر غازیخان نے اپنی لڑائیوں کا دائرہ مظفر گڑھ، لیہ، کوٹ سلطان کوٹ ادو اَور نوشہرہ تک بڑھا لیا اور اِن علاقوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں مِلا دیا[۵]

وفات

غازیخان اوّل کی وفات ۹۰۰ھ (۱۴۹۴ء) میں ہوئی۔ اَور اپنی ہی زندگی میں تعمیر کرائے گئے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اِسمٰعیل خان میں مسٹر فرائیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب وہ ڈیرہ غازیخان میں تھے تو انہوں نے غازیخان کے مقبرہ پر نصب ایک کتبہ دیکھا تھا جس پر غازیخان کی تاریخ وفات ۹۰۰ھ درج تھی اور یہی بیان لالہ حکم چند کا ہے[۶] یہ مقبرہ اس وقت شہر سے دور مغرب کی طرف دس میل کے فاصلہ پر آبادی چورٹہ کے پاس بنایا گیا تھا اس پر ایک قبہ تھا جو گر چکا ہے اب یہ مقبرہ موجودہ شہر ڈیرہ غازیخان میں

---

[۱] گل بہار ص ۹۰۔ [۲] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۰۔ [۳] گاموں سیجار کی قبر اوچ شریف میں سید جلال الدین سرخ بخاری کے مقبرہ سے باہر دروازہ پر دکھی ہے لوگ اس کی قبر کا سات بار طواف کرتے ہیں نذریں چڑھاتے اور مرادیں مانگتے ہیں۔ [۴] حیات افغانی ص ۱۱۰۔ [۵] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اسمٰعیل خان ص ۲۲۔ [۶] گزیٹیر و تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۲۶۷۔

ہے اَور خلائق کیلئے عبرت گاہ بنا ہُوا ہے۔

ایرانے کہ بر قصرش ہزاراں پاسباں بودے
کنوں بر قبۂ گورش کلاغاں پاسباں بینی

نور احمد خان فریدی کی غلطی

نور احمد خان فریدی لکھتے ہیں۔ میرانی حکمرانوں نے اپنے پھیلے ہوئے علاقوں پر براہِ راست حکومت کرنا مناسب تصور نہ کیا بلکہ اِن علاقوں میں نیم خود مختیار ناظم مقرر کئے۔ جو اپنے اپنے تمنات کے سربراہ تھے اور تمندار کہلاتے تھے۔"[۱]

آگے اس نے مزاری، دریشک، لغاری اَور تنگانی قبائل کے نام لکھے ہیں حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مزاری اَور دریشک قبائل نے ہڑند، داجل، روجھان، کِپن اَور بجاگسر وغیرہ کا علاقہ وہاں کے ناہڑ سرداروں سے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا اور لغاری سرداروں نے چوٹی اَور اس کے متعلقات میں آباد احمدانی دودائی بلوچوں سے لے کر لئے تھے۔ اَور یہ دور اکبراعظم کا تھا۔ اور اس وقت ڈیرہ غازیخان کا حاکم غازی خان ثالث تھا۔

احمدانی اکبراعظم کے پاس جاکر فریادی ہوئے اکبراعظم نے راجہ ٹوڈرمل کو حقیقتِ حال معلوم کرنے اَور تصفیہ کرنے کے لئے ڈیرہ غازیخان بھیجا۔ چنانچہ اس نے یہاں پہنچ کر فریقین کے بیانات لئے اَور وقت کے تقاضا کو بھانپ کر لغاری سرداروں کا قبضہ بحال رکھا۔ جس کے بعد غازی خان نے اکبراعظم سے اپنا حقِ ملکیت جتاتے ہوئے متنازعہ علاقہ اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ آپ کے معتمد لالہ ٹوڈرمل نے لغاری سردار کو مانکہ، وڈور، گدائی اور بکھر والہ وغیرہ کی معافیات اور محصول کی سند دے کر یہ علاقے اس کے حوالے کر دیئے ہیں جبکہ ہم ان سے پہلے کے خدمتگذار موجود ہیں۔ لیکن اکبراعظم نے لالہ ٹوڈرمل کا فیصلہ بدستور قائم رکھا۔[۲]

یہی صورتِ حال تنگانی سرداروں کی ہے اَور وہ بھی غازیخان ثالث کا دورِ حکومت تھا جبکہ تنگانی سرداروں نے سنگھڑ کے علاقہ پر قبضہ کیا اور وہاں کی باشندہ قدیم اقوام کو اپنا تابع بنایا اَور سنگھڑ میں اپنی ایک ریاست قائم کر لی تھی[۳]

---

[۱] بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۳۶۲۔ [۲،۳] گل بہار ص ۲۲، ۲۹۔

دوسری غلطی ۔ فریدی صاحب سے دوسری روایتی غلطی یہ ہوئی ہے جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں " نواب غازیخان حضرت مخدوم لعل عیسن قریشی رح سے ارادت رکھتے تھے ۔ حسنِ اتفاق سے نواب اسمٰعیل خان اور نواب فتح خان بھی اسی شہباز طریقت کے مرید تھے ...... جب ان سرداروں نے عالم قدس کا سفر اختیار کیا تو ان کے اجساد کو حضرت کی پائینتی میں دفن کیا گیا ۔ پھر لکھتے ہیں " ناچیز مصنف نے حضرت مخدوم اور ان سرداروں کے مزارات کی زیارت کی ہے ان کتبات پر صاف لکھا ہے ۔

نواب اسمٰعیل خان بانی ڈیرہ اسمٰعیل خان
نواب غازیخان بانی ڈیرہ غازیخان
نواب فتح خان بانی ڈیرہ فتح خان لہ

اس تاریخ دانی پر آفرین ہے کہ مؤرخ نے بغیر کسی تحقیق اور چھان پھٹک کے غازیخان ثالث کو غازیخان اول قرار دے دیا ہے ۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ غازیخان اوّل کا مقبرہ موجود شہر ڈیرہ غازیخان میں ہے اور اس پر ان کی تاریخ وفات کا کتبہ نصب تھا جو بعد میں اکھاڑ دیا گیا ۔ اس کتبہ پر آپ کی تاریخ وفات ۸۹۹ھ (۱۴۹۴ء) درج تھی ۔

جبکہ غازیخان دوم کی قبر پیر عادل صاحب کے روضہ سے باہر جنوبی دروازہ پر رکھی اور موجود ہے ۔ جوکہ اس مزار کا ارادتمند تھا ۔ اور لعل عیسن کروڑ کے دربار میں جس غازیخان کی قبر رکھی ہے ، وہ غازیخان ثالث کی ہے ۔ مگر "یار لوگوں" نے اسے غازیخان اول سمجھ کر اس کی قبر پر " غازیخان اوّل بانی ڈیرہ غازیخان کا کتبہ لگا دیا ہے ۔ میں نے بھی لعل عیسن کروڑ کے مقبرہ میں جاکر یہ قبریں دیکھی ہیں اور وہ انھیں ناموں سے منسوب ہیں ، جن کا ذکر فریدی صاحب نے کیا ہے اور یہ درست نہیں ہے یہ تینوں سردار اپنے سلسلہ کے تیرے ثالث ، سردار ہیں ۔ مجھے وہاں پر موجود درباری نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس مقبرہ کی جب مرمت کرائی گئی تھی ۔ جو چند سال پیشتر ہوئی ، تو یہ کتبات بھی اس وقت ان قبروں پر لگوائے گئے ۔ یہ کتبات ملتانی ٹائل کے ہیں جو عام طور سے قبروں پر استعمال ہوتے ہیں اب انہیں بھی کور رکلر ، لگ چکا ہے ۔ اور کتبات کے بعض حصے مٹ چکے ہیں ۔ لعل عیسن کروڑ کا مقبرہ اس وقت محکمہ اوقاف

لہ ۔ بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۳۴۳ ۔

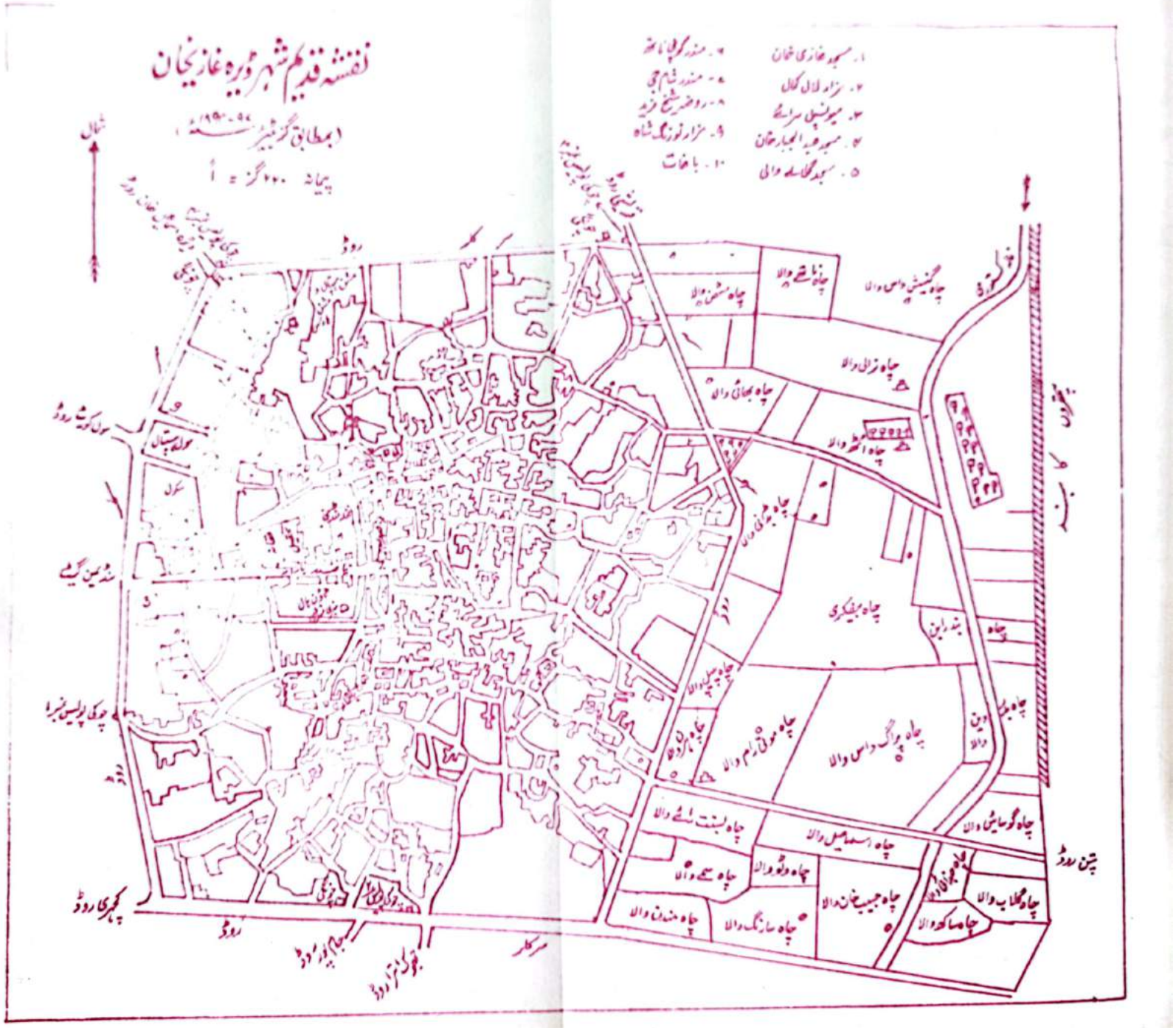

نقشہ قدیم شہر ڈیرہ غازیخان
(بمطابق گزٹیر ۱۹۵۰-۵۷ء)
پیمانہ ۲۰۰ گز = ۱ انچ
شمال
۱۔ مسجد غازی خان
۲۔ مزار لال کمال
۳۔ میونسپل سرائے
۴۔ مسجد عبد الجبار خان
۵۔ مسجد گلاسے والی
۷۔ مندر شام جی
۹۔ مزار نورنگ شاہ
۱۰۔ باغات
سول ہسپتال
سکول
چاہ زالی والا
چاہ بیفکری
چاہ اسمٰعیل والا
چاہ گلاب والا
پٹن روڈ
کچہری روڈ

کی تحویل میں ہے۔

حاجی خان دوم - حاجی خان دوم اپنے باپ غازیخان اول کے بعد ڈیرہ غازیخان کا نواب ہوا اور یہ سکندر لودھی کا دورِ حکومت تھا۔ عام کتب تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ قصبہ حاجی پور اسی حاجی خان میرانی کا آباد کردہ ہے[1]۔ لیکن ہیتو رام نے قصبہ حاجی پور کا بانی ملک محمد ٹبرڑہ کو لکھا ہے۔ اور یہی روایت درست معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح نور احمد خان فریدی غازیخان اوّل کے چار لڑکے بیان کرتے ہیں، کمال خان، سلطان خان، داؤد خان اور نوشیر خان یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے علی الترتیب یہ شہر آباد کیئے تھے لیّہ، کوٹ سلطان، کوٹ اَدّو اور نوشہرہ - لیکن ہمارے خیال میں کوٹ سلطان، سلطان حسین خان لنگاہ کا آباد کردہ ہے - بہر حال میرانی خاندان کے شجرۂ نسب میں اول الذکر تین بھائیوں کے نام غازی خان چہارم کی اولاد میں لکھے ہیں - اس لئے یہ روایت بھی مُصنّف کا سہو قلم معلوم ہوتا ہے - حاجی خان دوم کی جب وفات ہوئی تو غالباً اسے اپنے باپ غازیخان اوّل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

غازیخان دوم - حاجی خان دوم کے بعد اس کا بیٹا غازیخان دوم کے لقب سے جانشین ہوا - قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غازیخان دوم ابراہیم لودھی کا ہمعصر تھا۔

اِس سردار کے دور کے واقعات میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا ہے کہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں شاہ حسن ارغون حاکم سندھ نے جب ملتان پر حملہ کیا اور محمود شاہ لنگاہ سے ملتان اور اوچ کے علاقے لے لیئے اور ڈیرہ غازیخان کا رخ کیا تو اس وقت غازیخان دوم قلعہ دِلور (میٹھڑ دِلورانے) میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ مرزا شاہ حسن نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا - جو ایک ماہ تک جاری رہا -

اس وقت پانی کی سخت قلّت تھی جسے دور کرنے کیلیئے ارغون سردار نے قلعہ سے باہر تین سو کے قریب کچے کھوہ (چاہات) کھدوائے اور پانی کی اِس تنگی کو دور کیا۔ دورانِ محاصرہ مرزا حسن نے غازیخان کے لشکر کو کافی نقصان پہنچایا۔ آخر کار بھاری مالِ غنیمت لے کر بھکر (سندھ) کو واپس چلا گیا۔

چنانچہ تحفۃ الکرام کا مُصنّف لکھتا ہے۔" شوریدہ زمین پر واقع یہ قلعہ جو مضبوطی کے اِعتبار سے

[1] تاریخ بلوچستان ص ۸۶، تذکرہ رؤسائے پنجاب ص

دور دراز کے ملکوں تک مشہور تھا کچھ ہی عرصہ میں فتح ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ حکم کے مطابق مرزا کے لشکر نے ایک ماہ کی رسد اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور تین دن کے اندر اندر قلعہ کے چاروں طرف انہوں نے تین سو کنویں کھود کر خشکی کی پریشانی سے بے نیاز کر لیا تھا۔ دوسری طرف غازیخان قلعہ کے اندر پھنس کر رہ گیا اور کافی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد آخر کار لاچار ہو کر رہ گیا۔ قصہ مختصر اہل قلعہ میں سے اکثر قتل و زخمی اور باقی ماندہ ہو کر گرفتار کر کے بے اندازہ غنیمتوں کے ساتھ پندرہ دن کے اندر بھکر واپس پہنچ گیا۔[1]

غازیخان دوم فنون لطیفہ میں بھی ذوق لطیف رکھتا تھا۔ وہ میرانی خاندان میں ایک معمار سردار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے چنانچہ اس نے ایک عقیدت مند مرید کی حیثیت سے روضۂ پیر عادل تعمیر کرایا جو اس وقت کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

روضۂ پیر عادل کے پاس ہی اس کے لڑکے کا محل بنوا دیا یہ دونوں عمارتیں ہنوز موجود ہیں اور اپنی صناعی کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ پیر عادل صاحب کا روضہ ۹۱۹ھ (۱۵۱۳ء) کا تعمیر شدہ بیان کیا گیا ہے لیکن سن درست نہیں ہے۔ اس روایت کو دیکھ کر ہمارے ایک سابق ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر نے رسالہ تعارف و جائزہ ڈیرہ غازیخان میں لکھا کہ "غازیخان مرحوم نے یکم ماہ رمضان ۹۱۲ھ میں حضرت صاحب پیر عادل کے روضۂ اطہر کا سنگ بنیاد رکھا اور محرم ۹۱۹ھ میں یہ روضہ مبارک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان روایات کو بیان کرتے ہوئے مؤرخین غازیخان دوم کے زمانۂ اقتدار پر نظر نہیں ڈالتے کیونکہ غازیخان اوّل کی وفات جیسا کہ اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے ۹۰۰ھ (۱۴۹۴ء) ہے اور غازیخان دوم کا زمانہ اس سے بہت بعد کا ہے۔ اس چیز کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اور پیر عادل کے روضہ کی تعمیر ۹۱۹ھ کے بعد کسی وقت ہوئی تھی۔

نور احمد خان کی تسبیری غلطی۔ نور احمد خان فریدی اول میرانی سردار غازیخان اور ہوت سردار اسمٰعیل خان کے درمیان سرحدی جھگڑے کا ذکر بھی اسی غازیخان (دوم) کے دور میں کرتے ہیں۔ اور روضہ پیر عادل کی تعمیر کے بیان میں سخی سرور صاحب کا نام لکھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔[2]

[1] تحفۃ الکرام ص ۱۸۸، ۱۸۹ [2] بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۳۶۳، ۳۶۴۔

غازیخان دوم چونکہ دربار پیر عادل کا مرید اور عقیدت مند تھا۔ اس لئے اس نے دربار پیر عادل سے باہر جنوبی دروازہ پر اپنی زندگی میں ایک چھوٹا سا مقبرہ بنوا دیا تھا۔ اور وصیت کی کہ مرنے کے بعد اسے اس مقبرہ میں دفن کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

سید عطا حسین کا بیان ہے کہ غازیخان دوم کے مقبرہ کے ساتھ ساتھ میرانی سرداروں کے چند اور مقبرے بھی بنے ہوئے تھے۔ جو اب منہدم ہو چکے ہیں۔ ان کی بنیادیں زمین کی تہہ میں اب بھی موجود پڑی ہیں یہ چھوٹے چھوٹے مقبرے ملتانی ٹائیل سے پختہ تعمیر کئے گئے تھے۔

حاجی خان اور غازیخان سوم۔ یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ غازیخان دوم کے بعد اس کا لڑکا حاجی خان سوم باپ کا جانشین ہوا تھا مگر اس کے متعلق کوئی تاریخی حالات معلوم نہیں ہو سکے ہیں اس لئے یہاں پر غازیخان سوم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

غازیخان سوم کا دور حکومت اگرچہ اپنے پیشرو سرداروں سے زیادہ روشن اور اہمیت کا حامل رہا ہے۔ تاہم بعض مؤرخین اس دور کو میرانی خاندان کے انحطاط پذیر دور سے منسوب کرتے ہیں غازیخان کو شیر شاہ سوری اور اس کے بعد اکبر اعظم کا ہمزمان سمجھنا چاہیئے۔

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے کہ مرزا ہمایوں نے شیر شاہ سوری سے بھوج پور قنوج کے مقامات پر یکے بعد دیگرے شکست کھائی تھی اور پنجاب کی طرف بھاگ آیا پنجاب کا گورنر مرزا کامران لاہور سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ چنانچہ ہمایوں لاہور پہنچا اور پھر ملتان چلا آیا تھا۔ ملتان سے جودھپور اور سندھ سے ہوتا ہوا بلوچستان کے راستے ایران کی سرحد عبور کر گیا۔

ابتدا میں شیر شاہ سوری نے اس کا تعاقب کیا اور لاہور میں آکر رک گیا اور یہاں سے خوشاب کی طرف چلا گیا تھا۔ خوشاب اور بھیرہ کے درمیان واقع پہاڑیوں پر اس نے روہتاس خورد نام سے ایک قلعہ بنوایا اور ایک سال تک وہاں پر ٹھہرا رہا۔ اس موقع پر ڈیرہ جات کے سردار، غازیخان فتح خان اور اسمٰعیل خان ثالث اس کے پاس پہنچے۔ برصغیر کی فتح و نصرت پر اسے مبارک باد دی اور اپنی اطاعت اور وفاداری پیش کی۔

عباس علی خان شیروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہ نے ان بلوچ سرداروں کو اپنے گھوڑے

داغ کرانے کو کہا اسمٰعیل خان نے جواب دیا کہ لوگ گھوڑے داغ کراتے ہیں اور میں اپنے آپ کو داغواؤں گا۔ اس بات پر شیر شاہ کو ہنسی آگئی اور کہا جاؤ تم پر گھوڑے داغوانا معاف ہے شیر شاہ نے ان سرداروں کو سابقہ خطابات کے ساتھ سندِ حکومت دے کر رخصت کر دیا۔[۱]

یہ غازیخان سوم ہی تھا جو شیر شاہ سوری سے خوشاب کے مقام پر ملا تھا اور اسی غازیخان کے دورِ اقتدار میں لغاری، مزاری، دریشک اور نتکانی بلوچ قبائل نے ان علاقوں میں آ کر قبضہ کیا تھا۔ جہاں پر یہ لوگ اب تک آباد چلے آتے ہیں۔ اسی دور میں دلشاد خان قیرانی نے درّہ کنہوان سے نکل کر نتکانی علاقہ پر یورش کی جسے نتکانی سردار اور غازیخان سوم کے مشترکہ لشکر نے اندر درّہ کنہوان واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہیتو رام لکھتے ہیں۔ "جب دلشاد خان تمندار تھا۔ قیرانی لوگوں کی خبگ مردم نتکانی سے شروع ہو گئی۔ جو کہ مردم نتکانی علاقہ سنگھڑ میں زمین سکونت رکھتے تھے اور نواب غازیخان رئیس ڈیرہ غازیخان سے بطور مصالحت وانجام گزران کرتے تھے۔ نواب غازیخان نے جو تیسرا غازیخان تھا لشکر اپنا واسطے مدد مردم نتکانی بارادہ سرزنش تمن قیرانی بھیجا دلشاد مذکور نے پہلے مقابلہ کیا۔ جبکہ فوج نواب صاحب و نتکانی بہت جمع ہو گئی تھی، قیرانی بھاگ کر داخل پہاڑ ہوئے ..... جب دلشاد مذکور نے بلحاظ فوج سرکاری باہر کوہ کے راہ آمد و رفت نہ پا کر بصورت لاچاری معہ چندے برادری براہ کوہ پاس قتل خان قوم کٹھیل نواب ٹانک کے جا کر نوکری کر لی۔[۲]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ غازیخان ثالث اپنے دور کا ایک منتظم اور طاقتور حکمران تھا۔ اس کے عہد میں مرکزی حکومتوں میں تبدیلیاں بھی آئیں اور اندرونی خلفشار بھی پیدا ہوئے تاہم اس نے ہر معاملہ کو اپنے ناخنِ تدبیر سے حل کیا۔ اور ملک میں زوال نہ آنے دیا۔

غازیخان سوم چونکہ دربار لعل عیسن کروڑ کا عقیدت مند تھا اور سلسلہ مریدی بھی اسی دربار سے رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنے عہد کے دیگر دو سرداروں اسمٰعیل خان اور فتح خان کے ساتھ مل کر لعل عیسن کروڑ کا روضہ بنوایا۔ جو اس وقت سے بدستور چلا آ رہا ہے

---

[۱] تاریخ شیر شاہی ص ۱۰۸/۲۸۴ - [۲] گل بہار ص ۲۹۳۔

غازیخان سوم جب فوت ہُوا تو اسے لعل عیسن کروڑ کے روضہ کے اندر اس کی پائینتی میں دفن کیا گیا۔ جہاں پر اس کی قبر ہنوز موجود ہے اس پر کتبہ بھی نصب ہے، چونکہ یہ کتبہ محکمہ اوقاف نے لگوایا ہے۔ اس پر غازیخان بانی شہر ڈیرہ غازیخان کا جملہ غلط درج ہے۔

حاجی خان اور غازیخان چہارم

حاجی خان چہارم اگرچہ اپنے باپ کے بعد سرزمین ڈیرہ غازیخان کا نواب بنا اور ایک نامعلوم عرصہ تک حکومت کی۔ مگر اس کے دور پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس سے کہ ہم اس کے دور کے حالات حاصل نہ کر سکے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ڈیرہ غازیخان کے میرانی سرداروں میں "حاجی خان" اور غازیخان ان کے کوئی ذاتی نام نہیں تھے بلکہ یہ ان کے شاہی لقب تھے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس خاندان کے شجرۂ نسب میں پانچ حاجی خان اور تین غازیخان کے نام ملتے ہیں۔ باقی سردار میں یہ شاہی لقب بھی نہیں پائے جاتے۔ تاہم میں نے ان سرداروں کے ذاتی ناموں کے ساتھ غازیخان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

الغرض ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان کا بیان ہے کہ اکبر اعظم کے عہد حکومت میں میرانی سردار بدستور حکومت دہلی کے اطاعت گزار رہے اور اپنی اطاعت گزاری کی علامت کے طور پر اسے کچھ خراج کی صورت میں ادائیگی بھی کرتے رہے جس وجہ سے ان کے عملی طور پر اختیارات کم ہو گئے تھے[۵۱]۔

غازیخان چہارم جس کا بیان یہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کا اصل نام چاکر خان تھا اور وہ جہانگیر بادشاہ کا ہمزمان ہو سکتا ہے۔ اس غازیخان کے دورِ حکومت کے متعلق کہا گیا ہے کہ میرانی حکومت کا برابر عروج رہا اور اس کی وفات کے بعد زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔

اسی غازیخان کے بیٹوں میں سے کمال خان نے قصبہ لیہ، سلطان خان نے کوٹ سلطان اور آدو خان (عادو خان) نے کوٹ ادو کی بنیادیں رکھی تھیں[۵۲]۔ اس روایت میں سن ۱۵۵۰ء کا جو تعین کیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ تینوں بھائی اپنے اپنے علاقہ کے گورنر تھے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کوٹ سلطان کا اصل بانی سلطان

[۵۱]۔ گزیٹیر ندکور ص ۳۲۔ [۵۲] تذکرہ روسائے پنجاب ص ۴۴۶۔

حسین خان لنگاہ ہے۔ اس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ علاقہ سنگھڑ (تحصیل تونسہ) میں کوٹ سلطان کے بالمقابل اور دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر پتن لنگاہ (کشتیوں کا گھاٹ) مشہور اور موجود ہے جیسا کہ ڈیرہ غازیخان شہر کے بالمقابل اور دریا کے دوسرے کنارے پر غازی گھاٹ (پتن غازیخان) واقع ہے۔

غازیخان پنجم ۔ غازیخان پنجم کا اصل نام کمال خان ہے اور اسے شاہجہان کا ہمعصر سمجھا جانا چاہیئے۔ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد حکمران بنا یہی وہ دور ہے جبکہ ڈیرہ غازیخان کی میرانی حکومت کو زوال آنا شروع ہوا، چنانچہ سب سے پہلے خود کمال خان اپنے بھائیوں کی ہمدردیاں کھو بیٹھا۔ اور وہ جہاں جہاں انتظام سنبھالے بیٹھے تھے اس کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ بھائیوں کی اس ناچاکی نے لیّہ اور تھل کے علاقہ میں ایک نئی قیادت کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ چنانچہ داؤد خان جسکانی بلوچ نے اُٹھ کر لیّہ، تھل اور کچھی پر قبضہ کر لیا اور میرانی حکومت سمٹ سمٹا کر دریائے سندھ کے مغربی کنارہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کمال خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قصبہ لیہ کی بنیاد اس نے رکھی تھی اگرچہ اس کا سن بنیاد جو تاریخوں میں آیا ہے درست نہیں ہے کمال خان کی قبر [illegible] موجود بتائی جاتی ہے۔

تاریخ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ہوت اور ڈیرہ غازیخان کے میرانی سردار اس وقت اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ میر داؤد خان جسکانی ان سے جبراً بھنگا (برات) لیا کرتا تھا اور یہ سردار اسے برائتیں دینے پر مجبور تھے چنانچہ اس روایت میں پنجابی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

داؤد میر دارہ اندر وینداڈ نگے ۔ ہوتاں تے میرانیاں کولوں نت برائتیں منگے[2]

حاجی خان پنجم ۔ اس حاجی خان کا اصل نام آدو خان (عادو خان) تھا اور اپنے بھائی کمال خان (غازیخان پنجم) کے بعد برسر اقتدار آیا۔ اور حاجی خان کا شاہی لقب اختیار کر کے ڈیرہ غازیخان کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ حاجی خان مغلیہ بادشاہ شاہجہان کے آخر اور اورنگ زیب کے اول دور میں تھا ۱۰۶۸ھ کے آخر میں جب اورنگ زیب اپنے بھائی دارا شکوہ کا تعاقب کرتے ہوئے ملتان آیا۔ تو اس وقت یہی حاجی خان یہاں پر حکمران تھا، اور ملتان میں اورنگ زیب سے ملا اور قدم بوس

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اسمٰعیل خان ص ۳۲۔ [2] کتاب مذکور ص

ہوا، اور اپنی وفاداری پیش کی اور خلعت حاصل کیا۔ جیسا کہ بیان میں آیا ہے ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ کو موضع مومن پورہ کے نواح میں ڈیرے ہوتے یہاں اطلاع ملی کہ دارا شکوہ ملتان میں آٹھ روز ٹھہرا، پھر کوکبۂ شاہی کی آمد آمد سُنی تو ملتان کے خزانہ سے بائیس لاکھ روپے لے کر بھکر (سندھ) کی طرف فرار ہو گیا اکثر ملازموں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حاجی خان بلوچ نے کچھ آدمیوں کی مدد سے خزانے کی کشتیوں کو روکنا چاہا، دارا شکوہ کے آدمیوں سے کچھ جھڑپ بھی ہوئی آخر نہ روک سکا۔

قیام ملتان کے زمانے میں واقعہ نویسوں کے پرچوں سے خاقان زمان (اورنگ زیب) کو معلوم ہوا کہ دارا شکوہ کی انگیخت سے بہک کر شہزادہ شجاع نے بنگال میں لشکر فراہم کیا ہے اور سامانِ جنگ ترتیب دیکر لڑائی کیلئے روانہ ہو چکا ہے۔ اس اطلاع کے بعد افواج قاہرہ کو دارا شکوہ کے تعاقب میں چھوڑ کر اورنگ زیب نواح ملتان میں صرف پانچ روز حاجی خان بلوچ جو ملتان کلمر برادروہ زمیندار تھا حاضر بارگاہ ہوا، خلعت، اسپ اور فیل کی عنایت سے سرفراز کیا گیا۔[1]

الغرض حاجی خان پنجم ایک عرصہ حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا اور اپنے جد امجد غازیخان اول کے مقبرہ میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

غازیخان ششم ۔ مبارک خان پسر کمال خان اپنے چچا حاجی خان پنجم کے انتقال کر جانے کے بعد سربراہِ مملکت ہوا اور غازیخان کا لقب اختیار کیا یہ دور حکومت بھی اورنگ زیب کا معلوم ہوتا ہے۔ شہزادہ معزالدین اس وقت لاہور اور ملتان کا گورنر تھا اور سندھ میں میاں نصیر محمد سرائی حکمران تھا۔

میاں نصیر محمد پر شہزادہ معزالدین کو بھیجا گیا جس نے میاں صاحب کو گرفتار کر کے دہلی بھیجدیا۔ میاں صاحب کچھ عرصہ تک دہلی میں قید رہا پھر اسے گوالیار کے قلعہ میں منتقل کیا جا رہا تھا کہ راستہ میں اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ سرکاری محافظوں سے بھاگ نکلا، اور جیسلمیر، اوچ سیت پور اور علی پور سے ہوتا ہوا ڈیرہ غازیخان پہنچا، اور مزاری سردار کے پاس چلا گیا جس نے اُسے شکار پور میں نواب بہادر خان کے پاس بھجوا دیا۔ اس وقت غازیخان ششم

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۶۶۸، ۶۷۰۔

کے پاس اورنگ زیب کی طرف سے میاں نصیر محمد کی گرفتاری کا پروانہ آیا۔ مگر ایک محتاط ناکہ بندی کے باوجود ان سے گرفتار نہ ہو سکا۔

اِن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیرہ غازیخان کی میرانی حکومت جو اس وقت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں حرف کوٹ اَدو کا علاقہ باقی شامل تھا ابھی کس قدر طاقتور اَور شاہی اہمیت کی حامل تھی۔

بہر حال غازیخان ششم نے بھی وفات پائی اَور شاہی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔

غازیخان ہفتم

غازیخان ہفتم کا نام میر عالم خان تھا۔ وہ اپنے باپ مبارک خان کی وفات کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ غازیخان ہفتم بھی اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں تھا۔ جبکہ سندھ میں میاں دین محمد حکومت کرتا تھا۔

۱۱۱۳ھ (۱۷۰۱ء) میں غازیخان ہفتم نے اپنے مُشیروں قطب خان، اَور عثمان خان کے بہکانے اَور غلط مشورہ سے مغلیہ سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی، اَور خراج دینا بند کر دیا۔ یعنی خود مختیار ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس بنا پر شہزادہ معزالدین نے اس کے خلاف فوجی مہم بھیج دی۔ امیر مبارک خان داؤد پوترہ بھی شاہی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اَور غازیخان کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ غازیخان اِس لڑائی میں شکست کھا گیا اور اس کے دونوں مُشیر گرفتار کر لیے گئے۔[1] تحفتہ الکرام کا بیان ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد غازیخان کے بیٹے شاہ محمد نے بغاوت کر دی، اس وقت سیت پور اَور جلال پور پیروالا کے سادات شاہ محمد میرانی کے ہمراہ تھے اَور آٹھ ہزار کا لشکر لے کر میدانِ جنگ میں آ موجود ہوئے۔

شہزادہ معزالدین کو اِس امر کی اِطلاع ہوئی تو وہ بھی ایک جرار لشکر لے کر ڈیرہ غازیخان پہنچ گیا۔ فریقین کے درمیان میدانِ کارزار گرم ہوا، اور کشتوں کے پُشتے لگ گئے اس خوفناک لڑائی میں حرم شاہی کی سواری خطرہ میں پڑ گئی۔ اس نازک موقع پر داؤد پوتروں نے حرم شاہی کے ہاتھی کو بچا لیا، اَور ہونے والی ایک فاش شکست فتح میں بدل گئی تاہم بغاوت کی یہ آگ شاہی لشکر سے بجھائی نہ جا سکی۔ چنانچہ بلوچوں کے نامور سردار میر شہداد خان تالپور کو سندھ سے بلایا گیا جس نے شاہ محمد خان میرانی کی اِس بغاوت کو سختی سے کچل دیا تھا۔[2]

[1] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ـ ص ۲۰۴ [2] کتاب مذکور ص ۳۲۷، ۳۲۸۔

غلام رسول صاحب مہر لکھتے ہیں" گلدستہ نورس بہار میں شاہ محمد دو داٸی کے متعلق کئی مقامات پر ذکر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اِبتدائی ہنگامہ کے بعد بھی شاہ محمد کی مخالفانہ کارروائیاں جاری رہیں۔ بعض تحریروں سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ شاہ محمد اور اس کے بھائی صاحب خان میں اختلاف تھا۔[3]

نور احمد خان فریدی شاہ محمد خان میرانی کی اس بغاوت کو مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگ آزادی کا نام دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات درست نہیں ہے۔ اس بغاوت کی وجہ آگے بیان کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد خان کے ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد مغلیہ سلطنت اَور غازیخان ہفتم کے مابین صلح وصفائی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر مبارک خان کو اِس کی گزشتہ خدمات کے عوض میں شاہی منصبدار بنا دیا گیا۔ جب وہ منصبدار بنا تو اس نے شہزادہ معزالدین کو اپنے ایک خاص دشمن بختیار خان بنی کے خلاف بھڑکایا، اَور شہزادہ کے کان بھرے اور کہا کہ بختیار خان سلطنت مغلیہ کا جُوا اپنے کندھے سے پھینک کر اپنی آزادی کا اِعلان کرنے والا ہے۔ چنانچہ شہزادہ نے اس پر فوج کشی کا حکم دے دیا اور وہ اس شاہی حملہ میں مارا گیا۔ بختیار خان کے مارے جانے کے بعد ڈھاڈر اَور سبّی کی حکومت باری باری کئی آدمیوں کے سپرد کی گئی۔ جن میں غازیخان ہفتم بھی شامل ہے مگر یہ بھی اس صوبہ کا اِنتظام قائم نہ رکھ سکا۔ اور دوسرے سرداروں کی طرح ناکام رہا۔

۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں شہزادہ معزالدین نے میاں دین محمد پر چڑھائی کی تھی اَور اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ ملتان لے آیا اور دین محمد کا بھائی میاں یار محمد قلات کو بھاگ گیا۔ اس کے دو سال بعد میاں یار محمد نے سندھ میں واپس آکر دوبارہ قبضہ کر لیا اور شہزادہ سے سند حکومت لے لی۔ اس وقت شہزادہ نے ڈھاڈر اَور سبّی کی حکومت بھی میاں صاحب کی تحویل میں دے دی اَور ڈیرہ غازیخان کو بھی سندھ کے تابع کر دیا۔

اِس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ محمد میرانی کا ہنگامہ اسی دور ۱۱۱۱ھ میں ہوا تھا کیونکہ تحفۃ الکرام کا مُصنّف لکھتا ہے " میاں یار محمد خان شاہی منصبدار بن گئے تو غازیخان کے بیٹے شاہ محمد نے ہنگامہ بپا کیا۔[4]

[3] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ص ۳۲۷، ۳۲۸ [4] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ـ ص ۲۱۵

غرضیکہ ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ ڈیرہ غازیخان کے میرانی سردار سلطنت مُغلیہ کے خلاف نہیں تھے۔ اور انہوں نے اس وجہ سے بغاوت نہیں کی تھی کہ وہ ان سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انہیں یہ بات قطعاً پسند نہ تھی کہ سندھ کی کلہوڑہ حکومت کا طوق اُن کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

غلام رسول صاحب مہر لکھتے ہیں کہ ڈیرہ غازیخان کے صوبہ دار کا ایک رشتہ دار میر عبداللہ خان بروہی سردار کے پاس فریاد لے کر گیا اور کہا کہ مجھے ڈیرہ غازیخان کا حاکم تنگ کرتا ہے اور مجھے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا، میری عزت کی لاج رکھیئے اور مجھے اس کے ظلم سے نجات دلایئے چنانچہ میر عبداللہ خان، جو کہ مردانگی کے جنگل کا شیر تھا۔ یہ بات سنتے ہی اسے خیال ہوا کہ اس فریادی کی شرم کی لاج رکھنا مجھ پر فرض ہو چکا ہے اور سراواں اور جھلاوان کے لشکر لے کر روانہ ہو پڑا اور منزلیں طے کرتا ہوا سرزمین ڈیرہ غازیخان پر پہنچ گیا۔[1] اس واقعہ کو تاریخ بلوچستان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"شخصی از حاکم ڈیرہ غازیخان صوبہ پنجاب کہ قرابتی بحاکم ڈیرہ داشت۔ از دستِ تطاول آن استغاثی نزد میر عبداللہ خان آمد وگفت کہ ننگ مرا بکن۔ از آنجا کہ میر عبداللہ خاں ہژبر بیشۂ شجاعت بود از شنیدنِ این سخن ننگ او دامنگیر دیدہ بمعہ افواج سراوان وجھلاوان طے نمودہ واردِ ملک ڈیرہ گردید۔ وشہر ڈیرہ را بغاوت رسانیدہ درانجا مسکن پذیر گردید[2]"

پھر مہر صاحب میجر رابرٹ لیچ صاحب د کے حوالے سے لکھتے ہیں "میر عبداللہ خان نے ڈیرہ غازیخان میں کئی گاؤں جلائے خوب لوٹا اور قیدی پکڑے"

اور اخوند محمد صدیق کے حوالہ سے لکھا ہے "عبداللہ خان نے وہاں (ڈیرہ غازیخان) ڈیرے ڈال دیئے تھے اور واپسی کے لئے تیار نہ تھا۔ اخوند محمد صالح وزیر اور سرداروں نے بہت سمجھایا کہ بیگانے ملک میں بیٹھنا خلاف مصلحت ہے۔ عبداللہ خان نے ایک نہ سُنی آخر سردار اُسے زبردستی واپس لے گئے"

غرضیکہ غازیخان ہفتم کا دور ایک کٹھن اور کڑی آزمائش کا دور تھا وہ اور اس کی حکومت طاقتور ہمسایوں کی نظرِ حرص و آز سے بمشکل بچی۔

[1] - تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج - ص ۳۸۶ - [2] کتاب مذکور ص ۱۸۵ -

غازیخان ہشتم

- غازیخان ہشتم کے روایتی لقب سے صاحب خان ولد میر عالم خان باپ کا جانشین ہوا اور اقتدار زمام ہاتھ میں لی۔ صاحب خان کا ذکر گزشتہ سلور میں بھی آچکا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں وہ اپنے بھائی شاہ محمد خان کے ہنگاموں میں شریک رہا۔ لیکن بھائی سے اکثر وہ اختلاف رکھتا تھا۔ اس کی طبیعت صلح کُن واقع ہوئی تھی۔ شاہ محمد کبھی موقع پر ان ہنگاموں میں مارا گیا تھا اور صاحب خان اپنی طبع سلیم کے باعث محفوظ رہا۔

ان دنوں دہلی میں محمد شاہ اور سندھ میں میاں نور محمد سرائی حکومت کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی غازیخان کے دور میں شاہ حسین غلزی نے قندھار سے آکر ڈیرہ غازیخان پر حملہ کیا۔ اُسے لوٹا اور قتل وغارتگری کی اور میرانیوں کی طاقت کو کچل دیا۔ غالباً اس وقت غازیخان ہشتم شاہ حسین کے اس ہنگامہ میں مارا گیا اور میرانیوں میں اس وقت حکومت سنبھالنے کے قابل کوئی شخص باقی نہ تھا۔ چنانچہ شاہ حسین غلزی نے غازیخان کے وزیر محمود خان گوجر کو سرزمین ڈیرہ غازیخان کا گورنر بنا دیا۔

حیاتِ افغانی کا بیان ہے کہ "شاہ حسین غلزی بادشاہ قندھار مع فوج ڈیرہ غازیخان کی حدود میں آیا اور بلوچوں نے نادانی سے اس کے لشکر کو ایذا پہنچائی تب اس کے حکم سے ڈیرہ غازیخان غارت ہو کر قتل عام بلوچوں میں خاندان غازیخان برباد ہو گیا۔ ایسے موقع پر محمود گوجر نے بادشاہ دہلی کے حکم سے ڈیرہ غازیخان پر قبضہ کر لیا[1] یہ ۱۷۲۷ء کا واقعہ ہے۔

[1] میرویس ہوتک (حاجی امیر خان) نے ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں شاہ ایران سلطان حسین صفوی کے صوبہ دار گرگین شاہنواز خان گرجی کو قتل کر کے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ اور افغانوں کی آزادی کا اعلان کر دیا میرویس نے ۱۷۱۵ء میں وفات پائی اور اس کا بھائی عبداللہ قندھار کا حاکم بنا مگر اس کے چھ سال بعد میرویس کے بیٹے محمود خان نے اپنے چچا عبداللہ کو معزول کر کے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے ایران پر حملہ کیا اور سلطان حسین صفوی کو شکست دی۔ سلطان حسین صفوی اس لڑائی میں مارا گیا اور محمود خان ہوتکی ایران کا فرمانروا ہو گیا۔ اس وقت محمود نے قندھار کی حکومت اپنے بھائی شاہ حسین غلزی کے حوالے کر دی۔ چنانچہ یہی شاہ حسین غلزی ڈیرہ غازیخان پر حملہ آور ہوا، غلزی کی اصل کیلئے دیکھئے حیات افغانی ص ۳۵۵ تا ۳۵۶۔

شاہ حسین کے بعد ١٧٣٨ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اسے لوٹا تخت طاؤس، اور قیمتی جواہرات حاصل کئے۔ دریائے سندھ کے مغربی ممالک کی سند لی، ان علاقوں کو سلطنت ایران کے تابع کیا جس میں ڈیرہ غازیخان بھی شامل تھا۔ چنانچہ دہلی سے واپسی پر اس نے میررانیوں سے حکومت لے کر محمود خان گوجر کے حوالے کر دی۔

٥١۔ نادر شاہ کا باپ رضا قلی خان خراسان کا باشندہ اور قوم افشار کی ترک شاخ سے تھا پیشہ اس کا گلہ بانی تھا نادر شاہ نے شعور میں آتے ہی باپ کا پیشہ ترک کر دیا اور پیشہ رہزنی اختیار کر لیا۔ اپنے اس جدید پیشے کی وجہ سے وہ بہت مشہور ہو گیا۔ غلزی افغانوں نے جب ایران پر قبضہ کیا تو نادر شاہ نے ایرانی فوج کی قیادت کی، اور غلزئیوں پر حملہ کر کے ان پر غالب آگیا۔ ١٧٣٦ء میں نادر شاہ نے شاہ ایران کو تخت سے اتاکر اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور ایران کا تاج و تخت خود سنبھال لیا۔ پھر اس نے ہرات اور قندھار کو بھی فتح کر لیا ہرات میں اس وقت ابدالی قوم اور قندھار میں غلزی برسر اقتدار تھے نادر نے جب قندھار پر حملہ کیا تو شاہ حسین غلزی قلعہ بند ہو گیا تھا۔ جب اس محاصرہ نے طول کھینچا تو شاہ حسین نے اپنی بڑی بہن "زینت بیگم" کو اپنے چند مصاحبین کے ہمراہ نادر شاہ کے پاس بھیج دیا اور امان طلب کی۔

نادر شاہ نے ١٧٣٩ء میں دہلی پر حملہ کیا اور محمد شاہ سے دریائے سندھ کے مغرب کا علاقہ لے لیا اور اپنے نام سند لکھوالی ساتھ ہی اپنے لڑکے نصر اللہ کی شادی ایک تیموری شہزادی سے کرا دی۔ شاہی خاندان کے دستور کے مطابق جب "نوشہ" سے اس کے نسب کے بارے میں پوچھا گیا اور کہا کہ سات پشت تک گن کر سنائے تو نادر نے اس وقت بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا "بگو! داماد ش پسر نادر شاہ است، و نادر شاہ پسر شمشیر بن شمشیر بن شمشیر و ہم چنیں تا ہفت بار بشمار" پھر نادر شاہ نے کہا "درشہسوار (نادر) برآب و رنگ ذاتی خود فخر است۔ در معدن (خاندان) نازش نیست۔" الغرض نادر شاہ کا ظلم و جور اور سخت گیری مشہور ہے اس نے اپنے بیٹے رضا قلی مرزا کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ اس وقت نادر کے لڑکے رضا قلی مرزا نے کہا ابا جان! آپ نے میری آنکھیں نہیں نکالیں بلکہ سلطنت ایران کو اندھا کر دیا ہے۔ چونکہ مکافات کا عمل جاری ہے اس سے خود نادر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اور اس کے لشکریوں نے ١٧٤٧ء میں رات کے اندھیرے میں اس کے خیمہ میں گھس کر اسے قتل کر دیا۔ (بقیہ صفحہ ١٠٩)

گل بہار میں ہے کہ ١٧٣٦ء میں جب نادر شاہ خراسان سے دہلی پر تاخت لایا تو دریائے اٹک کے اس طرف کے ممالک کو قندھار کی حکومت میں شامل کر لیا اور اس وقت غازیخان کی اولاد سے کوئی آدمی حکومت کے لائق نہ تھا۔ محمود خان گوجر جس کا لقب بادشاہ کی طرف سے جان نثار خان عطا ہوا تھا۔ ڈیرہ غازیخان کا نواب بنا جو خراسان کی حکومت کی طرف سے مقرر ہو کر بندوبست اور امورات تنازعہ آبادی میں مشغول ہوا۔[٥١]

ڈسٹرکٹ گزٹیئر ڈیرہ اسمٰعیل خان کا بیان ہے ١٧٣٩ء میں دریائے سندھ کا مغربی علاقہ جب نادر شاہ کے پاس چلا گیا تو اس نے محمود خان گوجر کو گورنر بنا دیا۔ اور ڈیرہ غازیخان ڈسٹرکٹ گزٹیئر کی روایت بھی اسی قسم کی ہے۔ یعنی نادر شاہ نے اپنے حملہ ہندوستان ١٧٣٩ء کی واپسی پر میررانیوں میں سے کسی کو یہاں کا گورنر نہ بنایا بلکہ محمود خان گوجر وزیر غازیخان کو گورنر بنایا گیا۔[٥٢]

وفات: اس غازیخان کی وفات ١٧٥٨ء میں بیان کی گئی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ آخری غازیخان میررانی جس کی ڈیرہ غازیخان پر اصل حکومت تھی، ١٧٥٨ء میں فوت ہوا۔[٥٣] پس ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ١٧٢٧ء اور زیادہ سے زیادہ ١٧٣٩ء میں میررانی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کے بعد گوجر حکومت وجود میں آگئی۔

غازیخان ہشتم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک نالائق، عیاش اور شراب خور سردار تھا اس کے عہد میں اصل حکومت کی باگ ڈور اس کے وزیر محمود خان گوجر کے ہاتھ میں تھی۔[٥٤]

ے چو تیرہ شود مرد را روزگار   ہمہ آں کند کش نیاید بکار

بقیہ: غلام رسول صاحب مہر لکھتے ہیں کہ فردوسی ثانی جو کہ فردوسی کی اولاد سے تھا۔ اور نادر شاہ کے دربار کا شاعر تھا نادر کی وفات کا یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا۔

شبانگہ سر تخت و تاراج داشت   سحرگہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت

بیک گردش چرخ نیلوفری   نہ نادر بجا ماند نے نادری

مگر علامہ شبلیؒ فردوسی اول کی اولاد نرینہ کا ہونا تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ لکھا ہے کہ فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی صرف ایک لڑکی تھی۔ (شعر العجم ج ١ ص ٩٣) بہر حال نادر شاہ نے اپنے نام کا جو سکہ جاری کیا تھا اس کے ایک طرف یہ عبارت نقش تھی "نادر ایران زمین و خسرو گیتی پناہ" اور اس کے دوسری طرف یہ لکھا تھا "الخیر فیما وقع"

[٥١] کتاب مذکور ص ٧۔ [٥٢] گزٹیئر مذکور ص ٣٢-٣٣ [٥٣] ڈسٹرکٹ گزٹیئر ڈیرہ غازیخان ص ٢٢۔ [٥٤] تذکرہ رؤسائے پنجاب

غازیخان نہم (آخر) غازیخان آخر کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا یہ شخص میرانی خاندان کا چودھواں اور آخری تاجدار تھا۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ محمود خان گوجر آخری غازیخان کا اتالیق اور وزیر تھا۔ اس نے غلام شاہ کلہوڑہ حاکم سندھ کو غازیخان کے خلاف ڈیرہ غازیخان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اور اس نے ۱۷۷۳ء میں یہاں پہنچ کر غازیخان کو گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ لے جا کر حیدر آباد جیل میں قید کر دیا۔ جہاں پر غازیخان نہم نے کم سنی کے عالم میں وفات پائی۔ اور غلام شاہ کلہوڑہ نے اپنے حملہ ڈیرہ غازیخان کے وقت محمود خان گوجر کو اس کا گورنر بنا دیا۔ یہ ایک مفروضہ ہے جس کا تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اس کی وجوہات کچھ اس قسم کی ہیں۔

اوّل:۔ غلام شاہ کلہوڑہ نے سندھ کی حکومت ۱۷۵۸ء میں اپنے بھائی مراد یاب سے لڑ کر حاصل کی تھی۔ مگر محمود خان گوجر اس وقت فوت ہو چکا تھا۔ اور اس کا بھتیجا برخوردار خان جو کہ گوجر خاندان کا آخری حکمران تھا ۱۷۵۹ء میں مراد یاب کے ساتھ ڈیرہ اسمٰعیل خان کو جا رہا تھا۔ کہ وہاں کے بلوچوں نے اسے قتل کر دیا اور گوجر حکومت اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

دوم:۔ عام مؤرخین غازیخان ہشتم کو میرانی خاندان کا آخری حکمران سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات کسی قدر درست نہیں ہے۔ البتہ محمود خان گوجر اسی غازیخان کا اتالیق اور وزیر تھا۔ اور اسی سے اس نے حکومت حاصل کی تھی لیکن اس وقت غلام شاہ کلہوڑہ کا وجود نہیں تھا

سوم:۔ غازیخان ہشتم کے عہد میں شاہ حسین خلجی نے ڈیرہ غازیخان پر حملہ کیا اور میرانیوں کی طاقت کو کچل دیا تھا اور بادشاہ دہلی کے حکم سے غازیخان ہشتم کو ہٹا کر اس کی جگہ محمود خان گوجر کو یہاں کا حاکم بنا دیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں غازیخان ہشتم خود تو شراب و کباب اور عیش پرستی میں مگن رہتا تھا۔ اور انتظام ملکی مکمل طور سے محمود خان گوجر کے ہاتھ میں تھا۔ بالآخر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے غازیخان ہشتم کو باضابطہ طور سے بیدخل کر دیا اور اس کی جگہ محمود خان گوجر کو ڈیرہ غازیخان کی حکومت سونپ دی۔

اسی طرح ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ دُرّانی نے محمود خان گوجر کو اس کی اعلیٰ خدمات کے تحت بدستور ڈیرہ غازیخان پر بحال رکھا۔ ہماری رائے میں محمود خان گوجر ۱۷۲۶ء یا ۱۷۳۹ء سے ڈیرہ غازیخان کا حکمران ہوا تھا اور ۱۷۵۲ء تک کم سے کم تیرہ سال تک حکومت کی اور

فوت ہوا۔

اس کے یکے بعد دیگرے نور محمد خان گوجر اور اس کا بیٹا برخوردار خان ڈیرہ غازیخان میں حکمران رہے۔ محمود خان کے ان جانشینوں نے سات سال تک حکومت کی۔ اور آخری گوجر نواب ۱۷۵۹ء میں قتل ہوا، گوجر خاندان کے خاتمہ کے بعد ایک بار پھر میرانی خاندان کا فرد غازیخان نہم (آخر) کے نام سے برسر اقتدار آ گیا۔

چنانچہ ہیتو رام بیان کرتا ہے "بعد ازیں محمود خان گوجر نواب ڈیرہ غازیخان کا فوت ہو گیا نواب برخوردار خان برادر زادہ نواب محمود خان مقرر ہو کر انجام ملک کرتا رہا۔ اس عرصہ میں برخوردار خان ایک مقدمہ خانہ جنگی میں مارا گیا۔ بجائے اس کے ایک شخص مسمی غازیخان جو اولاد بڑے غازیخان سے باقی تھا۔ نواب ڈیرہ غازیخان بن کر انجام کار کرنے لگا۔[۵۱]

اس سے معلوم ہوا کہ غازیخان نہم نے گوجر حکومت کے ختم ہونے پر ہی ڈیرہ غازیخان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں احمد شاہ درّانی نے سندھ کے حاکم غلام شاہ خان کلہوڑہ کو ڈیرہ جات کا علاقہ دے دیا اس نے ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازیخان کا دورہ کیا۔ یہاں کا انتظام درست کیا یہاں کے متمرّد اور سرکش قسم کے سرداروں کو یرغمال بنایا اور انتظام ملکی و مالی کے لئے اپنے آدمی مقرر کر کے سندھ کو واپس لوٹ گیا۔

مگر غلام شاہ کے واپس لوٹتے ہی ان علاقوں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کا رئیس نصرت خان بلوچ پیش پیش تھا۔ اس کے اگلے سال غلام شاہ سے یہ علاقہ واپس لے کر سردار جہاں خان کے سپرد کر دیا گیا۔[۵۲] لیکن اسی سال ایک سکھ سردار ہری سنگھ نے ڈیرہ غازیخان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔[۵۳]

۱۷۶۹ء میں احمد شاہ درّانی نے ایک بار پھر ڈیرہ جات کی حکومت غلام شاہ کے حوالے کر دی۔ اور اس کے اگلے سال ۱۷۷۰ء (۱۱۸۴ھ) میں یہ علاقے غلام شاہ سے واپس لے کر اپنے ایک سردار جہان خان کے حوالے کر دیئے تھے۔

دیوان گردو رام کا قتل۔ ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں احمد شاہ نجیبہ ڈیرہ جات کو دوبارہ سندھ حکومت میں شامل کر دیا تو غلام شاہ کلہوڑہ نے اپنے

۵۱ گل بہار ص ۸۔ ۵۲ تاریخ پنجاب ص ۸۹۔ ۵۳ گل بہار ص ۸ تا ۱۰

معتمد دیوان گدو رام کو محصول کی وصولی کیلئے ان علاقوں میں بھیجا ساتھ ہی حکم دیا کہ اگر یہاں کے سردار ادائیگی میں تساہل کریں تو حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ جب وہ یہاں آیا تو غازیخان نہم نے محصول کی رقم اور زمام حکومت اس کے حوالے کر دی۔ اس وقت غازیخان کے لشکریوں نے تنخواہ کا مطالبہ کیا غازیخان نے ان سے کہا کہ اب وہ دیوان صاحب سے مطالبہ کریں چنانچہ ایک جمعدار نے دیوان گدو رام سے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کیا اور دوران گفتگو جمعدار نے دیوان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

غلام شاہ کا حملہ اور غازیخان کی گرفتاری :۔ دیوان گدو رام کے قتل کی خبر جب غلام شاہ کو ملی تو وہ فوراً ڈیرہ غازیخان پہنچ گیا اور رتت کے غازیخان اور دیگر چند سرداروں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ سندھ لے گیا۔ اور حیدرآباد کی جیل میں ڈال دیا ان سرداروں میں شفیع محمد شاہ، یار محمد شاہ، سردار محمد مسو خان نتکانی اور غازیخان کا بھتیجا گاموں خان شامل ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کو پھر ہیتو رام کی زبانی سنیئے۔ "اسی عرصہ میں زوال آبادی ملک کا ہو چلا۔ اور غازیخان موصوف بعد چند روز بسبب ہرا ہونے اولاد بڑے غازیخان کے ادائے مالیہ بادشاہی سے منحرف ہو گیا۔ جس پر بادشاہت خراسان سے پیغام بنام میاں غلام شاہ کلہوڑہ .... واسطے حصولی مالیہ نواب موصوف سے صادر ہوا کہ میاں صاحب ممدوح نے دیوان گدو رام وزیر اپنے کو مع افواج اوپر ڈیرہ غازیخان کے بھیجا۔ جب ڈیرہ غازیخان میں دیوان گدو رام پہنچا، نواب غازیخان تاب مقابلہ نہ لا کر علاقہ ڈیرہ مع مالیہ گزشتہ سپرد دیوان موصوف کے کیا۔ اسی عرصہ میں فوج نے تنخواہ ایام گزشتہ کی نواب موصوف سے مانگی۔ نواب نے طرف دیوان گدو رام اشارہ کیا۔ اس پر ایک شخص عظیم جمعدار بتقریب مانگنے تنخواہ کے نزدیک گدو رام کے گیا۔ اور بمجرد زبانی گفتگو کے گدو رام کو لگانے گولی بندوق سے مار ڈالا اور خود روبہ فرار ہو گیا، اور فوج میں بلوہ شروع ہوا۔ ... بفور وردد خبر ہذا میاں غلام شاہ صاحب والی سندھ خود بذات حیدرآباد سے سوار ہو کر ڈیرہ غازیخان میں تشریف لائے اور غازیخان کو مع چند کس سرداران ذیل شفیع شاہ، یار شاہ مسو خان نتکانی، گاموں خان برادر زادہ غازیخان گرفتار کر کے حیدرآباد لے گیا۔ کہ وہاں

حیدرآباد میں غازیخان فوت ہوا۔[۱]

اس موقع پر ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفر گڑھ کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔ یعنی حاجی خان اور غازیخان نامی سرداروں نے اس علاقہ پر ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) تک حکومت کی۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ غلام شاہ نے باقی سرداروں کو جلد یا بدیر رہا کر دیا تھا۔ مگر غازیخان نے قید کی حالت میں ۱۷۷۵ء میں قید حیات سے رہائی حاصل کی، اور حیدرآباد ہی میں دفن ہوا۔ جہاں پر ان کی قبر تا ہنوز موجود بیان کی جاتی ہے۔ اور اس پر قطعہ تاریخ وفات یہ لکھا ہے۔

چوں غازیخان زِ دنیا رفت محروم
مسافر بے وطن مرد است مظلوم
خرد تاریخ وئی گفت است بشنو
"ظفر جاہ بشماری اے یارِ معصوم"[۳]

لفظ "ظفر جاہ" سے غازیخان کا سن وفات ۱۱۸۹ھ نکلتا ہے اور یہی سن ہجری کتب تاریخ میں آیا ہے اور "معصوم" شاعر کا تخلص ہے۔ اس کا غازیخان کی عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ غازیخان آخر لاولد فوت ہوا تھا۔

میرانی دورِ حکومت پر ایک نظر : ڈیرہ غازیخان کے میرانی خاندان نے ۱۴۷۶ء سے ۱۷۶۹ء تک تین سو سال حکومت کی اور کم و بیش چودہ حکمران اس خاندان میں ہوئے اس قدر طویل عرصہ حکومت کرنے کے باوجود اس خاندان نے اپنے پیچھے ایسے کوئی تاریخی آثار نہیں چھوڑے جن سے کہ ان کے دورِ حکومت پر مفصل حالات مل سکتے۔

شہر ڈیرہ غازیخان :۔ شہر ڈیرہ غازیخان کو غازیخان اول نے ۱۴۸۴ء میں آباد کیا تھا اس سے قبل اس کے والد نے ڈیرہ حاجی خان کی بنیاد رکھی تھی چونکہ وہ تاریخ میں اپنا نام نہیں پا سکا اس لئے اس کے اوراق میں دب کر رہ گیا۔ بہرحال شہر ڈیرہ غازیخان دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر آباد تھا۔ جو اس کے رُخ بدلنے اور دو شاخوں میں بٹ جانے کی وجہ سے دریا کے درمیان میں آگیا تھا۔

[۱] گل بہار ص ۸ تا ۱۰ [۲] گزیٹیر مذکور ص — [۳] گل بہار ص ۱۰۔

اس شہر کے مشرق میں ایک "راجباہ" بنام نالہ کستوری بہتا تھا اور شہر کے مغربی جانب ایک بہت بڑا باغ تھا جو نو لکھا باغ کے نام سے مشہور تھا۔

مسجد خانوالی - یہ مسجد شہر کے عین وسط میں تھی اور غازیخان اول نے بنوائی تھی اس وقت اس پر پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس مسجد پر چینی کی عمدہ نقش کاری کی گئی تھی اور اس کے اندر مضبوط چوبی ستون تھے خوبصورتی میں یہ مسجد اپنی مثال آپ تھی

مقبرہ غازیخان - غازیخان اوّل نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں خود بنوایا تھا، یہ مقبرہ شہر کے مغرب میں دس میل کے فاصلہ پر آبادی چورہٹہ کے پاس تعمیر کرایا گیا۔ جو اب موجودہ شہر ڈیرہ غازیخان اور آبادی چورہٹہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ مقبرہ ملتانی رنگین ٹائل سے تعمیر کیا گیا تھا، اور مثمن شکل میں ہے اس پر ایک قبہ تھا جو گر چکا ہے۔ غازیخان کا مقبرہ اپنی تعمیر اور نفاست میں بہترین مقابر میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے اندر اس وقت گیارہ قبریں رکھی ہیں۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ قبریں میر رانی سرداروں کی ہیں۔ اس عمارت کو محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے اور اس پر ایک چوکیدار مقرر ہے۔ چوکیدار کا نام غلام عباس ہے۔ اور اس کا تعلق جاٹ کھچی خاندان سے ہے۔ اس کی موجودہ تنخواہ دو سو پچھتر روپے ماہوار ہے، آدمی خوش خلق اور ملنسار ہے۔

غازیخان کے مقبرہ میں ایک پلیٹ رکھی ہوئی ہے جس پر میر رانی خاندان کے قدیم سرداروں کے نام درج ہیں۔ اس تختی میں غازیخان آخر سے موجودہ دور تک جو سلسلہ نسب چلایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ تختی نجی طور سے رکھی گئی ہے۔ جس کا محکمہ آثار قدیمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا تاریخ سے کوئی تعلق ہے۔

روضہ پیر عادل صاحب :- روضہ پیر عادل صاحب میر رانی خاندان کے دوسرے غازیخان نے تعمیر کرایا تھا اور اس پر ایک لاکھ روپے خرچ ہوئے[1]

یہ روضہ ملتانی روغن دار ٹائل سے بنایا گیا ہے، بلند اور خوبصورت ہے۔ یہ روضہ موجودہ ڈیرہ غازیخان سے شمالی جانب بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی روضہ سے باہر غازیخان اول کی قبر ہے۔

[1] - تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۳۲۔

روضہ لعل عیسن کروڑ : روضہ لعل عیسن کروڑ موجودہ ضلع لیہ میں ہے۔ نہایت عمدہ اور عالیشان ہے۔ رنگین ملتانی ٹائل سے تعمیر ہوا ہے۔ اس روضہ کی تعمیر غازیخان ثالث، اسمٰعیل خان ثالث اور فتح خان نے کرائی تھی، چنانچہ تینوں سردار وہاں پر دفن ہیں۔ پہلے سردار کی قبر روضہ کے اندر اور باقی دونوں کی قبریں برآمدہ میں رکھی ہیں۔

نالہ کستوری :- غازیخان اوّل نے ایک "راجباہ" کے طور پر نالہ کستوری احداث کرایا تھا۔ جو شہر کے مشرقی جانب بہتا تھا۔ چونکہ اس نالہ میں مشک چھوڑتے وقت کستوری چھڑکی گئی تھی۔ اس لئے اس کا نام "نالہ کستوری" پڑ گیا۔ اس نالہ کے دونوں کناروں پر مثمر اور غیر مثمر درخت لگوائے گئے تھے۔ ان درختوں کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر ان درختوں کے ذریعے جا سکتا تھا گویا کہ ان کی شاخیں ایک دوسرے سے اس قدر ملی ہوئی تھیں۔ اس نالہ کی کھدائی پر دس ہزار روپے خرچ آئے تھے۔

نالہ مانکہ :- یہ نہر زمین کی سیرابی کی خاطر کھدوائی گئی تھی چونکہ اس نہر کے کھدوانے کا انتظام دیوان مانک رائے کو سونپا گیا تھا اور وہ غازیخان کا معتمد اور دیوان تھا اس لئے اس نہر کا نام مانکہ ہو گیا۔ یہ نہر زمانہ کے انقلابات سے بعد میں دیگر کئی مقامات پر لائی جاتی رہی۔ بالآخر نہر ڈیرہ غازیخان کے جاری ہو جانے کے بعد ۱۹۵۸ء سے نہر مانکہ بند کر دی گئی ہے۔ آخر میں تحفۃ الکرام کا سرزمین ڈیرہ غازیخان سے متعلق یہ بیان ملاحظہ ہو۔

"ڈیرہ غازیخان ایک آزاد ملک ہے اس میں تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار کنویں ہیں، جن سے کاشت ہوتی ہے۔ ہمیشہ جلیل القدر خوانین کے یہاں (مامور) ہونے کی وجہ سے یہ ملکوں میں مشہور رہا۔ ان دنوں یہ دوبارہ میاں غلام شاہ (کلہوڑہ) کے حوالے ہوا تھا۔ لیکن، بعض اسباب کی بنا پر شاہی دربار کی جانب سے میاں محمد نواز خان کے تصرف میں دے دیا گیا ہے[1]۔ اور سجان رائے نے مانکہ ملتان سے پانچ کوس مغرب کو دریا پار بلوچ قبیلے آباد ہیں۔ ان کے دو سردار ہیں۔ ایک جسے دودائی کہتے ہیں۔ تیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادوں کا حاکم ہے دوسرا ہوت ہے۔ جس کے زیر فرمان بیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے ہیں۔ سرحد پر دونوں میں جنگ آزمائی اور نزاع ہوتی رہتی ہے یہ سردار مقررہ خراج ادا کر کے اطاعت

[1] - تحفۃ الکرام ص ۳۸۰۔

شاہی کا ثبوت دیتے اور اپنی آزادی قائم رکھتے ہیں۔ دونوں کے وکیل ملتان میں رہتے ہیں۔ اور بادشاہ و صوبہ دار کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔

بلوچوں کے علاقے میں آبادی خوب ہے، دو فصلی کاشت سے بہت آمدنی ہوتی ہے۔ چور یا رہزن کا کھٹکا نہیں۔ مشہور ہے کہ سلطان علاؤ الدین ثانی کے عہد میں صوبہ ملتان اس کے تصرف سے نکل کر سلطان حسین لنگاہ کے قبضے میں آگیا تھا۔ ملتان کے فرمانروانے اپنے عہد حکومت میں کروڑ کوٹ سے "مان کوٹ" تک کا علاقہ ملک سہراب وغیرہ بلوچ سرداروں کی سربراہی میں دے دیا تھا۔ اکبر کے عہد میں راجہ ٹوڈر مل دیوان اعلیٰ نے ان بلوچوں کی سرداری برقرار رکھی، لیکن خراسان و ہند کی سرحد پر ایک مضبوط قلعہ اور مستحکم دیوار تعمیر کرا دی۔

ملتان سے جنوب میں بھکر کا متین و مستحکم قلعہ ہے .... بستی اور بھکر کے درمیان وسیع ریگستان ہے۔ جس میں تین مہینے بادِ سموم چلتی ہے، دریائے سندھ چند سال بعد رخ بدلتا رہتا ہے جس سے دیہات ویران ہو جاتے ہیں[۵]

۵۔ خلاصۃ التواریخ ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

موجودہ میرانی خاندان

اِس وقت میرانی خاندان کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ڈیرہ غازیخان میں دریائے سندھ کے کنارہ پر بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لیہ اور بھکر میں بھی یہ لوگ پائے جاتے ہیں۔ سندھ میں صاحب گوبھٹ میں بھی بتائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ خاندان جن کا تعلق میرانی بلوچوں سے ہے مظفرگڑھ اور بہاولپور میں ملتے ہیں۔ حکومت میں زوال آجانے کے بعد یہ لوگ قریبی علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے۔

شاہ محمد خان: قصبہ ریکڑہ تحصیل ڈیرہ غازیخان میں شاہ محمد خان ذکر کے قابل ہے۔ وہ اب عمر کے آخری حصہ میں ہے۔ اس خاندان کا بیان ہے کہ وہ جھنگ سے ترک سکونت کر کے یہاں چلا آیا تھا۔ دراصل یہ علی گوہر خان ولد گدائی خان کی اولاد سے ہیں جو کسی وقت یہاں سے جھنگ کو ترک سکونت کر گئے تھے۔ جیسا کہ اِس خاندان کے شجرۂ نسب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لوگ اپنے آپ کو علی گوہر خان پسر میر عالم خان سے منسوب کرنے لگے ہیں۔ جو درست نہیں ہے۔

شاہ محمد کا ایک بزرگ محمد حسین خان جھنگ سے واپس آکر ریکڑہ میں آباد ہوا تھا۔ شاہ محمد خان اس کی پانچویں پشت میں ہے۔ شاہ محمد خان کے لڑکوں میں غلام سرور خان سرور کربلائی کے تخلص سے سرائیکی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر ہے، اور سکول میں مدرس ہے خوش خلق اور ملنسار شخص ہے۔

محمد حسین خان کے ایک پوتے حاجی خان نے ۱۸۴۹ء میں قلعہ ملتان پر انگریزوں کی طرف سے سکھوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا اور محمد حسین کا ایک اور پوتا محمود خان اپنے وقت کا ایک اچھا طبیب تھا۔ محمود خان کا اصل وارث غلام حیدر خان تھا۔ اسے حکومت انگریزی نے پٹہ پر کچھ زمین بھی دے دی تھی اور وہ باپ کا پیشہ یعنی طبابت بھی اختیار کئے ہوئے تھا۔ غلام حیدر خان کے دو لڑکے تھے، غازیخان اور شاہ محمد خان۔ اوّل الذکر وفات پا چکا ہے۔ جبکہ شاہ محمد خان حین حیات ہے۔

احمد یار خان :۔ موضع کوٹلہ اسماعیل (شیخ) اور ماڑی کے بیانات محکمہ مال بندوبست قانونی ۱۸۷۲ء کے مطابق ہیبت خان میرانی وقت کے حاکم غازیخان کا پوتا تھا اور وہ غازیخان، غازیخان توریل (طریل) کے نام سے مشہور تھا۔ لفظ طریل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غازیخان پگڑی باندھتا تھا۔ اور پگڑی کا طرہ بلند رکھتا تھا جس کے باعث وہ غازیخان طریل مشہور ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غازیخان طریل چھٹا غازیخان تھا۔ بہرحال ہیبت خان کے چار لڑکے تھے عالم خان، فیروز خان، سلیم خان، اور مہرو خان۔

پہلے دو پسران کے حصہ میں کوٹلہ شیخ اسماعیل آیا۔ سلیم خان کو موضع ماڑی اور مہرو خان کو کوٹلہ مہرو خان ملا۔ فیروز خان نے کوٹلہ فیروز خان آباد کیا تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جو عالم خان کے لڑکے رشید احمد خان سے بیاہی گئی تھی اور فیروز خان لاولد فوت ہوا۔

ہیبت خان کے تیسرے لڑکے سلیم خان نے ماڑی پواہدی (شرقی) کے نام سے آباد کی تھی اور اس میں رہائش اپنی رکھی جہاں پر بدستور اس کی اولاد چلی آتی ہے۔ اور نمبردار بھی اسی خاندان میں ہوتے آرہے ہیں۔ اس وقت یہاں کا نمبردار محمد عالم خان ولد غلام حسن خان ہے۔ ماڑی پواہدی (شرقی) میں کسی وقت بعد میں میر عالم خان کی اولاد بھی آکر ٹھہری اور آباد ہوئی اس وقت یہاں کا ڈیرہ احمد یار خان پسر عبداللہ خان ہے۔ احمد یار خان کے دو لڑکے ہیں امیر عبداللہ خان اور امان اللہ خان دونوں گریجویٹ ہیں اور قانون کی ڈگریاں حاصل کر کے پیشہ وکالت اختیار کیا ہوا ہے۔ احمد یار خان بستی میرانی بیٹ لدسا میں رہتا ہے اس بستی کا دوسرا نام بستی جندو خان ہے۔

جندو خان پسر غلام حسن خان علاقہ گڑھ مہاراجہ سے ترک سکونت کر کے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ جہاں اس کی برادری کے لوگ آباد رہتے ہیں۔ جندو خان اپنے وقت کا مقدم تھا اور یہ منصب اس کی اولاد میں بدستور چلا آیا، جو بعد میں نمبرداری نظام میں منتقل ہو گیا اب اس خاندان میں ملازم حسین ولد غلام حیدر خان نمبردار ہے۔

۱۰

ڈیرہ غازیخان کی گوجر حکومت

سرزمین ڈیرہ غازیخان میں میرانی حکومت کے بعد جس مقامی خاندان کو اقتدار حاصل ہوا وہ یہاں کا گوجر خاندان ہے۔ اس خاندان میں صرف تیس ۳۰ سال حکومت رہی ہے اور تین حکمران ہوئے ہیں۔ گوجر قوم کی کوئی ایسی مستند اور مفصل تاریخ نظر سے نہیں گزری ہے۔ جس سے کہ اس قوم کا اصل مولد و مسکن معلوم ہو سکتا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم گجرات اور کچھ کاٹھیاواڑ کی اصل باشندہ ہے۔ جہاں سے اس قوم کے خاندان کسی زمانہ میں ترک سکونت کرکے پنجاب اور ڈیرہ غازیخان کی طرف چلے آئے تھے۔ پنجاب میں دو ایسے مقام ہیں جنہیں اس قبیلہ سے نسبت ہے یعنی گوجرانوالہ اور گجرات ان دونوں شہروں کو تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے اور یہ اس وقت پاکستان کے ضلعے ہیں۔ گوجرانوالہ اور گجرات کی تاریخ میں اس قوم کو جاٹ قبیلہ لکھا ہے۔ حیات افغانی نے بھی اس کی تائید کی ہے[1]

ٹاڈ صاحب لکھتے ہیں" یہ قوم سورج بنسی ہے جو سری رام چندر جی کے فرزند اکبر سری لوجی کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتی ہے گوجر قوم دھونڈار کے متعدد مقامات پر قابض و متصرف تھی ان کا بیت الحکومت راجوڑ واقع کلری کا پہاڑی قلعہ تھا.... قوم کچھواہیہ اس پر غالب آئی تو مقبوضات کو چھوڑ کر مجبوراً اسلام قبول کرنا پڑا" آگے چل کر لکھا ہے کہ یہ ایک قدیم قوم ہے اور چوپانی (مویشی پالنا) اس کا پیشہ ہے[2]

محمود خان گوجر

:۔ سرزمین ڈیرہ غازیخان پر گوجر حکومت کے بانی محمود خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یوسف نامی ایک شخص کا لڑکا تھا۔ اس کے دو بھائی احمد اور محمد تھے۔ یوسف خان فوت ہو گیا اور بچے یتیم ہو گئے۔ یوسف خان کی بیوہ نے اپنے بچوں کو پالا پوسا اور ان کی تربیت پر کڑی نظر رکھی اور انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ محمود خان تحصیل علم سے جب فارغ ہوا تو مخدوم صاحب سیت پور کے پاس چلا گیا۔ مخدوم صاحب سیت پور غازیخان ہشتم کا پیر و مرشد تھا۔ محمود خان نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔

[1] تاریخ اضلاع مذکورص ۱۷، ۱۸۱ حیات افغانی ص ۱۹ [2] ٹاڈ راجستان ج ۱ ص ۲۷۳، ۹۳۲

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ محمود خان گوجر غازیخان تک کس طرح پہنچا۔ قیاس غالب یہی ہے کہ غازیخان ہفتم نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کیلئے مخدوم صاحب سے کہہ کر اسے لے لیا ہو۔ بہرحال محمود خان غازیخان ہشتم کا اول اتالیق رہا بعد ازاں غازیخان ہفتم کی وفات کے بعد اپنے شاگرد غازیخان ہشتم کا میر منشی بنا اور پھر ترقی پاکر وزیر مملکت ہو گیا تھا۔

یہ ہم غازیخان ہشتم کے ذکر میں پڑھ آئے ہیں کہ وہ ایک عیاش اور شرابی قسم کا حکمران تھا۔ اور نالائق تھا چنانچہ تمام نظام مملکت اور انتظام ملکی کے جملہ اختیارات محمود خان گوجر کے ہاتھ میں تھے غازیخان مذکور صرف نام کا سردار رہ گیا تھا اور یہ بات کسی قدر تسلیم کے قابل ہے اور مانی گئی ہے۔ مگر محمود خان گوجر پر ایک بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دور وزارت میں غازیخان ہشتم کے خلاف جس کا وہ نمک خوار تھا سندھ کے حاکم غلام شاہ کلہوڑہ سے ساز باز کی اور ڈیرہ غازیخان پر حملہ کرا دیا۔ اس حملہ میں غازیخان گرفتار ہو کر قید کر لیا گیا اور حیدرآباد کی جیل میں اسی قید کی حالت میں فوت ہوا۔

اصل واقعات غازیخان ہشتم کے بیان میں آچکے ہیں یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے چونکہ محمود خان گوجر اور غلام شاہ ہم زمان نہیں تھے اس لئے یہ روایت صریحاً غلط اور بے بنیاد ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مؤرخین غازیخان ہشتم اور غازیخان آخر میں فرق نہیں پا سکے۔ جہاں سے ہر مؤرخ کو دھوکا ہوا ہے اور ان دونوں حاکموں کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں وہ کم و بیش ایک سی ہیں اس لئے ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ محمود خان گوجر کے خلاف ان روایات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ حیات افغانی کا یہ بیان پہلے گزر چکا ہے کہ ۱۷۲۶ء میں شاہ حسین غلزئی جب ڈیرہ غازیخان سے گزرا تو یہاں کے نادان بلوچوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے نقصان پہنچایا اس کی پاداش میں غلام شاہ کلہوڑہ نے غازیخان کے میرانی خاندان کو تباہ کر دیا اور بادشاہ دہلی کے حکم سے غازیخان کو حکومت سے ہٹا کر اس کے وزیر محمود خان گوجر کو یہاں کا حاکم بنا دیا۔

اس کے تیرہ سال بعد نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور واپسی پر ڈیرہ غازیخان کی حکومت وقت کے غازیخان سے لے کر محمود خان گوجر کے حوالے کر دی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے شاہ حسین غلزئی کے واپس چلے جانے کے بعد غازیخان (ہشتم)، نے محمود خان گوجر کو اقتدار سے ہٹا کر حکومت پر دوبارہ

[1] تاریخ ڈیرہ غازیخان ص ۲۶۸

قبضہ کرلیا تھا جب نادر شاہ یہاں آیا تو یہاں پر غازیخان حکمران تھا اس نے غازیخان سے حکومت لے کر دوبارہ محمود خان گوجر کے حوالے کردی۔ اس انتقال اقتدار کی بڑی وجہ غازیخان ہشتم کی ذاتی نااہلی اور عیش پرستی تھی۔

نادر شاہ چونکہ ایک جابر حکمران تھا اس نے دریائے سندھ کے مغربی ممالک کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اس لئے اس کی زندگی میں میرانیوں کو جرأت نہ ہو سکی کہ وہ محمود خان کو دوبارہ اقتدار سے ہٹا کر حکومت پر قبضہ کر لیتے اسی طرح نادر شاہ کے بعد ۱۷۴۸ء کو احمد شاہ درانی نے کابل و قندھار کی حکومت سنبھالی تو اس نے بھی محمود خان گوجر کی سند حکومت کی توثیق کردی اور ڈیرہ غازیخان کی حکومت پر انہیں بحال رکھا۔

الغرض نادر شاہ نے جب محمود خان کو سند حکومت دی تو جان نثار خان کا خطاب بخشا خود محمود خان گوجر نے اپنے لیے "خیر خان" کا خطاب اختیار کیا[1]

محمود خان گوجر کے متعلق عام خیال یہ بھی ہے کہ اس نے تیس ۳۰ سال تک حکومت کی تھی۔ مگر ہمارے خیال میں یہ بات بھی درست نہیں ہے یہ عرصہ مجموعی طور سے گوجر خاندان کا ہو سکتا ہے محمود خان کا اقتدار اگر ہم شاہ حسین غلزئی ۱۷۲۷ء سے شروع کریں تو کل بتیس ۳۲ سال ہوتے ہیں اور اگر گوجر حکومت کی ابتداء نادر شاہ ۱۷۳۹ء سے کی جائے تو عرصہ صرف بیس ۲۰ سال کا ہوتا ہے جبکہ گوجر خاندان کے آخری سردار برخوردار خان کا قتل ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا۔

بہرحال پہلی صورت میں محمود خان گوجر نے خود پچیس سال تک حکومت کی اور دوسرے لحاظ سے صرف تیرہ سال حکمران رہے۔ جبکہ اس کے جانشین صرف سات سال تک حکمران رہے۔

محمود خان کی دوغلی پالیسی

:- سابق تحصیل لیہ گزیٹر ضلع مظفر گڑھ میں ہے محمود خان گوجر نے اپنے لئے ایک دوغلی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ کبھی وہ ایک طرف سلطنت ایران و افغانستان کے ساتھ ہوتا تو کبھی دوسری طرف "حکومت پنجاب" کے ساتھ مل جاتا تھا۔ WAS PLAYING A DOUBLE GAME FOR HIS HAND.

ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان کا بیان ہے کہ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ دریائے سندھ کے مغرب کے علاقہ کو نہ توڑ سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب محمود خان گوجر جو کہ ڈیرہ غازیخان کا گورنر تھا اس کے لئے فروری

[1] گل بہار ص ۷، تذکرہ رؤسائے پنجاب ج ۔ ص ۵۱۵

ہوگیا کہ احمد شاہ کی اطاعت کرے یا کوڑا مل کی[1] معلوم ہوتا ہے احمد شاہ درانی کے دوسرے حملہ ۱۷۴۸ء کے بعد میر منو گورنر لاہور کے نائب ناظم راجہ کوڑا مل نے دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ ڈیرہ غازیخان کی حکومت سے جدا کر لیا تھا اس وقت محمود خان کے پاس صرف دریائے سندھ کا مغربی علاقہ باقی رہ گیا۔ اس روایت کی تصدیق میں یہ بیان آیا ہے کہ محمود خان گوجر اور اس کے بھتیجے برخوردار خان نے لیہ اور اس کے متعلقات میں حکومت نہیں کی اور وہ صرف ڈیرہ غازیخان کے حکمران رہتے ہیں[2]۔

لیہ تحصیل گزیٹر میں ہے کہ نہ ہی محمود خان گوجر اور نہ ہی برخوردار کی لیہ اور دریائے سندھ کے بائیں کنارہ پر حکمرانی تھی بلکہ وہ خالصتاً ڈیرہ غازیخان کے گورنر تھے

تحصیل لیہ گزیٹر کا بیان ہے کہ دس سال کے عرصہ کے بعد محمود خان گوجر کے جانشینوں کو اسی طرح بیدخل کر دیا گیا جس نے کہ ڈیرہ غازیخان کے میرانی خاندان سے حکومت حاصل کی تھی[3] نور احمد خان فریدی نے گوجر حکومت کے خاتمہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارہ سے متعلق سن کا تعین کیا ہے باقی روایتوں میں یہ بات نہیں لائی گئی ہے۔ غالباً فریدی صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ ڈیرہ غازیخان کی گوجر حکومت ان کے بیان کردہ ۱۷۶۸ء سے بہت پہلے ختم ہو گئی تھی۔

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمود خان گوجر کی دوغلی پالیسی نے گوجر حکومت کو تا دیر استحکام نہیں بخشا میں نے قلعہ محمود جب جا کر دیکھا تو حاجی خان پتافی نے مجھے بتایا کہ قلعہ محمود پر جب حملہ ہوا تو اس میں دو پتافی سردار بھی مارے گئے تھے۔ جن کی قبریں قلعہ محمود کے مشرقی جانب ایک کچی

[1] گزیٹر مذکور ص ۲۴۲ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ اسماعیل خان ص ۳۵
[3] گزیٹر مذکور ص ۲۴۳

چار دیواری میں شیشم کے درخت کے سایہ میں رکھی ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ قافلہ محمود اس روز سے تباہ ہو گیا اور محمود خان گوجر بھی اس طرف کبھی واپس نہ آیا۔

محمود خان کا آسنی پر حملہ: محمود خان گوجر کے دور کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں مل سکے ہیں اس کے عہد کا ایک اہم واقعہ آسنی پر حملہ ہے مگر اس میں اسے شکست فاش کھانا پڑی سردار عظمت خان دریشک کا دور تھا محمود خان نے دریشکوں کے صدر مقام آسنی پر حملہ کیا محمود خان کا سپہ سالار یکمن خان تھا وہ دریشکوں کے جوابی حملہ سے شکست کھا کر بھاگ گیا اور اپنا اسلحہ اور ہتھیار بھی نہ سنبھال سکا اور انہیں میدان جنگ میں چھوڑ گیا۔ دریشکوں نے اس حیلہ سازو سامان کو مالِ غنیمت سمجھ کر اس پر قبضہ کر لیا اور واپس نہ کیا

ستیو رام نے اپنے دور میں لکھا ہے کہ محمود خان گوجر کے لشکر سے چھینے ہوئے اس اسلحہ کی دریشک اب تک نمائش کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی بہادری کے اس کارنامہ پر فخر کرتے ہیں[1]

وفات۔ محمود خان گوجر کی وفات ۱۷۵۲ء میں ہوئی تھی مگر اس کی قبر کا نشان آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔ محمود خان گوجر کی اولاد میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا ذکر ملتا ہے۔ محمود خان کے بیٹوں میں ایک نواب اللہ داد خان تھا اس نے کوٹلہ داد آباد کیا تھا جو فاضل پور سے جنوب مشرق میں پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مگر اس وقت وہاں پر اس خاندان کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ اللہ داد خان خود سرزمین ڈیرہ غازیخان کو چھوڑ کر بہاولپور میں جا کر آباد ہوا اور احمد پور شرقیہ میں اس کی اولاد بتائی جاتی ہے۔

محمود خان کے دوسرے بیٹے فاضل خان نے قصبہ فاضل پور آباد کیا تھا جو تحصیل راجن پور کا ایک اہم قصبہ ہے یہاں پر بھی گوجر قوم کا کوئی فرد باقی نہیں ہے۔

محمود خان گوجر کی لڑکی غلام شاہ خان کلہوڑہ سے بیاہی گئی تھی جو " بھو بیگم " کے نام سے مشہور اور "مائی صاحب دولت" کے لقب سے ملقب تھی۔ سندھ کا آخری کلہوڑہ تاجدار میاں عبدالنبی جب بے دخل ہوا اور حاجی پور موجودہ ضلع راجن پور میں چلا آیا۔ تو مائی بھو بیگم اپنے بھائی نواب اللہ داد خان کے پاس احمد پور شرقیہ کو چلی گئی تھی۔

نور محمد خان گوجر۔ تواریخ ڈیرہ غازیخان میں ہے " بعد وفات نواب محمود خان کے نور محمد خان جانشین ہوا " اور دوسرے مقام پر ہے " در سنہ تخمیناً ۱۰ سال حکومت

---

[1] گل بہار ص ۱۸۴، ۱۸۵

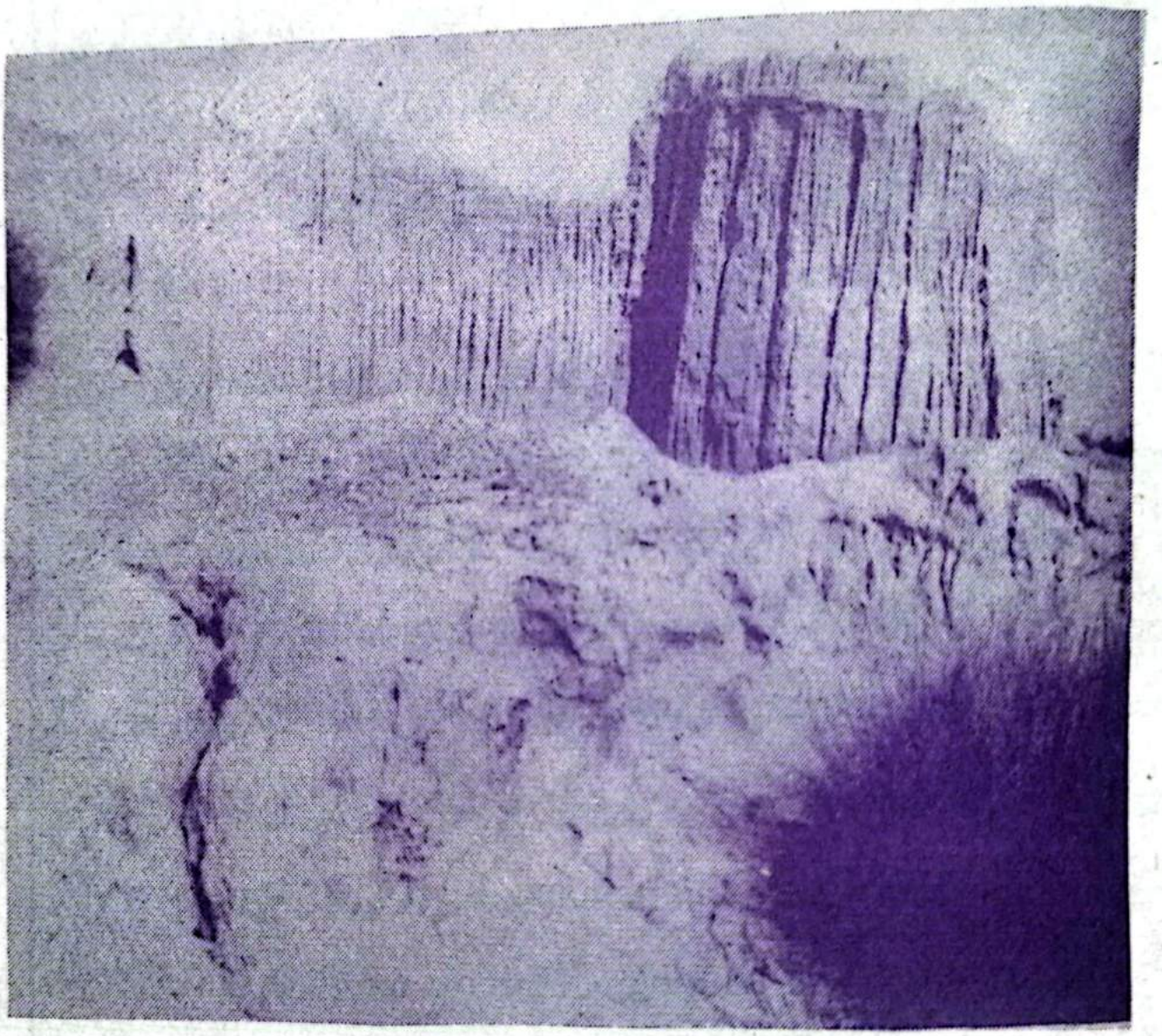

محمود کوٹ (قلعہ)

کر کے نواب محمود خان وفات پا گیا، اس کی جگہ برخوردار خان برادر زادہ متوفی جانشین ہوا۔ چار پانچ سال تک حاکم رہا پھر شاہ خراسان نے اپنے نواب بھیجنا شروع کئے[۱]

گل بہار کا بیان ہے" جب محمود خان فوت ہوا، بجائے اس کے نور محمد خان برادر، دبرخوردار خان بھتیجا اس کا، صوبہ داری ڈیرہ غازیخان پر قائم ہوئے[۲]

ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان، ڈیرہ اسماعیل خان اور مظفر گڑھ میں محمود خان کا جانشین اس کا بھتیجا برخوردار خان بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ محمود خان گوجر کے جانشینوں کو تقریباً دس سال بعد ہٹا دیا گیا[۳] غرضیکہ نور محمد خان گوجر اپنے بھائی محمود خان کی وفات کے بعد ڈیرہ غازیخان کا حکمران ہوا۔ نور محمد خان گوجر کے دور کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ احمد خان بزدار غازیخان ہشتم کے دربار میں کسی اعلیٰ عہدہ پر مامور تھا لیکن جب محمود خان گوجر نے زمام اقتدار سنبھالی تو احمد خان بزدار کو دربار سے نکال دیا۔

احمد خان بزدار کا ایک چچا درویش محمد خان مخدوم شیخ محمود سیت پور کا ملازم تھا احمد خان بھی اس کے پاس چلا گیا اور ملازمت اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں محمود خان گوجر فوت ہو گیا اور اس کا بھائی نور محمد خان ڈیرہ غازیخان کا حکمران ہوا۔ اس وقت احمد خان بزدار نے بلوچوں کی جمعیت لی اور ڈیرہ غازیخان پر حملہ کر دیا نور محمد خان گوجر شکست کھا گیا اور نواب بہاول پور اور اوچ کے مخدوم شیخ گنج بخش سے جا کر فوجی امداد حاصل کی اور ایک فوجی لشکر لے کر ڈیرہ غازیخان میں واپس آ گیا۔ احمد خان بزدار اور اس کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہوئی بالآخر احمد خان میدان جنگ میں مارا گیا احمد خان کے ساتھیوں میں علی محمد خان و فتح محمد خان پسران درویش محمد خان بزدار اور غلام حیدر خان ولد محمود خان بھی اس لڑائی میں کام آئے۔ احمد خان بزدار کے دو لڑکے تھے خان محمد خان اور گل محمد خان اور درویش محمد خان کا ایک لڑکا تھا جو کم سن تھا یہ تینوں اندر پہاڑ بھاگ گئے۔

نور محمد کا قتل :۔ یہ لوگ کچھ عرصہ کے بعد پہاڑ سے واپس لوٹے اور تمن گورچانی میں آ کر ٹھہرے اس وقت گورچانی سردار جلب خان تھا۔ جلب خان کی لڑکی سے خان محمد کا رشتہ اس کے باپ احمد خان بزدار کی زندگی میں قرار پا چکا تھا۔ چنانچہ سردار جلب خان نے اپنی لڑکی کا عقد نکاح خان محمد بزدار سے کر دیا اور خان محمد نے تمن گورچانی میں اپنی مستقل

---

[۱] کتاب مذکور ص ۹۶، ۳۶۸ [۲] گل بہار ص ۳۰۵ [۳] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اسمٰعیل خان ص ۶۹

سکونت رکھ لی۔

خان محمد بزدار اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کی غرض سے نور محمد خان گوجر کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ آخر کار ایک موقعہ پر نور محمد خان گوجر دورہ کرتا ہوا تمن گورچانی میں آیا، خان محمد خان بزدار نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور نور محمد خان گوجر پر حملہ کر دیا اور اس حملہ میں وہ مارا گیا۔ خان محمد خان بزدار اب اپنی جان کے خوف سے امیران سندھ کے پاس چلا گیا، خان محمد کے ہمراہ اس کا بھائی گل محمد خان اور چچازاد بھائی نور محمد خان تھے ان لوگوں نے امیران سندھ کے پاس جا کر ملازمت اختیار کر لی۔ اور وہ ڈیرہ غازیخان کو اس وقت لوٹے جب یہاں کے حالات بالکل بدل چکے تھے اور سکھا زور دار تسلط ما بین ہو رہی میں آ کر مقیم ہو گئے۔[1] غرضیکہ نور محمد خان گوجر نے پانچ سال تک حکومت کی اس کے بعد اس کا بیٹا برخوردار خان جانشین ہوا۔

برخوردار خان گوجر: برخوردار خان، گوجر خاندان کا تیسرا حکمران تھا اس نے تین سال کے قریب حکومت کی اس کے بعد سرزمین ڈیرہ غازیخان سے اس خاندان کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اور ایک بار پھر میرانی خاندان کا فرد غازیخان نہم (آخر) نام سے برسر اقتدار آگیا چنانچہ اس کا بیان میرانی خاندان کے ذکر میں آچکا ہے۔

برخوردار خان گوجر کے برسر اقتدار رہنے سے متعلق یہ روایت دوبارہ بیان کی جاتی ہے۔ بعد ازاں محمود خان گوجر نواب ڈیرہ غازیخان کا فوت ہو گیا۔ نواب برخوردار خان برادر زادہ نواب محمود خان مقرر ہو کر انجام ملک کرتا رہا۔ اس عرصہ میں برخوردار خان ایک مقدمہ خانہ جنگی میں مارا گیا بجائے اس کے ایک شخص مسمی غازیخان جو اولاد بڑے غازیخان سے باقی تھا۔ نواب ڈیرہ غازیخان بن کر انجام کار کرنے لگا۔[2]

برخوردار خان کا قتل: غلام رسول ڈاھا صاحب لکھتے ہیں "میاں عطر خان جب اپنے بھائی غلام شاہ خان سے جنگ اوباوڑہ ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں شکست کھا کر بھاگ گیا تو پہلے وہ بہاول پور پہنچا پھر ملتان گیا، ازاں بعد وہ برخوردار خان گوجر کے پاس چلا آیا برخوردار خان اسے ڈیرہ اسمٰعیل خان لے گیا۔ مگر ڈیرہ کے آس پاس کے لوگوں نے برخوردار خان کو قتل کر دیا چنانچہ عطر خان وہاں سے واپس لوٹا اور اختیار خان کے پاس بہاول پور پہنچ گیا۔[3]

[1] گل بہار ص ۳۰۵ [2] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ص ۶۶۶ [3] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ص ۳۱۱

نور احمد خان فریدی اور ایسے ہی دوسرے مؤرخین برخوردار خان کے قتل کا واقعہ ۱۷۶۹ء لکھتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ الغرض برخوردار خان نے تھوڑا عرصہ حکومت کی اور کسی ذاتی دشمنی کے باعث قتل ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی گوجر حکومت ختم ہو گئی۔

لیب سلطان احمدانی بزرگ کا ایک مقولہ زبان زد عام ہے۔ ؎

جیّئں وَہی تے ناں گجر دا پاڑ گِدھے ہی پناں
نہ کوئی گِھنسی ناں گجر دا تا قیامت تناں

یعنی جس بہی کھاتہ میں گوجر سردار کا نام لکھا تھا میں نے وہ ورق پھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اب قیامت تک اس کا نام کوئی بھی نہیں لے سکے گا۔

عام حالات: محمود خان گوجر ایک طاقتور اور قابل حکمران تھا۔ وہ ۱۷۲۶ء سے ۱۷۵۲ء تک کسی نہ کسی صورت میں ڈیرہ غازیخان کی حکومت سے منسلک رہا۔ پہلا دور اس کا وزارت عظمیٰ کا اور دوسرا گورنری کا تھا۔ تاہم پہلے دور میں بھی وہ با اختیار وزیر تھا۔ اس طرح اس نے پچیس ۲۵ سال تک حکومت کی۔ ملک کی آبادی اور ترقی میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔ کنویں کھدوائے اور نہریں جاری کیں اور لوگوں کو ادھلاپی (نصف محصول) پر زمین دے کر زراعت کو ترقی دی۔

بھاگسر کا سردار اور اجارہ دار اسلام خان ناہڑ چہارم، محمود خان گوجر کو نصف محصول ادا کرتا تھا اور یہی معاہدہ فریقین کے درمیان تھا۔

محمود کوٹ:۔ محمود خان گوجر نے ضلع مظفرگڑھ میں محمود کوٹ قائم کیا، اس میں اپنی فوج رکھی۔ اکثر اوقات خود بھی اس کوٹ (قلعہ) میں رہتا تھا۔ اس کے پاس ہی قصبہ گجرات اسی دور کا آباد کردہ ہے اور گوجر قوم نے اسے آباد کیا تھا مگر اس میں گوجر قوم کا کوئی فرد اس وقت آباد نہیں ہے۔ محمود کوٹ کی آبادی اس وقت انتہائی مختصر ہے۔ آبادی کے جنوب مشرق میں ریت کے ٹیلے پر ایک پرانے اور کچے قلعہ کے آثار سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ جو اپنے بانی کی سطوت رفتہ کی تاریخی حیثیت کی غماضی کرتے ہیں اور ہمارے لئے عبرت کا مقام بنے ہوئے ہیں۔ یہ کوٹ دوہری فصیل رکھتا ہے اور اپنے وقت کا ایک مضبوط کوٹ تھا۔

نور پور ۔ قصبہ نور پور جو ڈیرہ غازیخان شہر سے جنوب مشرقی جانب آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے اور ایک مختصر آبادی ہے نور محمد خان گوجر نے بنوایا تھا۔ کوٹ کی فصیل کے آثار بعض مقامات پر بدستور قائم ہیں۔

فاضل پور : محمود خان گوجر کے لڑکے نواب فاضل خان نے قصبہ فاضل پور آباد کیا تھا۔ یہ اچھی رونق کا قصبہ ہے۔ راجن پور سے پندرہ میل شمال کو شاہراہ پر واقع ہے۔

کوٹلہ داد : یہ آبادی محمود خان گوجر کے دوسرے لڑکے نواب اللہ داد خان نے قائم کی تھی کوٹلہ سے مراد گڑھی ہو سکتی ہے۔ جو کسی آبادی کی حفاظت کو بنائی گئی ہو یہ آبادی فاضل پور سے جنوب مشرق کو پانچ میل کے فاصلہ پر بیان کی جاتی ہے۔

کوٹ گوجر اور گجری : گوجر والا شہر ڈیرہ غازیخان سے تین میل شمال کو قدیم نہر مانکہ پر واقع ہے اور گوجر خاندان کا آباد کردہ ہے۔ اور کوٹ گوجر روز سوری کھوسہ پر اندر پہاڑ بارہ میل پر بتایا جاتا ہے۔ یہ اپنے وقت کا مضبوط کوٹ تھا۔ اب اس کے غالباً آثار باقی رہ گئے ہیں۔ اسی طرح قلعہ گجری، بہادر گڑھ سے جانب غرب سیمنٹ فیکٹری کو جانے والی سڑک پر موجود ہے۔ یہ بھی اپنے وقت کا ایک خام قلعہ تھا۔ اس کے بھی آثار باقی رہ گئے ہیں۔ اسی نام کی ایک آبادی فاضل پور کے مشرق میں دو میل کے فاصلہ پر اب بھی موجود ہے اور گجری کہلاتی ہے۔ اس آبادی میں گوجر خاندان کے چند کنبے رہتے ہیں۔ اس وقت یہاں کا وڈیرا اور نمبردار میاں غوث محمد ہے زیادہ با اخلاق اور مہمان نواز نہیں ہے ساٹھ سال سے زائد عمر کا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ محمد حسن خان نام کے ایک گوجر آدمی کی اولاد سے ہے۔ محمد حسن، محمود خان گوجر کا جدی اور رشتہ دار تھا۔

مسجد غلالے والی ۔ مسجد غلالے والی واقع شہر ڈیرہ غازیخان محمود خان گوجر نے زر کثیر خرچ کر کے بنوائی تھی۔ جو خانوالی مسجد کے بعد سب سے زیادہ خوبصورت اور نفیس تھی یہ مسجد قدیم شہر ڈیرہ غازیخان کے نقشہ میں پانچویں نمبر پر دکھائی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوجر خاندان کے خاتمہ کے ساتھ ہی یہ مسجد ویران ہو گئی تھی جسے بعد میں گلالے نام کے کسی پونگر نے دوبارہ آباد کیا اور وہ گلالے والی مسجد مشہور ہو گئی۔

مسجد چھٹہ خان والی ۔ یہ مسجد نواب چھٹہ خان گوجر نے سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں تعمیر کرائی تھی اور بہت خوبصورت تھی، سکھوں نے اسے اپنے دور میں گوردوارہ بنا لیا تھا۔ اور انگریزوں نے اسے واگزار کر کے دوبارہ مسلمانوں کے حوالہ کر دی تھی۔

تالاب سخی سرور : محمود خان گوجر نے سخی سرور میں ککی کے بائیں کنارہ پر ایک پختہ گچ دار تالاب بنوایا تھا۔ اس تالاب میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا، لوگ پیتے اور گھریلو استعمال میں لاتے تھے اس تالاب پر بارہ ہزار روپے خرچ آئے تھے یہ تالاب اب ویران پڑا ہے۔

نالہ جات : ۔ محمود خان گوجر نے ملک کی آبادی اور زراعت کی ترقی کیلئے بہت زیادہ کام کیا تھا۔ اسے زمینوں کی آبادی کا بڑا شوق تھا۔ ان کی سیرابی کیلئے اس نے متعدد کنویں کھدوائے اور نالے جاری کئے۔ نالہ صاحباں، نالہ دھنگانہ، نالہ قادرہ، نالہ سون نالہ دھندی، نالہ بشارت اور نالہ محمود خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں۔

اس کے بیٹے فاضل خان نے نالہ قادرہ کی شاخ، فاضل واہ اور نالہ قطب کی شاخ قطب واہ کھدوا کر فاضل پور اور کوٹلہ داد کی زمینوں کو آباد کیا تھا۔

محمود خان کے بھائی نور محمد خان نے نالہ نور، نالہ دھنگانہ کی شاخ نور واہ، نالہ اسلام کی شاخ، اسلام واہ، محمد واہ کی شاخ نور واہ نالہ پڑیہ کی شاخ نور واہ وغیرہ جاری کئے تھے۔ جبکہ نواب برخوردار خان گوجر نے نالہ قادرہ کی شاخ بھاگسر نکالی تھی[1]۔ ان جملہ نالہ جات میں سب سے پہلے نالہ بشارت سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) اور سب سے آخر میں نالہ سون سمت ۱۸۱۱ بکرمی (۱۷۵۵ء) کو مکمل ہوا۔

ان نالہ جات کی احداثی سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمود خان گوجر کا حکومت میں عمل دخل سنہ ۱۱۴۷ھ میں ہوا۔ اور گوجر خاندان کے آخری سردار برخوردار خان کے قتل سنہ ۱۱۷۹ھ سے قبل سنہ ۱۱۷۵ھ میں نالہ سون کھدوایا جا چکا تھا۔

---

[1] گلزار ابرار صفحات ۵۰، ۹۲، ۱۶۲ و تواریخ ڈیرہ غازی خان صفحات ۳۲، ۴۳، ۵۱۴، ۵۲۵

موجودہ گوجر خاندان :۔ مقامی گوجر خاندان کے لوگ بعض مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ بعض گوجر خاندان قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب سے یہاں چلے آئے تھے ان کا پیشہ بھینسیں پالنا اور دودھ فروشی ہے۔ اب ان میں کچھ نوجوان پڑھ لکھ کر ملازم ہو رہے ہیں۔

مقامی گوجروں میں بستی نصیر کے خاندان قابل ذکر ہیں۔ اسی خاندان کا ایک فرد جو پانچ پشتوں سے ترک سکونت کر کے تونسہ میں چلا آیا تھا۔ اس کی اولاد میں نور محمد خان گوجر ہے یہ ایک خوش اخلاق اور متین شخص ہے۔ خوش پوش اور صفائی پسند حد درجے کا واقع ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ اس کی تمام زندگی خواجہ غلام مرتضیٰ صاحب کی ہمنشینی اور صحبت میں گزری ہے۔ نور محمد خان کا ایک لڑکا عطا محمد خان مشہود جعفری صاحب تونسہ انٹر کالج میں اسلامیات کا لیکچرر ہے، اچھا اور سلجھا ہوا نوجوان ہے باپ کی طرح مؤدب اور با اخلاق ہے۔

مخادیم سیت پور کا عہدِ حکومت

سیت پور کے ناہڑ خاندان کے بیان میں کہا جا چکا ہے کہ راجن پور کا موجودہ ضلع اور شکار پور علاقہ سندھ اور مظفر گڑھ کی تحصیل علی پور پر مشتمل علاقہ پر ناہڑ لودھی کی حکومت تھی۔ جن کا ابتدائی صدر مقام سیت پور تھا۔ پھر غازیخان میرانی نے ان سے تحصیل جام پور کا علاقہ لے لیا اور باقی حصہ پر ناہڑ سردار برابر حکمران چلے آئے۔

مخدوم شیخ محمد حسن : ناہڑ سرداروں سے سیت پور کا علاقہ جس نے حاصل کیا وہ مخدوم شیخ محمد راجو ہیں شیخ محمد راجو یا راجن شاہ کے والد کا نام شیخ محمود تھا۔ جو شیخ محمد حسن کا بیٹا تھا اور شیخ محمد حسن کا ظاہری اور باطنی سلسلہ اوچ شریف کے بزرگ سید جلال الدین سرخ بخاری سے ملتا ہے۔

شیخ محمد حسن اوچ شریف سے اٹھ کر سیت پور میں چلے آئے تھے اور یہاں آ کر انہوں نے اپنی مستقل سکونت اختیار کر لی، اور پیشہ درویشی اختیار کیا۔ شیخ صاحب سیت پور میں جب آئے تو ملتان میں لنگاہ خاندان حکمران تھا۔ اور سیت پور ان کے زیر قبضہ تھا، چنانچہ لنگاہ خاندان آپ کا مرید ہو گیا۔ اور حاکم وقت نے شیخ محمد حسن سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی اور بہت سا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ اسی طرح سیت پور کے حاکم اسلام خان پنجم غالباً نے بھی شیخ محمد حسن کے دست پر بیعت کی اور مرید ہوا ان دو طاقتوں کے رشتہ نے مخدوم صاحب کی قوت میں سہ گنا اضافہ کر دیا اور ان کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔

شیخ محمود اوّل :۔ شیخ محمد حسن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شیخ محمود جانشین ہوا اور باپ کی طرح پیشہ فقیری و درویشی اختیار کیا اور اپنے اثر و رسوخ میں کچھ اور اضافہ کیا۔ لالہ ہتو رام بیان کرتے ہیں کہ "ریاست مردم ناہڑ کی سست ہو گئی مخدوم صاحب شیخ محمود متوطن سیت پور جو پہلے زمانہ میں امیر ریاست مردم ناہڑ کا تھا اور فقیر خاندان سے تھا غلبہ پاتا ہوا بعضے بعضے قطعات ملک ریاست ناہڑ پر قابض ہو گیا"[1]

---

[1] گل بہار ص ۸۷

شیخ محمد راجو اوّل : شیخ محمد راجو (راجن) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے نادر شاہ افشار کے دور میں بڑا اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اور ایک معتبر دولت و ثروت جمع کر لی۔ اور اپنے اثر اور ذاتی قابلیت کے باعث نادر شاہ سے سیت پور کی حکومت کا پروانہ اپنے نام لکھوا لیا تھا اور ناہڑوں کو وہاں سے بیدخل کر دیا۔[1]

شیخ محمد راجو کی قوت کا اندازہ ان حالات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں جب غازیخان ہفتم نے مغلیہ سلطنت کے خلاف بغاوت کا عَلم بلند کیا تو سیت پور کا مخدوم شیخ محمد راجو آٹھ ہزار کا لشکر لے کر باغیوں کی حمایت پر آ موجود ہوا تھا۔ اس وقت شاہی لشکر کی قیادت شہزادہ معز الدین کے ہاتھ میں تھی اور بہاول پور کے داؤد پوترے اس کے ساتھ تھے۔ چنانچہ سیت پور اور جلال پور پیر والہ کے سیّدوں نے اپنی بہادری کے خوب جوہر دکھائے اور حرم شاہی کی سواری کو اس وقت سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ ایسے ہی دوسری بار جب غازیخان کے بیٹوں صاحب خان اور شاہ محمد خان نے حکومت دہلی کے خلاف بغاوت کی تو اس وقت بھی سیت پور کے یہ سادات ان کے حامی تھے اور ان کی طرف سے شاہی لشکر سے لڑے تھے۔

غرضیکہ سیت پور کے مخادیم کی حکومت اس وقت کوٹلہ مغلاں (علاقہ جام پور) سے جنوب کو سباگسر اور عمرکوٹ تک اور مشرق میں موجودہ تحصیل علی پور تک تا حدِ دریائے چناب تھی۔[2] سنہ ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کے آخر میں جب نادر شاہ نے شیخ صادق کے قتل کا بدلہ لینے کی غرض سے داؤد پوتروں پر چڑھائی کی اور اپنے سپہ سالار طہماسپ جلائیر کو ان کے خلاف مہم پر بھیجا۔ اور اس نے سندھ پہنچ کر شکارپور اور کیلو پر قبضہ کر لیا۔ یہ دونوں علاقے داؤد پوتروں کے پاس تھے پھر اس نے داؤد پوتروں کے دوسرے گروہوں کو سزا دینے کیلئے ڈیرہ غازیخان کا رخ کیا کیونکہ اس وقت محمد پور دیوان (ضلع راجن پور) کا علاقہ داؤد پوتروں کی حکومت میں تھا۔ طہماسپ جب اس طرف آیا تو سیت پور کا مخدوم شیخ محمد راجو، ملتان کا نواب مرزا مومن خان اور ڈیرہ غازیخان کا مستاجر جان نثار خان (محمود خان گوجر) وغیرہ سردار اس کے پاس پہنچے اور اس کے مؤقف کی تائید کی۔[3]

شیخ محمد کیمیا نظر اور شیخ محمود دوم : شیخ محمد راجو کا ایک لڑکا شیخ محمد کیمیا نظر تھا۔ اگرچہ ان کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ تاہم قیاس غالب

[1] ریاست بہاولپور گزیٹیر ص ۴۱۶ [2] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۱۰۰ [3] تاریخ سندھ عہدِ کلہوڑہ ج ۵ ص ۴۸۲

ہے کہ وہ اپنے وقت کے کیمیا نظر فرد تھے۔ لوگوں کی ظاہری نہ سہی باطنی تربیت بہرحال کرتے تھے۔ شیخ محمد کیمیا نظر کے پانچ لڑکے تھے۔ ان میں شیخ محمود بڑا تھا اور صاحبِ اولاد بھی تھا جبکہ اس کے باقی چار بھائی لاولد فوت ہوئے۔ احمد خان اور درویش محمد خان نزداسی شیخ محمود کے درباری تھے۔ اور درویش محمد خان نے انہیں کے حکم سے نالہ دھندی اور قطب واہ کھدوائے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ محمود دوم نے ناہڑوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا کافی علاقہ ہتھیا لیا تھا۔[1]

رَدُ سائے پنجاب میں ہے کہ ۱۷۷۲ء میں جب حاجی محمد شریف سدوزئی سے کہا گیا کہ وہ ملتان پر حملہ کرے۔ اس وقت نواب مظفر خان، بہاول پور کے امیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور سکھوں کی طرف سے ملتان پر قبضہ کر لیا، اس کے پانچ سال بعد نواب مظفر خان نے نواب بہاول خان سے کہا کہ اب وہ ملتان پر حملہ کر کے اسے اپنی قلمرو میں ملا لے۔ اور اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب نواب مظفر خان، ریاست بہاولپور کو چھوڑ کر سیت پور کے مخدوم شیخ محمود کے بھائی شیخ حامد کے پاس چلا آیا اور سیاسی پناہ لی۔ اور ۱۷۷۹ء تک وہ برابر سیت پور کے مخدوم کے پاس بیٹھا رہا۔[2]

شیخ محمد راجو دوم : مؤرخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ محمد راجو اول کے جانشین زیادہ طاقتور نہ تھے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ ان کے پہلو میں بہاول پور کی ایک مضبوط اور طاقتور حکومت پہلے سے جڑ پکڑ چکی تھی۔ جو اپنی ریاست کو برابر وسعت دے رہے تھے۔ اور وہ شروع سے مخادیم سیت پور کے مخالف تھے چنانچہ سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں نواب بہاولپور نے ناہڑوں کے بچے کھچے علاقے علی پور اور شہر سلطان کے درمیان "ٹھڈوالہ" تک حاصل کر لئے تھے اور اسی سال شیخ محمد راجو ثانی سے بیٹ ڈومے لیا اور سنہ ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) میں نواب بہاول خان ثانی نے اسی مخدوم سے جتوئی کا علاقہ چھین لیا۔ اور ۱۷۹۰ء میں دریائے سندھ نے کروٹ لی اور سیت پور اس کے بائیں کنارہ پر چلا گیا تو نواب بہاول پور نے اس وقت بڑی آسانی سے علی پور، شہر سلطان اور خیرپور سادات وغیرہ علاقے مخادیم سیت پور سے لے لیئے۔[3] اسی طرح مخادیم سیت پور کی یہ ریاست، بہاول پور کا جزو بدن بن گئی۔ ایک روایت سے

[1] گل بہار ص ۸۷، ۸۵ [2] کتاب مذکور ذکر خاندان سدوزئی ص — [3] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۲۶۳

معلوم ہوتا ہے کہ اوچ شریف کا خطہ سادات سیت پور کے پاس باقی رہ گیا تھا ۱۸۱۶ء میں جب رنجیت سنگھ نے جھنگ کی مسلمان ریاست پر ہاتھ ڈالا، تو وہاں کا نواب احمد خان سیال بھاگ کر نواب مظفر خان کے پاس ملتان میں آگیا۔ رنجیت سنگھ نے آگے بڑھ کر لیہ اور بھکر کے نواب حافظ احمد خان سدوزئی سے نذرانہ وصول کیا اور پھر اوچ کو چلا گیا۔ اوچ سیدوں سے لے کر اپنے ایک سردار فتح سنگھ اہلو والیہ کے سپرد کر دیا۔[1] غرضیکہ سادات سیت پور کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد مخادیم سیت پور صرف جاگیردار بن کر رہ گئے اور پھر وہی مُصلّا، تسبیح اور اللہ اللہ و خیر صلا۔

شیخ محمود سوم :۔ شیخ محمد راجو دوم کا لڑکا شیخ محمود ثالث تھا۔ جو ایک جاگیردار تھا اور سیت پور میں رہتا تھا وہ عیاش قسم کا شخص تھا۔ جس میں اپنے بزرگوں کے اوصاف کم جاگیردارانہ کی صفات زیادہ تھیں چنانچہ لالہ حکم چند کے دور ۱۸۷۵ء میں وہ زندہ تھا۔ ہتھو رام نے لکھا ہے "شیخ محمود اولاد شیخ محمد راجو سیت پور میں رہتا ہے اس وقت مختیار ان کا اس علاقہ (راجن پور) میں انتظام وصولی بچھ (محصول پیداوار) وغیرہ کرتا ہے۔ ... مخدوم صاحب حال اگرچہ عقلمند ہے لیکن سست مزاج و عیاش سُنا جاتا ہے۔ اپنی ملکیت کی خبر گیری کم رکھتا ہے۔"[2]

مخدوم شیخ محمد شاہ :۔ شیخ محمود ثالث کے دو لڑکے تھے۔ شیخ محمد حسن اور شیخ محمد راجو ثالث۔ شیخ محمد راجو لاولد فوت ہوا تھا۔ اور شیخ محمد حسن کے چھ لڑکے تھے خود ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں وفات پائی ان میں سے میری ملاقات شیخ محمد شاہ سے ہوئی تھی یہ اپریل ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ شیخ محمد ایک بھاری بھرکم سانولے رنگ کا پنتالیس سالہ جوان ہے۔ اندازِ گفتگو اچھا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں وہ صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے مداح خواہوں میں سے ہے۔ مہمان نوازی کے انداز سے بالکل کورا ہے۔ اس نے دور دراز علاقہ ڈیرہ غازیخان سے آئے ہوئے مسافر سے رواج کے مطابق کھانے پینے سے متعلق پوچھا تک نہیں۔ گو کہ اسے معلوم ہوا کہ میں اس سے اس کے بزرگوں کے حالات لینے کی غرض سے یہاں پہنچا ہوں۔ بزرگوں کے حالات سے بھی اسے کوئی واقفیت اور اُنسیت نہیں ہے۔ بہرحال کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرتے وقت اس سے اجنبیت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

عام حالات : مخادیم سیت پور کے حالات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کس طرح درویشی

۱؎ تاریخ پنجاب ص ۱۳۲۔ ۲؎۔ تاریخ پنجاب ص ۱۳۲۔

سے بادشاہی تک پہنچے تھے۔ اور پھر فقری اور جاگیرداری کی طرف کس شان سے پلٹ آئے ان کی نشستگاہیں شاہانہ اور مقابر درویشانہ طرز تعمیر کی بے مثال عمارات میں سے ہیں۔ مقابر میں نہایت سادگی اور جاذبیت پائی جاتی ہے، وہ گنبد یا قبہ کی بجائے مستطیل شکل کا ایک سیدھا سادہ محل تعمیر کرتے ہیں اور یہ گزشتہ دور کی تعمیرات ہیں جو دیکھ بھال اور مرمت نہ ہونے کی وجہ سے نہایت بوسیدہ اور شکستہ ہو چکی ہیں۔ انہیں عمارات میں ایک مسجد دیکھی گئی جو ویران پڑی تھی محلہ داروں نے جو کمنگر مشہور ہیں اس مسجد کی دوبارہ مرمت کی اور پھر سے اسے آباد کیا۔ اس پر کتبہ تاریخ مرمت ۱۹۶۲ء درج ہے اور نبی بخش کمنگر نے اسے مرمت کرایا تھا۔

گزشتہ مخادیم سیت پور کو ملک کی آبادی اور زرعی ترقی کا خاص خیال تھا۔ انہوں نے زمینوں کی سیرابی اور ملک کی آبادی کیلئے نالہ دھندی، قطب اور نالہ قادرہ احداث کرائے تھے۔ آس پاس کے لوگوں کو ادھلاپی (نصف محصول) پر زمینیں دیں اور ان لوگوں کو آباد کیا۔ خصوصاً شیخ محمد راجو اول اور ثانی نے ملک کی ترقی اور فروغ پر پوری توجہ دی تھی۔[1]

راجن پور۔ شیخ محمد راجن (راجو) اول نے ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں قصبہ راجن پور اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اول تحصیل کا صدر مقام، ضلع ڈیرہ غازیخان کا سب ڈویژن اور اب ضلع بن چکا ہے۔ یہ شہر نسبتاً صاف ستھرا، خوبصورت اور بارونق ہے، اور باغات کا گھر ہے۔

۱؎۔ تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۱۰۹۔

اجارہ دار کوٹ مٹھن

قاضی نور محمد: ۔ قاضی نور محمد کوٹ مٹھن کے مشہور و معروف روحانی پیشوا اور قاضی عاقل محمد صاحب کا بھائی تھا ان کے بزرگ قاضی محمد شریف قصبہ منگلوٹ ضلع ملتان سے ترک سکونت کر کے کوٹ مٹھن چلے آئے تھے اور یہاں آکر اپنی سکونت رکھ لی۔

قاضی نور محمد کو ملک داری کا شوق تھا اور انہوں نے ناہڑ سردار اسلام خان چہارم کے بعد علاقہ کوٹ مٹھن کا اجارہ تیمور شاہ والی کابل سے لے لیا اور قاضی واہ کھدوا کر اس علاقے کی سیرابی کا سامان پیدا کیا۔ قاضی صاحب نے یہ علاقہ ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۳ء) میں لیا تھا۔ مگر اسے اس ٹھیکہ سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اور وہ مقررہ رقم بھی ادا نہ کر سکا جس کے باعث قاضی نور محمد کو قید کا منہ دیکھنا پڑا، اس زمانہ میں حکومت خراسان کی طرف سے ڈیرہ غازیخان کا ناظم جمعہ خان تھا۔ چونکہ قاضی نور محمد کی ذمہ داری ان کے بھائی قاضی عاقل محمد نے اٹھائی تھی۔ اس لئے جمعہ خان نے انہیں بھی جیل بھیج دیا۔

چنانچہ اس واقعہ کو مناقب المحبوبین میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "وقتی قاضی نور محمد کو ریحہ برادر حقیقی قاضی صاحب عاقل محمد جیو، چند دیہات از نواب جمعہ خان خراسانی کہ صوبہ دار ڈیرہ غازیخان بود۔ از جانب سلاطین خراسان اجارہ گرفتہ بود۔ و قاضی صاحب مرحوم ضامن او شدہ بود، چوں در اجارۂ وی خسارہ افتاد و مبلغان وصول نشدند آں مردک قاضی صاحب عاقل محمد جی و برادر ایشاں را گرفتار نمودہ محبوس کرد۔

چوں چند روز گزشت و حال بر ایشاں تنگ شد، و ایشاں تن برضا و تسلیم سپردہ بودند۔ خطی بجانب پیر بھائی خود جناب حافظ صاحب محمد جمال ملتانی بنا بر طلب او نشاں نوشتہ فرستاد"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حافظ محمد جمال صاحب ملتانی جمعہ خان ناظم ڈیرہ غازیخان کے پاس آئے اور قاضی برادران کی قید سے رہائی چاہی۔ مگر وہ نہ مانا حافظ صاحب نے اسے بد دعا دی جس کے باعث جمعہ خان کے پیٹ میں مروڑ پیدا ہوئی اور اس وقت وہ گھبرا کر

[1] ۔ مناقب المحبوبین ص ۱۲۴-۱۲۵۔

قاضی عاقل محمد اور قاضی نور محمد کے پاس آیا اور انھیں رہا کر دیا تاہم اس بد دعا کا اثر برابر باقی رہا جمعہ خان ابھی گھر تک پہنچا ہی تھا کہ پیٹ کے اس درد سے مر گیا۔ چنانچہ آگے لکھا ہے۔ "آن مردود (جمعہ خان) ہماں وقت ایشاں (قاضی برادران) را خلاص ساخت، قاضی صاحب بخانہ خود آمد و نواب از ان درد فوت شد" اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی نور محمد نے اس روز سے علاقہ کوٹ مٹھن کا اجارہ ختم کر دیا۔

اولاد: ۔ قاضی نور محمد کے دو لڑکے تھے قاضی ابوالخیر اور قاضی کمال الدین۔ اول الذکر غالباً لاولد فوت ہوئے تھے جبکہ ثانی الذکر کے تین پسر ہوئے۔ مولانا غلام جہانیاں کی تصنیف ہفت اقطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی نور محمد کی اولاد میں سے ایک شخص قاضی نور محمد ثانی زندہ باقی تھا۔ لیکن اب معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں اور اس کی اولاد کیا ہوئی۔

خواجہ غلام فرید صاحب کے دربار کے جنوب میں واقع دربار پر میں گیا اس وقت وہاں پر حافظ محمد بخش ولد مولوی نجم الدین صاحب بیٹھے بچوں کو درس دے رہے تھے یہ بچے قرآن مجید حفظ کر رہے تھے۔ اور چند قرات کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مولوی صاحب ایک بوریئے پر بیٹھے تھے۔ وہ سفید ریش بزرگ خوش شکل، خوش لباس اور خوش اخلاق انسان تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے احترام سے اپنے پاس بٹھایا، رواج کے مطابق حال پوچھا اور چائے پانی سے تواضع کی، میں اس کے حسن اخلاق سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ ایک عالی ظرف [illegible] بزرگ تھے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے ہی بزرگ مسند درس و تدریس پر ہوں، تو قوم کے نونہال یقیناً دیہاتی ملا [illegible] نہیں بلکہ خود دار اور بلند ہمت [illegible] شہری پیدا ہوں۔ مگر ایسے لوگوں کی اول تو کمی ہے۔ اور اگر وہ کہیں پر موجود بھی ہیں تو ان کے باوقار رزق کا انتظام ہمارے معاشرہ میں نہیں ہے۔

بہرحال قاضی نور محمد صاحب کی اولاد کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی بتایا کہ آپ کی اولاد خیرپور سادات کے پاس بستی یارے والی میں یا پھر ملتان کے قدیم قصبہ منگلوٹ میں

ہو گی جہاں سے قاضی محمد شریف صاحب ترک سکونت کر کے یہاں چلے آئے تھے۔ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے اس دربار میں دیکھا ہے جہاں کا ذکر کیا جا رہا ہے اس میں تین قبریں رکھی ہوئی ہیں۔ جن میں ایک مزار جو سب کے مغرب میں ہے ایک تحریر شدہ پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا۔ مزار قاضی نور محمد بن میاں محمد شریف صاحب۔ یہی قاضی نور محمد صاحب کی قبر ہو سکتی ہے واللہ اعلم۔

قاضی واہ : قاضی نور محمد نے اپنے دورِ اجارہ داری کوٹ مٹھن کے وقت زمینوں کی سیرابی اور آبپاشی کے لئے ایک واہ کھدوایا تھا۔ جو قاضی واہ کہلاتا تھا۔ یہ واہ موضع ونگ کے شمال مشرقی جانب دریائے سندھ سے نکالا گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد وہ بند ہو گیا۔ پھر انہوں نے یہ واہ نالہ قادرہ سے نکالا اور وہ بھی بند ہو گیا، اور ایک سیلابی نہر بن کر رہ گیا۔ جو طغیانی موسم میں جاری ہوتا تھا۔ اور باقی سارا سال خشک رہتا تھا۔ بالآخر زیادہ توجہ نہ ہونے کے باعث قاضی واہ مستقل طور سے بند ہو گیا۔ اب اس نام کے سوا نشان تک نہیں ملتا قاضی واہ سے اس وقت موضع ونگ، لبتی محب علی، کوٹ مٹھن، کوٹلہ حسن شاہ اور موضع قادرہ سیراب ہوتے تھے[1]

---

[1] گل بہار ص ۸، ۱۵، ۹۳۔ تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۸۴

ہڑند و داجل بروہی دور میں

بروہی :- لفظ بروہی دو لفظوں سے مرکب ہے یعنی روہ (پہاڑ) اور نسبتی یائے معروف (ی) اور اس میں (ب) زائد ہے۔ چنانچہ اس کے معنی پہاڑی قبیلہ کے ہوئے۔

خان اعظم میر احمد یار خان بروہی سابق والئ قلات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ان کے بزرگ جب قلات میں آئے تو ان کا سردار میر قنبر تھا جس کے نام پر قنبرانی بروہی مشہور ہوئے مگر کسی تاریخی کتاب سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ لفظ بروہی کی کچھ اور توجیہات بھی کی گئی ہیں جن میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔ البتہ ایک روایت جس میں کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔ چونکہ بعض بلوچ قبائل اپنے مقامات کی نسبت سے مشہور ہو گئے ہیں جیسے دشت سے دشتی، کلاچ سے کلاچی۔ لغلان سے لغلانی، ڈومبک سے ڈومبکی اور بگٹ سے بگٹی وغیرہ۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ مقام برہی سے یہ قبیلہ بروہی مشہور ہو گیا ہے۔ چنانچہ مقام برہی کی نشاندہی اس روایت میں کی گئی ہے یعنی ایک مہینہ کے بعد جب دماغ ٹھکانے ہوا اور شہر پناہ کی مرمت کا کام ختم ہوا تو قلات پر چڑھائی کا خیال پیدا ہوا اور سوار ہو گئے مقام برہی میں اترے تھے۔۔۔۔ جونہی قلات پہنچے ویسے ہی اس پر حملہ کر دیا اور بڑی سخت لڑائی کے بعد قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور قلعہ ہمارے سپرد کر دیا۔ یہ قلعہ ذوالنون ارغون نے مقیم کو بخش دیا تھا۔ مقیم کے آدمیوں نے بھی امان طلب کی اور ان کے قصور معاف ہوئے۔۔۔ لیکن جب قلعہ فتح ہوا اور میں نے اسے جہانگیر مرزا اور جغانیانی کو دینا چاہا تو دونوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ناچار قلات کو وہیں کے لوگوں کے سپرد کر کے کابل لوٹ آئے اور یہ چڑھائی بیکار گئی۔[1]

میر احمد خان عبرت کدہ سندھ کا مصنف لکھتا ہے کہ بروہیوں میں خصوصاً شاہی خاندان کا بیان ہے کہ وہ حلب سے یہاں آئے۔

---

[1] تزک بابری ص ۹۹۔

ہتو رام بیان کرتے ہیں میر احمد نامی ایک سردار مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے کرمان حلب میں چلا آیا تھا کچھ عرصہ بعد وہاں سے نقل مکانی کی اور سیستان میں پہنچ گیا پھر یہاں سے بھی کوچ کیا اور بلوچستان میں چلا آیا اور آباد ہو گیا۔ اس وقت قلات میں میر چاکر خان رند کی طرف سے "میر مندو" حاکم تھا اور خود میر چاکر پنجاب میں آیا ہوا تھا۔ میر احمد بروہی نے میر مندو پر حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا اور قلات پر خود قابض ہو گیا۔ مگر اخوند محمد صدیق میر احمد کی بجائے "میر بجار" کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے میر مندو کو قتل کیا اور قلات کی حکومت خود سنبھال لی۔ بہرحال میر احمد خان نے تیس سال تک حکومت کی اور دارِ فانی سے کوچ کیا۔

میر عبداللہ خان: میر احمد خان کے بعد اس کا بیٹا میر محراب خان جانشین ہوا اور ۱۱۰۷ھ میں میاں یار محمد خان کلہوڑہ کے ساتھ ایک لڑائی میں اپنی فوج کی طرف سے آئے تیر سے مارا گیا شہنشاہ اورنگ زیب نے میر محراب کے اس طرح مارے جانے کے عوض میں کراچی اور کور کے علاقے بروہی سردار کی تحویل میں دے دیئے تھے۔ یہ علاقے اس روز سے (ار) میر نصیر خان (خان اعظم)، کے دور تک بروہی حکومت کے پاس چلے آئے۔ میر محراب خان کی وصیت تھی کہ اس کے بعد اس کا بھتیجا میر سمندر خان حاکمِ قلات ہو، اور ایسا ہی ہوا۔ اور وہ سولہ سال تک حکومت کر کے فوت ہوا۔

میر سمندر خان کی وفات کے بعد وزیر مملکت قلات اخوند محمد صالح نے میر محراب خان کے بیٹے میر احمد خان ثانی کو وارث تاج و تخت ریاست قلات بنایا، اور اس کے دوسرے بیٹے میر عبداللہ خان کو کوئٹہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ میر عبداللہ خان نے چار سال کوئٹہ میں گزارے لیکن ایک روز اچانک قلات پہنچ گیا اور اپنے بڑے بھائی میر احمد خان کو گرفتار کر کے قلات پر قابض ہو گیا اس وقت اس نے اپنے لئے "ہزبر بیشۂ شجاعت" اور "شاہین کوہ" کا لقب اختیار کیا۔

میر عبداللہ خان کا حملہ ڈیرہ غازیخان: شاہ محمد خان میرانی اپنے بھائی غازیخان کے دستِ تظلم سے تنگ تھا اس نے میر عبداللہ خان بروہی کے پاس جا کر فریاد کی اور دست بستہ ہو کر کہا میری عزت کی لاج رکھیئے اور مجھے میرے بھائی کے ظلم سے نجات دلایئے۔ چنانچہ میر عبداللہ خان

اپنا لاؤ لشکر لے کر سرزمین ڈیرہ غازیخان میں لے آئے اور شاہ محمد کی مدد کر کے اسے بھائی کے مظالم سے نجات دلائی۔ اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ "شخصی از حاکم ڈیرہ غازیخان صوبہ پنجاب کہ قرابتی بحاکم ڈیرہ داشت۔ از دستِ تطاول آں اِستغاثی نزد میر عبداللہ خان آمد و گفت کہ ننگ مرا بکن از آنجا کہ میر عبداللہ خان ہزبر بیشۂ شجاعت بود از شنیدنِ ایں سخن ننگ او دامنگر دیدہ بمعہ افواج سرایان و جبلایان طے نمودہ وارد ملک ڈیرہ گردید۔ و شہر ڈیرہ را لغارت رسانیدہ در آنجا مسکن پذیر گردید"

مہر غلام رسول اس واقعہ کے متعلق میجر رابرٹ لیچ صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "میر عبداللہ نے ڈیرہ غازیخان میں کئی گاؤں جلائے۔ خوب مال لوٹا اور قیدی بنائے اور اخوند محمد صدیق کا بیان نقل کرتے ہیں" عبداللہ خان نے وہاں (ڈیرہ غازیخان)، ڈیرے ڈال دیئے اور واپسی کیلئے تیار نہ تھا۔ اخوند محمد صالح وزیر اور سرداروں نے بہت سمجھایا کہ بیگانے ملک میں بیٹھنا خلاف مصلحت ہے۔ عبداللہ خان نے ایک نہ سنی، آخر سردار اسے زبردستی واپس لے گئے[۲] بہرکیف میر عبداللہ خان نے بیس سال تک حکومت کی اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

خان اعظم میر نصیر خان: میر عبداللہ خان کے تین لڑکے تھے۔ میر محبت خان، میر التاز خان اور میر نصیر خان۔ پہلا لڑکا جنگال بیوی سے اور دوسرے دو بی بی مریم التازئی کے بطن سے ہوئے تھے اخوند محمد صالح نے میر محبت خان کو قلات کی حکومت دی اور مستونگ میر التاز کے حوالے کیا اس اثناء میں نادر شاہ قندھار کا بادشاہ ہوا اور اس نے میر محبت خان کی حکومت کو تسلیم کر لیا جبکہ میر نصیر خان اور ان کی والدہ کو یرغمال میں لے لیا گیا۔ ایک روز میر نصیر خان اور میر التاز خان میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے میں التاز خان مارا گیا۔

اسی اثنا میں نادر شاہ کی جگہ احمد شاہ درّانی نے کابل و قندھار کی حکومت سنبھالی اور بروہیوں نے نصیر خان کیلئے قلات کی حکومت کا مطالبہ کیا اور کہا میر محبت خان کی جگہ میر نصیر خان کو قلات کا حکمران بنایا جائے۔ چنانچہ احمد شاہ نے اپنے ایک سردار تاماس بیگ کو قلات بھیج کر میر محبت خان کو تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ میر نصیر خان کو خلعت حکومت پہنا دیا گیا یہ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) کا واقعہ ہے۔

[۱] تاریخ بلوچستان ص ۱۸۵۔ [۲] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ص ۳۸۸

ہگمس صاحب کا بیان ہے کہ نادر شاہ نے میر نصیر خان کو بھیج دیا کہ وہ اپنے بھائی محبت خان کو اقتدار سے ہٹائے چنانچہ میر نصیر خان نے اسے تلوار کے زور سے قلات کی حکومت سے علیحدہ کیا اور یہ خوشخبری نادر شاہ کو قندھار بھیجی اس وقت نادر شاہ نے نصیر خان کو بیگلر بیگ (خان اعظم) کا خطاب عطا کیا۔[1]

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ میر نصیر خان بروہی نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے خلاف لڑائی میں احمد شاہ درانی کے ساتھ پانی پت کے میدان میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بدلہ میں احمد شاہ نے میر نصیر خان کو ہڑند و داجل کا علاقہ سونپ دیا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر نصیر خان نے پانی پت کی اس لڑائی میں اپنی بلوچی روایات کی بے مثال نظیر پیش کی اور بہادری کے جوہر دکھائے، لیکن ہڑند و داجل کا علاقہ اس خدمت کے عوض نہیں دیا گیا تھا۔ اس علاقہ کی سپردگی کا واقعہ یہ ہے۔ ایک مغل سردار علی مردان خان جو کہ قلعہ ترشش میں احمد شاہ درانی کا مدت سے مخالف چلا آرہا تھا اور اس سے زیر نہیں ہوتا تھا۔ احمد شاہ نے اس کے زیر کرنے کے لئے میر نصیر خان کی خدمات حاصل کیں اور اسے بلا کر علی مردان پر حملہ آور ہونے کو کہا چنانچہ خان اعظم نے علی مردان کو شکست دی اور قلعہ ترشش فتح کر لیا اور قلعہ کی چابیاں لا کر احمد شاہ کے حوالے کیں۔ اس وقت احمد شاہ درانی نے میر نصیر خان بروہی کو انعامات سے نوازا اور ہڑند و داجل کے علاقہ کا پروانہ لکھ دیا اس وقت میر نصیر خان نے اس علاقہ پر قبضہ کر کے ریاست قلات میں شامل کر لیا۔

چنانچہ اصل روایت یہ ہے " درحد ملک مشہد کہ آنرا ترشش می نامند۔ بر علی مردان نام بادشاہ مغل صد بار پیشتر لشکر خود را فرستاد، قشونات بادشاہ ہزیمت خوردہ واپس می آمدند بعد ازاں چیرہ خلعت سرفرازی خان والا شان را طلب، خان بمعہ تمامی عساکرات براہوی و بلوچ چنانچہ تمام سراوان و جھلاوان و تمام جمیع بلوچ را برداشتہ آوردہ حاضر حضور شوند۔ پس ازاں جناب خانصاحب جمع آوری لشکر خود نمودہ روانہ شدہ، بمعہ عساکرات خود مشرف حضور پادشاہ درمکان مشہد مقدس شد۔ ۔ ۔ و شاہ امر فرمود کہ میر نصیر خان و سردار جہان خان فوفلزی بمقدمہ علی مردان بروند پس خانصاحب بنائی جنگ کرد ۔ ۔ ۔ ۔ بفضل حق تعالیٰ جل شانہٗ لشکر مغل را ہزیمت دادند۔ و خانصاحب بر دشمن معاند ظفر و فتحیاب ۔ ۔ ۔ ۔ پس پادشاہ از دوئی

[1] ۔ دا گنیٹر آف بلوچستان ص ۱۸۵۔

مہربانی کمال خانصاحب وا خوند و سرداران سراوان و جھلاوان و بلوچ را بہ خلعت فاخرہ سرفراز و ممتاز فرمود ۔ ۔ ۔ ۔ و ملک ارنڈ (ہڑند) و داؤد جال یعنی داجل را رقم کردہ بخانصاحب بخشید ۔ ۔ ۔ ۔ درسنہ یازدہ صد ہشتاد و چہار بود (۱۱۸۴ھ) و بعد از چندے پادشاہ خانصاحب را جہت جنگ مرہٹہ طلب فرمود"۔[1]

یہاں ۱۱۸۴ھ درست نہیں یہ واقعہ قلعہ ترشش کی فتح کا ہے جو عیسوی لحاظ سے ۱۷۵۴ء بنتا ہے اور ہڑند و داجل کی سپردگی کا دور بھی یہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ پانی پت کی لڑائی ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی۔

میر نصیر خان بروہی مرہٹوں کے خلاف پانی پت کے میدان میں احمد شاہ درانی کے ہمراہ تھا وہاں اس نے اپنی بہادری کا جو مظاہرہ کیا۔ لالہ ہتو رام سے سنیئے " بادشاہ ثانی (احمد شاہ) چیرہ خلعت بہ سرفرازی خانصاحب وا خوند فرستاد۔ و خانصاحب را امر فرمود، چنانچہ تمام سراوان و جھلاوان و بلوچ وا تمام زئی ۔ ۔ ۔ ۔ روانہ شد۔ با تجمل کلاں در ملک کلات پنجاب رفتہ بخدمت پادشاہ مشرف گشت۔ و از انجا پادشاہ تحرک ورزیدہ طے منازل نمودہ بحد دہلی رسیدند جنگ عظیم مابین شاہ واقع گردید۔ چنانچہ درانیاں پسپا شدند۔ پس خانصاحب را پادشاہ طلب فرمود و گفت کہ قندھار و کلات دور ماندند، در جنگ ہمت باید ۔ ۔ ۔ ۔ پس خانصاحب بہ فرمودۂ پادشاہ رفتہ جنگ نمود۔ وقت شام درانیاں ہمہ واپس در اردوئی شاہ آمدند۔ و جناب خانصاحب در مکان حرب ماند۔ چنانچہ اسپ سواری خود خانصاحب نیز تفنگ زخمی شد۔ ۔ ۔ ۔ خبر بشاہ رسید۔ پس شاہ دو مرتبہ آدم بطرف خانصاحب فرستاد و خانصاحب بر دمان پادشاہ جواب داد کہ جائے حرب گاہ را گزاشتہ نخواہم داد ۔ ۔ ۔ ۔ باز فردا علی الصباح افواج طرفین مستعد جنگ شدند۔ پس حق تعالیٰ جل شانہٗ احمد شاہ پادشاہ غازی را فتح داد۔ و لشکر کفار ہزیمت خورد"۔[2]

بندر کی بلا طویلے کے سر: خان اعظم میر نصیر خان جب قلات کا حکمران ہوا تو افغان لوگ اس پر زیادہ حجت کرنے لگے۔ چنانچہ افغانوں کا مالی اور جانی نقصان ہوتا اور اس کے وہ خود ہی مرتکب ہوتے لیکن بروہیوں کے سر تھوپ دیتے تھے اور میر نصیر خان کے پاس جا کر فریادی

[1] ۔ تاریخ بلوچستان ص ۱۹۵۔ [2] ایضاً ص ۱۹۶۔

ہوتے اور کہتے کہ ہمارا یہ نقصان بروہیوں نے کیا ہے اسے پورا کر دیجئے۔ یہاں تک کہ ان کے آدمی طبعی موت مرجاتے تو انہیں اٹھا کر لاتے اور میر صاحب کے آگے ڈال دیتے اور کہتے ہمارا یہ آدمی بروہیوں نے مارا ہے دیت دلایئے۔ چنانچہ میر صاحب ان کی جائز و ناجائز حق رسی کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس واقعہ کو تاریخ بلوچستان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے "بعد ازاں ہرچہ نقصان مالی و جانی از قوم براہوی می رسید بقوم افاغنہ پس آمدہ در حضور خان والا شان استغاثہ می نمود پس خان ذیشان عوض مال آنہا و دیت خون آنہا از خودی داد۔ بدیں وجہ آموخت کردند کہ کدام افغان بمرگ خودی مرد۔ ہم میت خود را آوردہ بدروازہ خانصاحب آوردہ استغاثہ می نمود۔ و می گفتند کہ ایں افغان مارا براہوی ہا کشتہ اند و از ادب پادشاہ دیت ناحق را بہ افغان می داد[1]"۔

غرضیکہ میر نصیر خان، خان اعظم نے تنتیس ۳۳ سال حکومت کی اور بمقام گنجابہ وفات پائی۔

مسٹر ہگس نے میر صاحب کی تاریخ وفات ۱۷۹۵ء لکھی ہے

میر محمود خان:- میر نصیر خان کے تین لڑکے تھے۔ میر محمود خان، میر مصطفیٰ خان اور میر رحیم خان پہلے دونوں لڑکے عینی بھائی اور آخری ان کا اخیانی بھائی تھا[2]۔ اس وقت ہڑند و داجل کی حکومت پر قلات کی طرف سے ناظم مامور ہوکر آتے تھے۔ ان دنوں یہاں کا ناظم حیدر خان تھا۔

میر نصیر خان کی وفات پر اخوند ملا فتح محمد خان بھاگ ناڑی سے چل کر فوراً گنجابہ پہنچا اور میر محمود خان کے سر پر تخت شاہی رکھا۔ لیکن میر بہرام خان پسر میر حاجی خان نے جو میر محبت خان کا نواسہ تھا۔ نئے امیر کو صغیر السن پا کر علاقہ کچھی پر قبضہ کر لیا۔ میر محمود خان نے محراب خان شہوانی کو شاہ زمان درانی کے پاس بھیج کر فوج طلب کرلی اس نے وزیر شیر محمد خان کو دو ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ فریقین میں دہنہ ڈھاڈر میں جنگ ہوئی، جس میں میر بہرام خان شکست کھا کر سندھ کو بھاگ گیا۔ ان ایام میں زمان شاہ نے وزیر فتح خان کے والد پائندہ خان کو بے گناہ قتل کر دیا تھا۔ اور فتح خان اس سے جدا ہو کر ایران کو چلا گیا۔ اس اثنا میں زمان شاہ کے بھائی محمود شاہ نے ہرات پر قبضہ کر لیا جس کے باعث بھائیوں میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ بالآخر محمود شاہ غالب آکر کابل کا بادشاہ

[1] تاریخ بلوچستان ص ۱۹۲ [2] عینی بھائی جن کا باپ اور ماں ایک ہو اخیانی بھائی جن کا باپ جدا اور ماں ایک ہو۔ علاتی بھائی جن کا باپ ایک اور ماں جدا ہو۔

بن گیا اب محمود شاہ کا اپنے اخیانی بھائی شاہ شجاع سے مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں میر محمود خان بروہی نے محمود شاہ درانی کی حمایت کی اور شاہ شجاع شکست کھا کر پنجاب کو بھاگ آیا۔

مسٹر ہگس کا بیان ہے کہ اس موقع پر محمود شاہ نے بروہی سردار کو "خان اعظم" کا خطاب دیا اور دیگر انعامات سے نوازا۔

محمود شاہ درانی دو مرتبہ ڈیرہ غازیخان اور ملتان کے دورہ پر آیا، میر محمود خان بروہی بھی اس کے ساتھ تھا۔ ۱۲۲۴ھ میں میر محمود خان نے اپنے عینی بھائی میر مصطفیٰ خان کو خلعت پہنایا اور کچھی اور گنجابہ کی حکومت تفویض کی، مگر اس کے تھوڑا عرصہ بعد اس کے اخیانی بھائی میر رحیم خان نے میر مصطفیٰ خان کو قتل کر دیا۔ جبکہ وہ شکار اور سیر و تفریح میں مصروف تھا۔ خود میر رحیم خان سندھ کو بھاگ گیا۔ اور وہاں سے ہڑند پہنچا اور یہاں کے صوبہ دار جو کہ داجل میں رہتا تھا حیدر خان[1] کو بیدخل کر دیا اور ہڑند و داجل پر خود قابض ہو گیا۔

غرضیکہ اس کے کچھ عرصہ بعد جب میر رحیم خان اندر بہار علاقہ کچھی میں گیا تو وہاں پر پہلے سے منتظر میر سرفراز خان اور میر احمد یار خان پسران میر مصطفیٰ خان نے میر رحیم خان پر حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میر محمود خان دین پناہ کے مزار پر۔ میر محمود خان جب دوسری بار ملتان اور ڈیرہ غازیخان آیا تو سنگھڑ (تونسہ تحصیل) کے مشہور بزرگ دین پناہؒ صاحب کے مزار پر حاضری دی۔ عقیدت کے پھول چڑھائے اور فاتحہ پڑھی۔ الغرض میر محمود خان بروہی نے چوبیس سال حکومت کر کے ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۶ء) میں انتقال کیا اور قلات میں دفن ہوئے۔

میر محراب خان۔ میر محراب خان باپ کی وفات کے بعد والی قلات ہوئے۔ مگر اہالیان ریاست پر لطف و کرم کی بجائے ظلم و ستم کو رواج دیا۔ احمد یار خان پسر بہرام خان اور سرفراز خان پسر مصطفیٰ خان کو ایک ہی دن میں قتل کرا دیا۔ امرا میں سے مہر اللہ خان رئیسانی سردار اور قادر بخش خان زہری کو مروا ڈالا اور خدمتگاروں میں سے ملا عبدالرحمٰن اور ملا داد محمد کی بے گناہ جان لی۔ اس ظلم و ستم اور جور و جفا کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے اور ملک میں رہزنی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو گیا۔ ہڑند اور داجل کا علاقہ جو میر نصیر خان کے وقت سے ریاست قلات کا ایک حصہ

[1] حیدر خان کا تعلق غالباً بلوچوں کے کورو قبیلہ سے تھا وہ پانی پت کی لڑائی میں شریک تھا اور اب ہڑند و داجل کا گورنر تھا۔

چلا آرہا تھا سکھوں کے قبضہ میں چلا گیا اور اس کا دوبارہ اِلحاق ڈیرہ غازیخاں سے کر دیا گیا۔

ان دنوں والی قلات کی طرف سے ہڑند و داجل کا ناظم محمد شریف نامی ایک شخص تھا۔ عبرت کدہ سندھ کے بیان کے مطابق وہ رنجیت سنگھ سے مل گیا تھا اور اس سے ساز باز کر کے علاقہ اس کے سپرد کر دیا۔ ہڑند و داجل کی حدود اس وقت کوٹ طاہر تک تھیں۔[1]

تاریخ پنجاب کا بیان ہے کہ رنجیت سنگھ کے حکم سے نواب بہاول پور نے ۱۸۲۷ء میں ہڑند و داجل کو فتح کر کے ڈیرہ غازیخان میں شامل کر لیا۔ میر محراب خان کو اگرچہ اپنے ملک کی اندرونی شورشوں سے فرصت نہ مل سکی تاہم اس نے ہڑند و داجل کی بحالی کی غرض سے رنجیت سنگھ کے پاس چند بیش بہا بلوچی گھوڑے نذرانہ کے طور پر بھیجے اور اس علاقہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ مگر اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ بہر حال ۱۸۳۹ء میں میر محراب خان اور انگریزوں کے درمیان بلوچستان میں ایک لڑائی ہوئی جس میں وہ جامِ شہادت پی کر فوت ہو گیا۔ اِس کے بعد مختلف سردار والی قلات ہوئے اسی دوران میں بلوچستان ایجنسی قائم کی گئی اور اس میں انگریزوں کی طرف سے ایک ایجنٹ کا تقرر کر دیا گیا۔ بالآخر انگریز بہادر یہاں سے چلا گیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اور ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے جملہ صوبوں اور ریاستوں کو ایک اکائی میں منسلک کر کے وفاق قائم کیا گیا جو ون یونٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت میر احمد یار خان قلات کا امیر تھا ۱۹۷۷ء میں ان کی وفات ہوئی، وہ اس وقت صوبہ بلوچستان کے گورنر تھے۔ اب ان کی اولاد میں میر داؤد خان دستار بندِ خانِ اعظم ہے۔ میر داؤد خان کا ایک بھائی میر محی الدین خان بلوچ اس وقت وفاقی وزیر مملکت ہے اور وزیر مواصلات کا اس کے پاس قلمدان ہے۔

---

[1] عبرت کدہ سندھ ص ۱۲۶۔ کتاب مذکور ص ۱۵۲

ڈیرہ غازیخان دُرّانی عہدِ حکومت میں

جیسا کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ احمد شاہ دُرّانی نے ۱۷۶۹ء میں ڈیرہ غازیخان کی حکومت سندھ کے حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے سپرد کر دی تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غلام شاہ نے اپنے ایک معتمد سردار گدو رام کو محصول کی وصولی کیلئے فوج دے کر ڈیرہ غازیخاں بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ گزشتہ سال سے رکا ہوا محصول لے اور ڈیرہ غازیخان کی حکومت بھی اپنی تحویل میں لے لے۔

غازیخان آخر نے اگرچہ مالیہ اور حکومت گدو رام کے حوالے کر دی تھی لیکن اس کے ایک جمعدار کی گستاخی اور گدو رام کے قتل کی پاداش میں غلام شاہ خان، غازیخان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ سندھ لے گیا اور اس روز سے شاہانِ دُرّانی کی طرف سے براہِ راست کابل سے گورنر یہاں پر بھیجے جانے لگے۔

احمد شاہ دُرّانی - احمد شاہ اپنے ایک مورث کی نسبت سے ابدالی مشہور چلا آتا تھا اس کی پیدائش ملتان میں ہونا بیان کی جاتی ہے اور اس کے نام پر ابدالی روڈ مشہور ہے۔ ابدالی روڈ پر ایک محراب بنا دی گئی ہے۔ جس پر احمد شاہ کی پیدائش کا کتبہ نقش ہے۔ احمد شاہ کا خاندان ابدال پسر ترین افغان کی نسبت سے ابدالی کہلاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے بعض لوگ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں کابل سے ترک سکونت کر کے ملتان چلے آئے تھے۔ سدو خان پسر عمر خان کی اولاد سدوزئی مشہور ہو گئی تھی، چنانچہ سدو خان کے لڑکوں میں خواجہ خضر بڑا تھا اور اس کی اولاد خضر خیل کہلاتی ہے۔ احمد شاہ ابدالی کا خاندان اسی خضر خیل سدوزئی شاخ سے تھا۔ احمد شاہ کے باپ کا نام زمان خان ہے۔

۱۷۴۷ء میں وہ نادر شاہ کے لشکر میں تھا۔ نادر شاہ جب اپنے ایک لشکری کے ہاتھوں گولی لگنے سے مارا گیا اور یہ رات کا وقت تھا احمد شاہ نے اپنے قبیلے کے تین ہزار آدمی لے کر تمام رات نادر کے خیمہ و خرگاہ کی حفاظت کرتا رہا۔ اور ساری رات جاگ کر کاٹی۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو احمد شاہ نے قوم افشار اور قزلباش سے ایک زبردست مقابلہ کیا اور ان

غلبہ پانے کے بعد نادر شاہ کا تمام مال و متاع سمیٹا اور قندھار کو چلا گیا اور حکومت کا انتظام سنبھالا۔

احمد شاہ ابدالی نے اپنے ایک پیر و مرشد صابر شاہ کے حکم سے اپنے لئے دُرِّ دَوراں کا لقب اختیار کیا۔ اور اس کا خاندان درانی مشہور ہو گیا۔ افغانوں میں یہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت افغانیہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور ملک خراسان لفظ افغانستان میں بدل گیا ابتدا میں اس نے قندھار کو پایۂ تخت بنایا تھا اور بعد میں اسے کابل میں منتقل کر لیا چنانچہ کابل کا انتظام درست کر کے اس نے پنجاب کا رخ کیا۔

احمد شاہ کا پنجاب پر پہلا حملہ: احمد شاہ نے پنجاب پر آٹھ حملے کئے تھے ان میں سے پہلا حملہ سنہ ۱۷۴۸ء کا ہے۔ اس وقت لاہور کا گورنر حیات اللہ خان الملقب بہ شہنواز خان تھا اور سلطنت دہلی کی طرف سے متعین تھا۔ احمد شاہ کے لاہور پہنچتے ہی شہنواز خان دہلی کو بھاگ گیا احمد شاہ نے اپنی طرف سے اس وقت دیوان لکھپت رائے کو لاہور کی حکومت سونپ دی تھی۔ اور خود دہلی کو روانہ ہو گیا لیکن سرہند کے پاس احمد شاہ نے بادشاہ دہلی کی فوجوں سے شکست کھائی اور کابل کو واپس لوٹ آیا۔

دوسرا حملہ: اب بادشاہ دہلی نے وزیر مملکت قمرالدین خان کے لڑکے میر معین الملک مشہور میر منو کو خطاب نوابی دے کر لاہور بھیج دیا تھا۔ احمد شاہ نے دوسرا حملہ سنہ ۱۷۴۹ء میں کیا اس وقت میر منو نے احمد شاہ سے صلح کر لی اور اسے چار اضلاع سیالکوٹ، گجرات، اورنگ آباد اور پسرور کی آمدنی دینا منظور کر لیا۔ ان اضلاع کی آمدنی نادر شاہ کے وقت حکومت قندھار کو دی جاتی تھی۔ چنانچہ احمد شاہ نے میر منو کو اس کے عہدہ پر بحال رکھا۔ اور لاہور اس کے حوالے کر کے وطن کو واپس چلا گیا۔

تیسرا حملہ: احمد شاہ درانی کا تیسرا حملہ سنہ ۱۷۵۲ء کا ہے اس وقت میر منو کی طرف سے ملتان کا نائب ناظم کوڑا مل تھا۔ میر منو نے کوڑا مل کو لاہور میں بلا بھیجا اور اس کی جگہ خواجہ اسحاق کو ملتان کا نائب ناظم بنا دیا۔ احمد شاہ کے اس حملہ میں راجہ کوڑا مل لاہور میں مارا گیا اور میر منو نے پھر صلح کر لی۔ اور صوبہ لاہور پر بدستور بحال رہا۔[۲]

اس دفعہ احمد شاہ نے بادشاہ دہلی محمد شاہ پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے محمد شاہ کی لڑکی سے اپنی شادی کر لی اور اپنے بیٹے تیمور سے محمد شاہ کی پوتی

[۱] حیات افغانی ص ۶۹۔ [۲] تاریخ پنجاب ص ۶۴۳، م ۶۔

صبیحہ بیگم کا عقد نکاح کرا دیا اور پچاس لاکھ روپے نقد، چند زنجیر ہاتھی اور گھوڑے لے کر احمد شاہ درانی کابل کو چلا گیا۔ احمد شاہ درانی نے اب کوڑا مل کی جگہ علی محمد خان خاکوانی کو ملتان کا ناظم بنا دیا۔[۱]

[۱] نواب علی محمد خان خاکوانی کے خاندان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ پٹھانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ ابتدا میں یہ قبیلہ ہرات کے نواح خاقان میں رہتا تھا اور اس وجہ سے خاکوانی مشہور ہو گیا دوسری روایت میں ہے کہ اس خاندان کا ایک بزرگ جو خوک (سور) کا شکار بڑے شوق سے کھیلا کرتا تھا دوران شکار اسے کچھ حادثہ پیش آیا جس کے باعث وہ خوکانی یا خاکوانی مشہور ہو گیا۔ بہرحال اسی قبیلے کا ایک آدمی ملک شاہ پال، بادشاہ ہمایوں کے ہمراہ سنہ ۱۵۵۵ء میں کابل سے یہاں چلا آیا تھا۔ اور اس کی اولاد میں سے علی محمد خان خاکوانی ہوا جس نے احمد شاہ درانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ احمد شاہ نے جب لاہور پر تیسرا حملہ کیا تو اس نے خواجہ اسحاق ناظم ملتان کو ہٹا کر علی محمد خان خاکوانی کو یہاں کا ناظم مقرر کر دیا۔ سنہ ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ علی محمد خان اس وقت ملتان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اسی سال کے آخر میں مرہٹے چلے گئے اور احمد شاہ نے خواجہ یاقوت کو ملتان کا ناظم بنا دیا۔ مگر نواب علی محمد خان خاکوانی نے اسے ملتان سے نکال دیا اور خود قابض ہو بیٹھا۔

احمد شاہ درانی کو علی محمد خان کے اس فعل پر سخت رنج ہوا اور اس نے نواب شجاع کو ملتان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ لیکن علی محمد خان نے اسے بھی گرفتار کر لیا۔ بالآخر احمد شاہ درانی نے پنجاب میں آخری حملہ کے وقت علی محمد خان اور اس کے بیٹے کا پیٹ چاک کر کے گدھے پر بٹھایا اور ملتان کے بازاروں میں پھرایا اور اس کی لاش کو تین روز تک ملتان کے دروازہ پر لٹکائے رکھا۔

ملتان کے صدر بازار میں واقع مسجد ولی محمد خان اور راجباہ (نالہ ولی محمد) اسی علی محمد خان خاکوانی کے تعمیر کردہ ہیں لیکن ملتان اور بہاولپور کا موجودہ خاکوانی خاندان اس علی محمد خان کی اولاد سے نہیں ہے وہ ایک اور علی محمد خان خاکوانی تھا۔ جو حاجی علی محمد خان کے نام سے مشہور ہے اس کے بزرگوں میں ایک خداداد خان تھا۔ جس کی پشت پر حاجی علی محمد خان چوتھے مقام پر تھا اور خداداد خان آج سے قبل کم و بیش چار سو سال قبل غزنی سے چل کر یہاں آیا تھا۔ (تذکرہ رؤسائے پنجاب ص ۵۰۴ و روسائے پنجاب ذکر خاندان سدوزئی)

میرمنو گورنر پنجاب نے اسی سال وفات پائی، اور اس کی جگہ بادشاہ دہلی نے آدینہ بیگ کو صوبہ پنجاب کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ آدینہ بیگ نے مرہٹوں کو بھی پنجاب آنے کی دعوت عام دے دی، اور وہ یہاں آ کر ہر طرف پھیل گئے۔ احمد شاہ نے اپنے چوتھے حملے ۱۷۵۶ء کے وقت لاہور کے صوبہ دار آدینہ بیگ کو دہلی کی طرف بھگا دیا اور لاہور کا صوبہ اپنے بیٹے تیمور کے حوالے کر دیا۔

ڈیرہ غازیخان پر مرہٹوں کا قبضہ: ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے لاہور پر حملہ کیا اور سکھوں سے لاہور خالی کرا لیا، پھر انہوں نے اٹک اور ملتان کے علاقوں پر یورش کی اور انہیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس میں ڈیرہ غازیخان بھی شامل تھا۔ اس موقع پر انہوں نے ملتان کے ناظم علی محمد خان خاکوانی کو بھگا دیا۔ اور اپنی طرف سے ملتان میں صالح محمد خان نامی ایک شخص کو صوبہ دار مقرر کر دیا۔

احمد شاہ درانی نے پانچواں حملہ مرہٹوں کے خلاف کیا اور وہ بلوچستان سے ہوتا ہوا اٹک اور پشاور کے راستے پنجاب کی طرف بڑھا۔ اس وقت لاہور میں "پرسا" نامی ایک مرہٹہ سردار قابض تھا۔ احمد شاہ کی آمد کی خبر پا کر وہ لاہور اور ملتان کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب احمد شاہ نے مرہٹوں کے ناظم کو ملتان سے ہٹا کر پھر علی محمد خان خاکوانی کو گورنر بنا دیا یہ ۱۷۶۰ء کا واقعہ ہے۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ اپنے افغانی اور بلوچی لاؤ لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا۔ میر نصیر خان بیگلربیگ بلوچ عساکر کی قیادت کر رہا تھا۔ احمد شاہ نے مرہٹوں پر فتح عظیم حاصل کی اور لاہور کی صوبہ داری "امیر بلند خان" کے حوالے کر دی۔ اور علی محمد خان خاکوانی کو بھی ملتان کی صوبہ داری سے ہٹا دیا گیا اور ملتان اپنے نائبین عبدالکریم خان بامی زئی اور الہیار کے سپرد کر دیا۔[1] اور خود کابل کو واپس چلا گیا۔

احمد شاہ کا پنجاب پر چھٹا حملہ: ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ درانی نے پنجاب پر اپنا چھٹا حملہ کیا سکھ اس وقت ستلج پار بھاگ گئے۔ مگر احمد شاہ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور لدھیانہ سے پچیس ۲۵ میل دور ایک مقام پر جا لیا۔ اس لڑائی میں پچیس ہزار سکھ مارے گئے اور اس قتل عام کی وجہ سے اس مقام کا نام "گھلو گھارہ" پڑ گیا۔[2]

اس موقع پر احمد شاہ نے لاہور پر ایک ہندو سردار کابلی مل کو صوبہ دار بنا دیا۔ اور خود کابل

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ملتان ص ۷ ۔ لم۔ [2]۔ تاریخ پنجاب ص ۸۰۔

کو واپس چلا گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے پنجاب پر دو اور حملے کئے مگر کسی لڑائی اور نتیجہ کے بغیر واپس لوٹ جاتا رہا۔ اِس وقت پنجاب میں سکھ پوری طرح غالب آ چکے تھے۔

وفات: احمد شاہ درانی نے بعارضہ ناسور بینی ۱۷۷۲ء میں انتقال کیا تھا اور قندھار میں اسے دفن کیا گیا۔ احمد شاہ درانی نے اپنے سکے کے ایک طرف "الحکم للّٰہ یا فتح احمد شاہ درانی" کندہ کرایا تھا اور سکہ کے دوسری طرف فارسی کا یہ شعر تھا۔

ے حکم شد از قادر بیچوں بہ احمد بادشاہ
سکہ زن بر سیم و زر از پشت ماہی تا بماہ

اور اس کے مزار پر یہ کتبہ نقش ہے۔

شاہ والاجاہ احمد شاہ درانی کہ بود در قوانین امور سلطنت کسریٰ منش
از نہیبِ قہرمان سطوتش در عہدِ او شیر آہو را بہ شیر خویش دادی پرورش
میرسد از ہر طرف در گوش بدخواہان او از زبانِ خنجرش ہردم ہزاران سرزنش
چوں رواں شد جانبِ دارالبقا تاریخ بود سالِ ہجری یکہزار و یکصد و ہشتاد و شش[1]

تیمور شاہ: احمد شاہ درانی کے چار لڑکے تھے۔ تیمور شاہ، سلیمان شاہ، سکندر شاہ اور پرویز تیمور شاہ اس وقت ہرات میں تھا جب احمد شاہ کی وفات ہوئی۔ احمد شاہ کے وزیر شاہ ولی نے کچھ ذاتی رنجش کی بنا پر تیمور کی بجائے سلیمان کو تخت پر بٹھا دیا لیکن دوسرے اراکین دولت کو شاہ ولی کے اس اقدام سے اتفاق نہ ہو سکا۔ چنانچہ انہوں نے خود شاہ ولی کو قتل کر کے تیمور شاہ کو کابل و قندھار کی زمام حکومت سونپ دی۔[2]

تیمور شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے ملتان کی نظامت پر حاجی محمد شریف سدوزئی کو گورنر مقرر کر دیا اور شاہ شجاع دوبارہ قلعہ شجاع آباد کو چلا گیا۔

تیمور شاہ نے اپنے دور اقتدار میں دو مرتبہ (۸۰، ۱۷۷۷) میں ملتان پر حملہ کیا اور ناکام رہا تاہم ملتان کے سکھ حاکم نے شہر کی چابیاں تیمور شاہ کے حوالے کر دیں اور اس کے بعد تیمور کو پنجاب کی فتح کا خیال کبھی نہ آیا۔ اور وہ سندھیوں، کشمیریوں اور ازبکوں کی بغاوتوں کے فرو کرنے میں لگا رہا۔[3]

وفات: تیمور شاہ نے بیس برس تک حکومت کی اور ۱۷۹۳ء میں فوت ہوا اور کابل میں اسے دفن کیا گیا۔

[1] تذکرہ صوفیائے سرحد سائنہ ص ۳۶۴ لم [2] حیات افغانی ص ۱۷۰، [3] تاریخ پنجاب ص ۹۲۔

CS CamScanner

زمان شاہ: تیمور شاہ کے بہت سے لڑکے تھے جن میں ہمایوں سب سے بڑا تھا۔ تاہم تیمور شاہ کی وفات کے بعد درباریوں نے اس کے تیسرے بیٹے زمان شاہ کو تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ ہمایوں اس وقت قندھار کا گورنر اور محمود ہرات میں تھا۔ زمان شاہ کی تخت نشینی کی خبر سن کر ہمایوں نے اعتراض کیا اور زمان شاہ سے لڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ آخر کار ایک سخت لڑائی کے بعد شکست کھائی اور بھاگ نکلا۔

ان دنوں سنگھڑ (تحصیل تونسہ) کا نواب محمد مسو خان نتکانی تھا۔ ہمایوں اس کے پاس منگروٹھ میں آیا اور مدد چاہی، چنانچہ سردار محمد مسو خان نے چند گھوڑ سوار دے کر اسے فتح خان کی دریائی گزرگاہ سے دریائے سندھ عبور کرادیا اور وہ لیہ کی طرف چلا گیا۔ لیہ و بھکر کے نواب محمد خان سدوزئی نے اسے گرفتار کرکے زمان شاہ کے پاس کابل بھجوادیا۔ زمان شاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا کر ہمیشہ کے لئے اسے اندھا اور حکومت سے محروم کردیا۔[1]

زمان شاہ کو پنجاب کے فتح کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے پنجاب پر سنہ ۱۷۹۷، ۹۸ء میں دو حملے کئے اور دوسرے حملے میں اس نے لاہور فتح کیا۔ اس اثنا میں زمان شاہ کے دوسرے بھائی (اخیانی بھائی) محمود شاہ نے کابل میں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ جس وجہ سے زمان شاہ سنہ ۱۷۹۹ء میں لاہور سے کابل کو روانہ ہوگیا اور کبھی واپس نہ آیا۔

پنجاب سے واپسی پر زمان شاہ کی بھاری توپیں دریائے جہلم میں پھنس گیئں۔ جن کے نکالنے میں رنجیت سنگھ نے اس کی بڑی مدد کی چنانچہ اس کے صلہ میں زمان شاہ نے لاہور کی حکومت کا پروانہ رنجیت سنگھ کے نام لکھ دیا۔[2]

سردار پائندخان کا قتل:۔ شاہ زمان ایک سادہ لوح بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے ایک محسن فرد سردار پائندخان بارکزئی کو ناجائز قتل کرادیا۔ جس وجہ سے اس کے لڑکے جو کثیر تعداد میں تھے۔ ملک میں ان کا اثر بھی زیادہ تھا زمان شاہ کے خلاف ہوگئے۔ چنانچہ فتح خان جو کہ زمان شاہ کا وزیر تھا۔ اس سے جدا ہوکر فتح علی شاہ قجر کے پاس ایران چلا گیا۔ اس وقت محمود شاہ ہرات میں تھا۔ فتح خان بارکزئی نے محمود شاہ کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اور اسے اپنے علاقہ گرشک میں بٹھاکر خود زمان شاہ کے مقابلہ پر نکل کھڑا ہوا۔

[1] حیات افغانی ص ۷۱۔ خسر گٹ گزیٹر ڈیرہ اسماعیل خان [2] تاریخ پنجاب ص ۹۵، ۹۶

زمان شاہ پشاور سے یہ خبر سن کر اس کی طرف روانہ ہوگیا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا واسطہ کسی جری اور بہادر سردار سے ہے۔ چنانچہ وہاں سے شکست کھاکر ڈیرہ غازیخان پہنچا اور اوچ چلا گیا۔ چونکہ سردار پائندخان سندھ میں رہ چکا تھا اور یہاں پر اس کا اثر و نفوذ باقی تھا۔ اوچ کے سادات کے ساتھ تعلقات بھی اچھے تھے۔ اس لئے انہوں نے زمان شاہ کو پکڑ کر فتح خان کے حوالے کردیا۔ اور فتح خان اسے گرفتار کرکے محمود شاہ کے پاس لے آیا۔ چنانچہ محمود شاہ کے حکم سے زمان شاہ کو درہ جگ دلک میں لے جاکر اندھا کردیا گیا۔[1] اور یہ ہمایوں کا انتقام تھا۔ کیونکہ ہمایوں محمود شاہ کا عینی بھائی تھا اور زمان شاہ اخیانی بھائی۔ الغرض اب کابل و قندھار کا بادشاہ محمود شاہ ہوگیا یہ واقعہ سنہ ۱۸۰۱ء کا ہے۔

محمود شاہ اور شاہ شجاع۔ محمود شاہ اپنے بھائی زمان شاہ کو معزول کرکے تخت نشین ہوچکا تھا مگر سنہ ۱۸۰۳ء میں شاہ شجاع نے اپنے عینی بھائی زمان شاہ کا بدلہ لینے کی غرض سے محمود شاہ پر حملہ کر دیا۔ محمود شاہ گرفتار ہوا۔ شاہ شجاع نے اب محمود شاہ کی آنکھیں نکالنا چاہیں لیکن زمان شاہ نے ایسا کرنے سے اسے روک دیا۔

شاہ شجاع نے ابھی چار سال حکومت کی تھی کہ کشمیر کے صوبہ دار عطاءاللہ خان نے بغاوت کردی شاہ شجاع اس بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے کشمیر گیا، مگر خود شکست کھائی اور عطاءاللہ خان کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ محمود شاہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قید سے رہائی حاصل کرلی۔ اور کابل پر پھر قابض ہوگیا۔ اتنے میں شاہ شجاع بھی رہا ہوکر واپس آگیا اور پشاور اور کابل پر حملہ کرکے ان پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح کابل کا حکمران شاہ شجاع اور قندھار کا محمود شاہ ہوگیا۔[2]

شاہ شجاع کا فرار:۔ محمود شاہ کا بیٹا کامران اس وقت ہرات میں تھا اور وہاں کا گورنر تھا محمود شاہ نے ایک طرف اپنے بیٹے کو بلایا اور دوسری طرف میر محمود خان بروہی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ ان تینوں نے مل کر شاہ شجاع پر حملہ کردیا اور اسے شکست دی۔ اس وقت شاہ شجاع وہاں سے فرار ہوکر رنجیت سنگھ کے پاس لاہور چلا آیا، اور اس سے فوجی امداد چاہی۔ اس موقع پر رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے مشہور عالم "کوہِ نور" ہتھیالیا اور اس کی کوئی مدد بھی نہ کی۔ یہ غالباً سنہ ۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے۔

سنہ ۱۸۱۸ء میں شاہ شجاع امیر بہاول پور کے پاس گیا اس نے شاہ شجاع کا پرجوش استقبال

[1] حیات افغانی ص ۷۲، تاریخ بلوچستان ص ۲۰۳۔ [2] حیات افغانی ص ۷۲۔

CamScanner

کیا اور بخشی محمد یعقوب خان کی سپہ سالاری میں ایک لشکر امداد کے لئے بھیجا شاہ شجاع نے اوّل ڈیرہ غازیخان پر آکر قبضہ کیا اور زمان خان کو اپنی طرف سے یہاں کا ناظم بنایا اور خود کابل کو چلا گیا۔[1] اس وقت شاہ شجاع کا لڑکا شہزادہ تیمور اس کے ساتھ تھا۔ اور وہ سندھ کی طرف بڑھ گیا اور شکار پور پر جا کر قابض ہوا سنہ ۱۸۳۳ء میں شاہ شجاع پھر انگریزوں کے ایما پر سندھ کے علاقہ شکار پور کو فتح کرتا ہوا قندھار پہنچا۔ مگر امیر دوست محمد خان سے شکست کھائی اور برِصغیر کو واپس لوٹ آیا۔ اور لدھیانہ میں جا کر مقیم ہوگیا۔

شاہ شجاع کا قتل۔ سنہ ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع نے قندھار کی حکومت حاصل کرنے کی آخری بار کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا لیکن سنہ ۱۸۴۲ء میں کابل میں مقیم انگریزی فوج کا جو حشر ہوا شاہ شجاع بھی اس سے نہ بچ سکا اور قتل ہوگیا۔[2]

الغرض سنہ ۱۸۱۸ء میں شاہ شجاع کی پہلی بار شکست اور اس کے پنجاب کو واپس آجانے کے بعد محمود شاہ نے ہرات کا علاقہ اپنے بھائی فیروز الدین کو دے دیا، مگر شہزادہ کامران کو باپ کا یہ فیصلہ منظور نہ تھا چنانچہ اس نے اپنے باپ محمود شاہ کو اغوا کر لیا۔

دُرّانی حکومت کا خاتمہ۔ دوسری طرف ایرانی فوجوں نے ہرات کی طرف پیشقدمی شروع کر دی ان دونوں مہموں پر وزیر فتح خان اور امیر دوست محمد خان روانہ ہوئے۔ فتح خان نے شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار کو شکست دی، جو تین لاکھ کی فوج لے کر آیا تھا۔ اور دوست محمد خان نے ہرات پہنچ کر حاجی فیروز الدین سے ہرات لے لیا اور اپنی جبلت سے مجبور ہو کر اس نے حرم سرا شاہی کو بھی تاراج کر دیا۔ اور شہزادہ کامران کی بہن جو کہ شہزادہ قاسم کی بیگم تھی "ازار بند کشیدہ شلوار" لے کر بھائی کے پاس پہنچی اور دوست محمد خان کی شکایت کی کہ اس نے ازار بند جو کہ دو لاکھ روپے کی قیمت کا تھا جبراً لے لیا۔ شہزادہ کامران نے خیال کیا کہ اس نازیبا حرکت میں دوست محمد خان کے بھائی فتح محمد خان کا بھی ہاتھ ہے۔ چنانچہ اس نے فتح محمد خان کو پہلے اندھا کیا پھر اسے قتل کرا دیا۔

فتح محمد خان بارکزئی کے قتل پر کابل و قندھار میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی، اور وہاں کے لوگوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ سدوزئی خاندان کے کسی فرد کو زندہ باقی نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ ملک میں اٹھنے والے اس طوفان سے محمود شاہ اور شہزادہ کامران عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ اور ملک چھوڑ کر

[1] بہاول پور گزیٹیر ص ۳۰۷ ۔ [2] تذکرہ رؤسائے پنجاب ج ۱ ص ۷۲ (ذکر خاندان شاہ شجاع)

ہرات کی طرف نکل گئے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۸۲۹ء میں محمود شاہ نے وہاں پر وفات پائی۔ اور اس کا بیٹا شہزادہ کامران ہرات کا حکمران ہوا۔[1]

ادھر بارکزئی برادران نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔ کابل اور غزنین میں امیر دوست محمد خان نے اپنی حکومت قائم کر لی اور باقی حصے قندھار اور پشاور اس کے دوسرے بھائیوں نے لے لیے اس طرح سنہ ۱۸۲۲ء میں کابل و قندھار کی دُرّانی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ چنانچہ اسی دور میں ڈیرہ غازیخان کی سرزمین مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

دُرّانی دور کے ناظمین ڈیرہ غازیخان

۱ تیمور شاہ کا دور :-

۔ حاجی محمد شریف سدوزئی ۔	(بہادر خیل)
۔ عبدالرحیم خان ولد حاجی محمد شریف ۔	
۔ احمد خان ولد عبدالرحیم خان ۔	
۔ سلیمان خان	(بہادر خیل)
۔ دوست محمد خان	
۔ زمان خان دُرّانی	عرصہ تین سال
۔ سمندر خان بادوزئی	عرصہ ایک سال
۔ موسیٰ خان اچکزئی	عرصہ نو ماہ
۔ جمعہ خان	

۲ زمان شاہ کا دور :-

۔ اسد خان تنکانی بلوچ	عرصہ دو سال
۔ سمندر خان بادوزئی	عرصہ تین سال
۔ سمندر یا احمد خان پوپلزئی	عرصہ دو سال
۔ عبدالجبار خان بارکزئی	عرصہ تین سال
۔ شیخ قمرالدین خان	عرصہ ایک سال

[1] حیاتِ افغانی صفحہ ۲۷۳، ۲۷۴ و تاریخ بلوچستان صفحہ ۲۰۳ و کلا قاموس المشاہیر ص ۲۰۴

۔ حبیب اللہ خان سدوزئی	عرصہ دو سال
۔ ابراہیم خان پوپلزئی	عرصہ ایک سال
۔ زمان خان بارکزئی	عرصہ تین سال
۔ میر عالم خان	۱۸۰۱ء

۳ محمود شاہ کا دور :۔

۔ سمندر خان بادوزئی	عرصہ دو سال
۔ نواب عبدالجبار خان	۱۲۳۰ھ ایک سال
۔ نواب محمد ابراہیم خان	۱۲۳۱ھ چھ ماہ
۔ نواب عبدالصمد خاں	۱۲۳۲ھ ایک سال
۔ نواب محمد ابراہیم خان	۱۲۳۲ھ ۔
۔ نواب محمد زمان خان	۱۲۳۳-۳۴ھ
۔ نواب عبدالجبار خان	۱۲۳۵ھ
۔ نواب محمد اسد خان نشکانی بلوچ	۱۲۳۶-۳۷ھ
۔ نواب میر عالم خان	۱۲۳۸ھ
۔ نواب محمد زمان خان[1]	۱۲۳۸ھ

مذکورۃ الصدر ناظمین کے علاوہ ڈیرہ غازیخان میں بعض دوسرے ناظمین کے نام بھی آئے ہیں جن میں چند یہ ہیں :۔

۔ حبیب اللہ خاں کامران خیل

۔ محمد رضا خان

۔ محمد عطا ولد احمد خان

ناظمین ڈیرہ غازیخان کی یہ فہرست تواریخ ڈیرہ غازیخان، گل بہار، ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان اور مناقب المحبوبین سے تیار کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ایک غلطی جو ابتداء سے چلی آ رہی

[1] نواب محمد زمان خان اس وقت شاہ شجاع کی طرف سے ڈیرہ غازیخان کا ناظم تھا جبکہ سکھوں نے اس سے یہاں کی حکومت لے لی۔

اور جس میں ناظمین کے ناموں کی تکرار اور ان کے عرصۂ حکومت کا تعین اصلاح طلب ہیں۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان میں جنرل میکلیگن کے حوالے سے لکھا ہے کہ زمان شاہ کی حکومت کے دوران گورنران کی نامزدگی کا عرصہ ستر[1] سال بنتا ہے جبکہ خود زمان شاہ صرف سات سال تک حکمران رہا۔

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی کا مجموعی عرصۂ حکومت جو مختلف بادشاہوں کے وقت میں بنتا تھا وہ کسی ایک کے عہد میں دکھایا گیا ہے۔ یا پھر کوئی ناظم جو کسی ایک دور میں تھا اسے مختلف وقتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کا نام اور عرصہ نظامت ڈیرہ غازیخان مکرر بار آگیا ہے۔ بہرحال کوئی بھی وجہ ہو دُرانی دور کے ناظمین ڈیرہ غازیخان کے دور اور صحیح وقت کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔

لالہ ہتو رام لکھتے ہیں کہ کل سولہ آدمی ڈیرہ غازیخان کے نواب ہوئے۔ کوئی ایک سال کوئی دو سال اور کوئی چھ ماہ تک حکمران رہا[2]۔ تاہم یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی ہے۔

دُرانی دور حکومت پر ایک نظر : رائے بہادر ہتو رام کا بیان ہے کہ حاکم ضلع اکثر مغل پٹھان خراسان سے مقرر ہو کر آئے۔ جو یہاں کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ بلکہ یہاں کی بولی بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ انتظام ملکی ان سے بالکل سنبھالا نہیں جا سکا۔ ملک کی ترقی اور پیداوار کے بارے میں شاہان خراسان کو وہ جھوٹی رپورٹیں لکھ دیتے تھے۔ جب وصولی محصول کا وقت آتا اور فصل نہ ہوتی تو چار لاکھ روپیہ جو کہ یہاں کا مقرر تھا۔ لیٹروں کی طرح رعایا کو لوٹ کر پورا کر دیتے تھے۔

جب یہ حالت ہوتی تو لوگ ملک بدر ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ اور دریائے سندھ کے پار بہاول پور اور مظفر گڑھ کو چلے جاتے تھے۔ جہاں پر اب تک ایسے لوگ موجود ہیں۔ چنانچہ علاقہ اکثر اجاڑ ہو کر رہ گیا۔ اور اکثر مواضعات ویران پڑ گئے[3]۔

[1] گزیٹر مذکور ص ۲۵ [2] گل بہار ص ۱۰ [3] ایضاً ص ۱۰، ۹۔

حصّہ دوم

(ریاست سنگھڑ)

سنگھڑ

یوں تو زبان زدِ عام ہے کہ کسی زمانہ میں سنگھڑ نامی ایک ہندو راجہ یہاں پر راج کرتا تھا جس کے نام پر قصبہ سنگھڑ (منگروٹھ تونسہ) اور نالہ سنگھڑ وجود میں آئے اور ریاست سنگھڑ قائم ہوئی۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ یہ علاقہ مختلف ادوار میں سندھ کا حصہ رہا۔ اور سندھ میں اس وقت بھی سانگھڑ (سنگھڑ) نام کا ایک ضلع موجود ہے، اور اسی نام سے ایک سے زائد رود کوہی نالے بھی پائے جاتے ہیں۔ جیساکہ ٹاڈ صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سانگھڑ کے ساتھ گھرتے ۱۷۳۰ء کے قحط میں اس کے باشندے سندھ کو بھاگ گئے۔ اب فقط ہندو گھروں میں چارن (چرواہے) لوگ رہتے ہیں۔ سانگھڑ سے بڑا تھن شروع ہوتا ہے اور نالہ سانگھڑ (رود سنگھڑ) کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ سندھ کے درّہ سے اور دوبارہ بکھر سے شمال کی طرف اڑھائی کوس سے جاری ہوتا ہے۔ کاشتکاری کی حالت عمدہ ہے۔ ریت کے پہاڑوں کا سلسلہ یہاں منقطع ہوتا ہے۔ ایک اور موقع پر بیان کیا ہے سانگھڑا نالہ (نالہ سنگھڑ) دریائے سندھ سے بالا اور سکرنڈ کے بیچوں بیچ جاری ہو کر چندیلا کو طے کرتا ہے۔ نادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد نامہ میں بھی نالہ حدِ فاصل قرار دیا گیا تھا۔[۱]

غرضیکہ سنگھڑ نام کا علاقہ سندھ میں بھی اسی شکل و صورت میں موجود ہے جس طرح کہ ہمارے ہاں علاقہ سنگھڑ (تحصیل تونسہ) ہے۔ مجھے ایک سندھی فاضل دوست نے بتایا کہ سندھی زبان میں سنگھڑ ایک ایسے جھرنے کو کہتے ہیں جس کا پانی کسی حصہ زمین سے رس رس کر باہر نکلتا ہے اور ایک جھیل کی شکل میں جمع ہوتا رہے۔ مگر اس کے کناروں سے امڈ کر باہر نہ نکل سکے اور یہ بھی کہا کہ سندھ میں اس نام (سنگھڑ) کا ایک جھرنا ہنوز موجود ہے۔

ایک انگریز سیاح چارلس میسن ۱۸۲۶ء کے بعد کسی وقت جب سنگھڑ (تونسہ) میں آیا اور قلعہ منگروٹھ کو دیکھا جو خام مٹی سے تعمیر تھا۔ اور اپنی بوسیدگی کے لحاظ سے بھی زیادہ مضبوط نہیں تھا تو بیان کیا کہ سنگھڑ کی اصطلاح مٹی کے ایک عام قلعے کیلئے غیر مناسب طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم یہ صرف ایک مضبوط جگہ کا مفہوم پیش کرتا ہے۔[۲]

راجہ سنگھڑ یا سنگھرائے۔ تاریخ سندھ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۳ھ (۱۱۰۷ء)

[۱] ٹاڈ راجستان ص ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۲۔
[۲] نیرنگیٔ افغان ریویس جرنیز بلوچستان۔ افغانستان اینڈ دا پنجاب ص ۳۶۔

میں ایک ہندو راجہ سنگھر (سنگھار یا سنگھرائے) اس علاقہ میں حکومت کرتا تھا جس کی حدود سلطنت سنگھڑ (تحصیل تونسہ) سے ضلع سانگھڑ (سندھ) تک پھیلی ہوئی تھیں اور مغرب میں مکران تک کا علاقہ اس کے تسلط میں تھا۔[۳]

اور اگر ہم اسے قدیم دور کی طرف لوٹالے جائیں جیساکہ بتوام منگروٹھ (سنگھڑ) کے متعلق کہتے ہیں کہ اس قصبہ کی آبادی، برانڈ کے دور سے متعلق ہے جسے کسی۔ دیت۔ نے قائم کیا تھا تو اس کا تعلق قدیم عہد کے سورج بنسی سنگر نامی ایک راجہ سے پیدا کیا جاسکتا ہے اور یہ کسی قدر درست بھی معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ ٹاڈ صاحب کا بیان ہے کہ اکشواکو، منوجی (نوح) کے فرزند پہلے فرمانبردار تھے جنہوں نے مشرق کا رخ کیا اور ہندوستان میں اجودھیا کی آبادی بنائی۔ آگے چل کر لکھا ہے زمانہ مابعد سے مراد راجہ سگر کے عہد سے ہے۔ جو سورج بنسی شجرہ کی تیسویں (۳۰ ویں) پشت میں فرمانروا ہوا لیکن دوسرے موقع پر اسے اپنے مورث اعلیٰ اکشواکو سے چودہ پشت نیچے کو بیان کیا۔

الغرض راجہ سگر، تالجنگھا کا ہمعصر تھا۔ جو چندر بنسی خاندان میں سہسرارجن کی چھٹی پشت میں ہو گزرا ہے۔ یہی مؤرخ لکھتا ہے کہ رامائن اور پورانوں سے مترشح ہے کہ ہر دو اقوام شاہی سورج بنسی اور چندر بنسی میں باہم رقابت و جنگ آزمائی کا سلسلہ قائم رہا۔ بھوشیہ پورانوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اچھی طرح نیچا دیکھا اور بخوبی منہ کی کھائی لیکن بعد میں ان کو پھر تمام اختیارات شاہی سورج بنسی سے واپس مل گئے۔ ان کو انتقام لینے ہی میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ راجہ سگر کے باپ کو بیٹے، تالجنگھا، سومو ونشانس کے تاجداروں نے سلطنت اجودھیا سے نکال باہر کیا چنانچہ اس نے ہموت پہاڑ پر پناہ لی، اور وہیں پر رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔

ان کی رانیاں حاملہ تھیں جن میں سے ایک کا فرزند راجہ سگر تھا۔[۴] قدیم دور میں موجودہ تحصیل تونسہ کو علاقہ سنگر لکھا جاتا رہا ہے۔ جو لبعد میں سنگھر اور سنگھڑ میں تبدیل ہو گیا۔ بہرکیف راجہ سنگھڑ نے رود سنگھڑ کے بائیں کنارے پر اور درّہ سنگھڑ کے پاس ایک آبادی قائم کی جس کا نام سنگھڑ تھا۔ اس شہر کی عمارات سادہ پتھر سے تعمیر کی گئی تھیں۔ شہر کے گرد ایک فصیل (شہر پناہ) تھی جو نہایت چوڑائی اور مضبوط بنیادوں پر بنائی گئی تھی۔ اس آبادی کے قدیم آثار اب بھی اپنے

[۳] عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۸۱۔ [۴] ٹاڈ راجستان ص ۱۲۳، ۱۳۰، ۱۳۲۔

موقع پر موجود ہیں۔ مگر بہت کم رہ گئے ہیں۔ کیونکہ یہ آثار نالہ بدھو اور رود سنگھڑ کے درمیان آکر رود کوہی کی نذر ہوتے چلے گئے مقامی لوگ اس مقام کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسے ہندو کوٹ کا نام دیتے ہیں۔

لنگاہ دور حکومت - سندھ اور ملتان مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کے بعد زیادہ تر علاقہ مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں چلا آیا چنانچہ ملتان میں جب لنگاہ خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے کوٹ کروڑ کو ملتان کا ایک صوبہ بنا دیا اور وہاں پر ان کی طرف سے ایک ناظم مقرر ہوتا تھا۔ دریائے سندھ کے دائیں طرف کا علاقہ جو ڈیرہ جات پر مشتمل تھا اسی ناظم کے ماتحت ہوتا تھا۔

حسین خان لنگاہ نے جب ملتان کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اپنے بھائی شہاب الدین خان کو کوٹ کروڑ کا گورنر بنا دیا اس وقت سنگھڑ کا علاقہ بھی اس کی تحویل میں تھا۔ اس دور کے آثار بعض مقامات پر اب بھی موجود ہیں اقوام لنگاہ اور "سہرہ" یہاں پر بکثرت آباد ہیں چونکہ لنگاہ کی اصل "سہرہ" ہے اس لئے انہوں نے اول یہاں پر "سہرہ" نام کی آبادی بنائی جو تونسہ سے شمال کو تین میل کے فاصلہ پر بر لب سڑک موجود ہے۔ لفظ "سہرہ" بگڑ کر اب سوئرہ مشہور ہے اس بستی میں ایک قدیم مسجد ہے اس مسجد کی تعمیر کے متعلق ملک الہی بخش سہرہ کا بیان ہے کہ سید عبدالوہاب مشہور دین پناہ صاحب کے وقت میں تعمیر ہوئی تھی جبکہ اس میں موجود سن تعمیر ۱۱۱۱ھ بمطابق (۱۶۹۹ء) درج ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ اس کی تعمیر نہیں بلکہ مرمت کا سن ہے۔

بہرکیف ملک الہی بخش اس وقت بستی سوہرہ کا نمبردار اور قوم و قبیلہ کا وڈیرہ ہے۔ سادہ لوح اور صاف گو شخص ہے اس کا خاندان شروع ہی سے معزز چلا آتا ہے۔ نمبردار اور مقدم ہمیشہ اسی خاندان میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ ملک الہی بخش کا ایک بزرگ ملک عبدالرحیم نواب محمد اسد خان نتکانی کے پاس کسی اعلیٰ عہدے پر ملازم تھا اور اچھا اثر و نفوذ رکھتا تھا۔ ریاست سنگھڑ کے ختم ہو جانے کے بعد وہ ایک اعلیٰ پایہ کا زمیندار بن گیا۔ چنانچہ اس خاندان میں برابر یہ زمینداری

چلی آتی ہے اور ملک الہی بخش بہت سے مواضعات کا زمیندار ہے اس کا ایک لڑکا ہے اور وہ صاحب اولاد ہے اس بستی کے قابل ذکر اشخاص ملک محمد نواز اور اس کا بھتیجا ملک عبدالغفور ہیں۔ اول الذکر تونسہ میں رہتا ہے اور جمہوری کتابگھر کا مالک ہے جبکہ ثانی الذکر نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور ایڈووکیٹ ہے۔

اس طرح دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ لنگاہ آبادیاں قائم ہیں۔

ایک لنگاہ آبادی جو قصبہ بنڈی کے پاس مشرق میں ہے۔ پولیس پنشنر محمد صدیق خان لنگاہ وہاں کا قابل ذکر اور صاحب اثر و رسوخ شخص بیان کیا جاتا ہے لنگاہان ملتان کے آثار کی تیسری نشانی لنگاہ والا پتن (گھاٹ) ہے جو مغربی دائرہ دین پناہ کے پتن کے شمال میں اور کوٹ سلطان کے بالمقابل واقع ہے جس طرح کہ ڈیرہ غازیخان کے بالمقابل غازیگھاٹ (غازیخان والا پتن) مشہور ہے۔

شجرۂ نسب بلوچ تنکانی

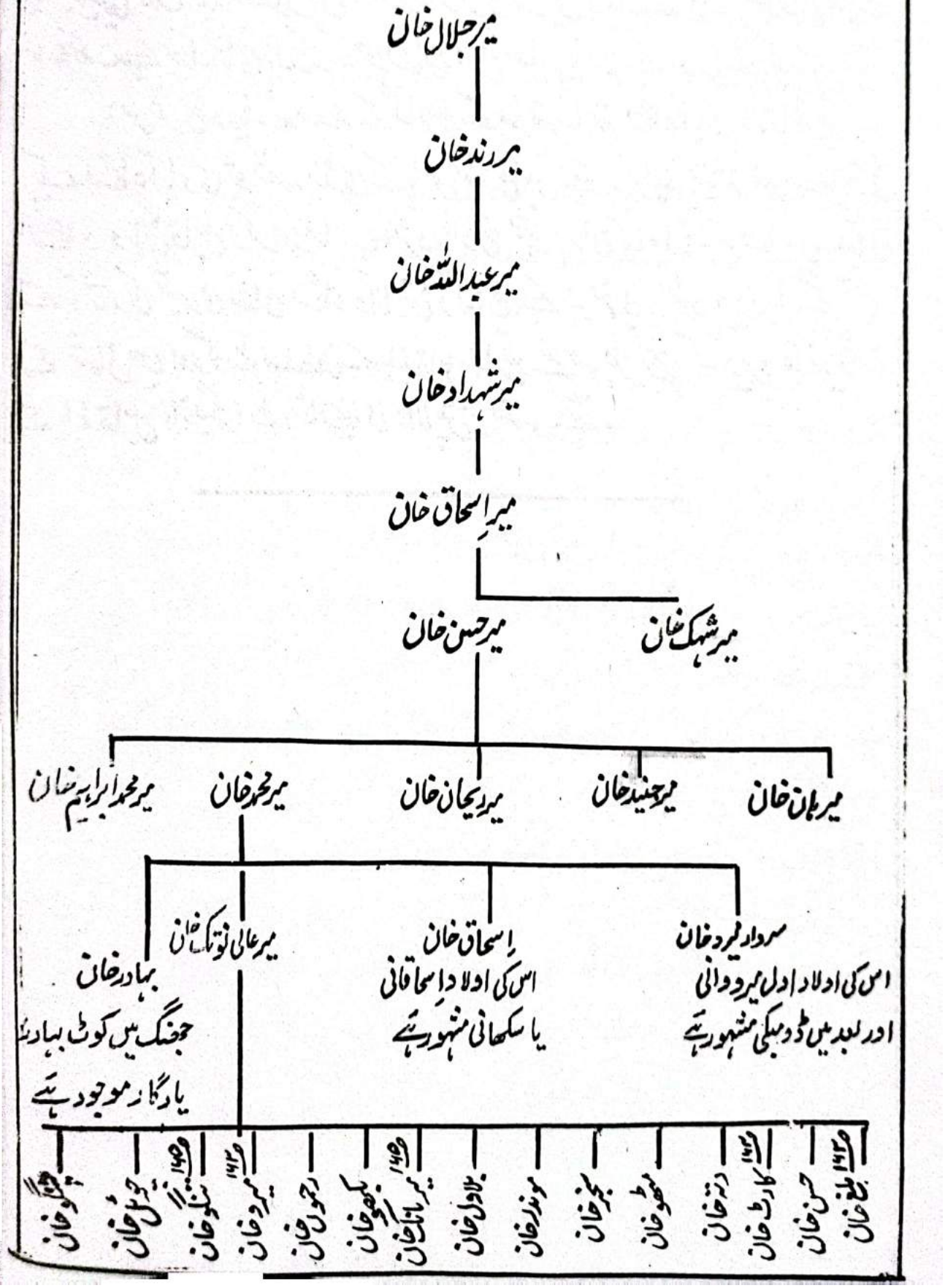

۱۔ سردار میر خان

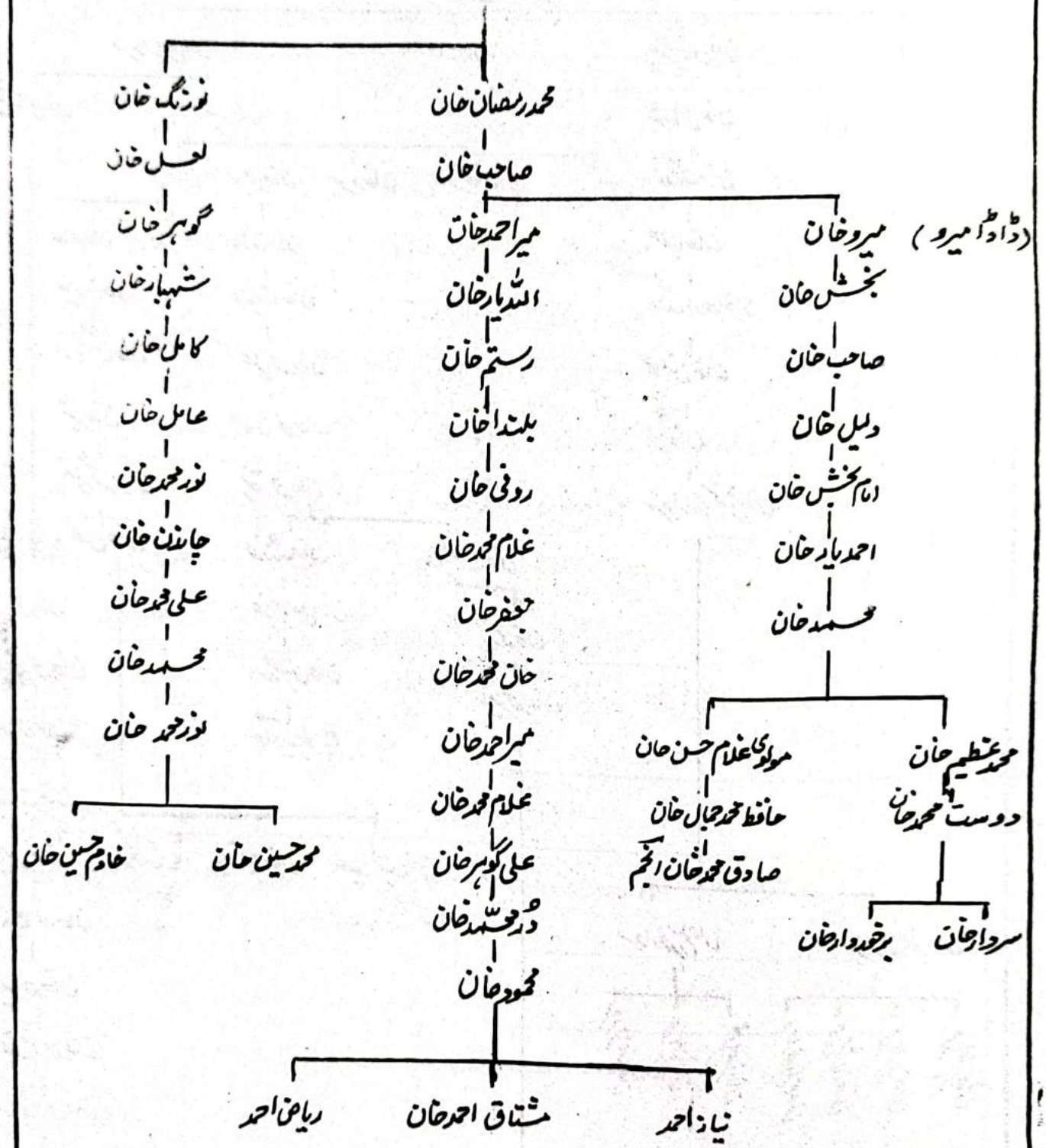

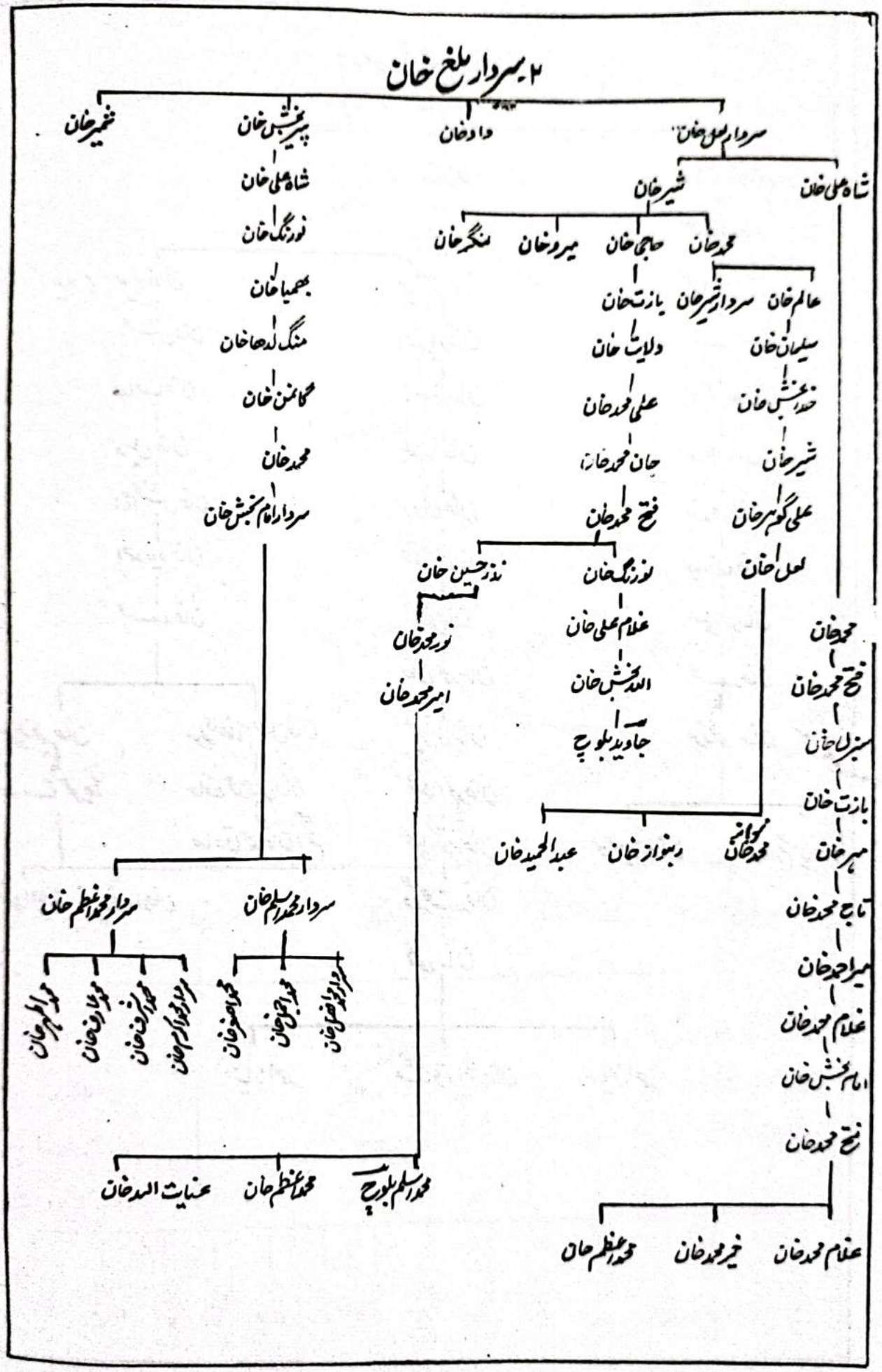

۲۔ سردار ملغ خان
سردار لعل خان
داد خان
پیر بخش خان
نغمیر خان
شاہ علی خان
شیر خان
محمد خان
حاجی خان
میرو خان
منگر خان
عالم خان
سردار شیر خان
بازت خان
ولایت خان
علی محمد خان
جان محمد خان
فتح محمد خان
نورنگ خان
نذر حسین خان
غلام علی خان
اللہ بخش خان
جاوید بلوچ
نور محمد خان
امیر محمد خان
سلیمان خان
خدا بخش خان
شیر خان
علی گوہر خان
لعل خان
محمد نواز خان
ربنواز خان
عبدالحمید خان
محمد خان
فتح محمد خان
سنبل خان
بازت خان
میہر خان
تاج محمد خان
میر احمد خان
غلام محمد خان
امام بخش خان
فتح محمد خان
غلام محمد خان
خیر محمد خان
محمد اعظم خان
شاہ علی خان
نورنگ خان
بھمبا خان
منگ لدھا خان
گامن خان
محمد خان
سردار امام بخش خان
سردار محمد اسلم خان
سردار محمد اعظم خان
سردار محمد افضل خان
محمد اجمل خان
محمد اصغر خان
سردار محمد اکرم خان
محمد اشرف خان
محمد فاروق خان
محمد ابراہیم خان
محمد اسلم بلوچ
محمد اعظم خان
عنایت اللہ خان

۳۔ سردار کارٹ خان

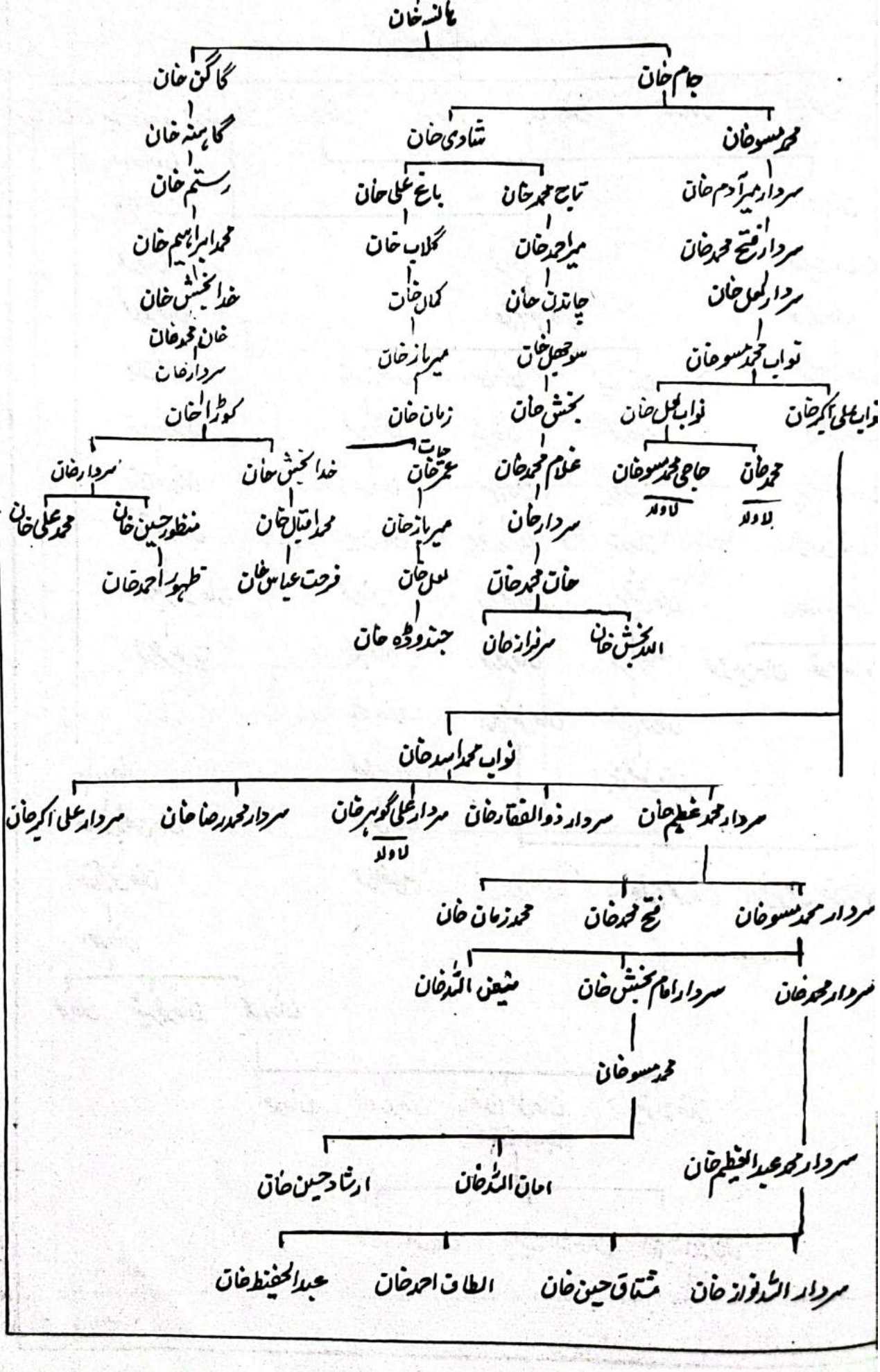

۴۔ میر مانک خان

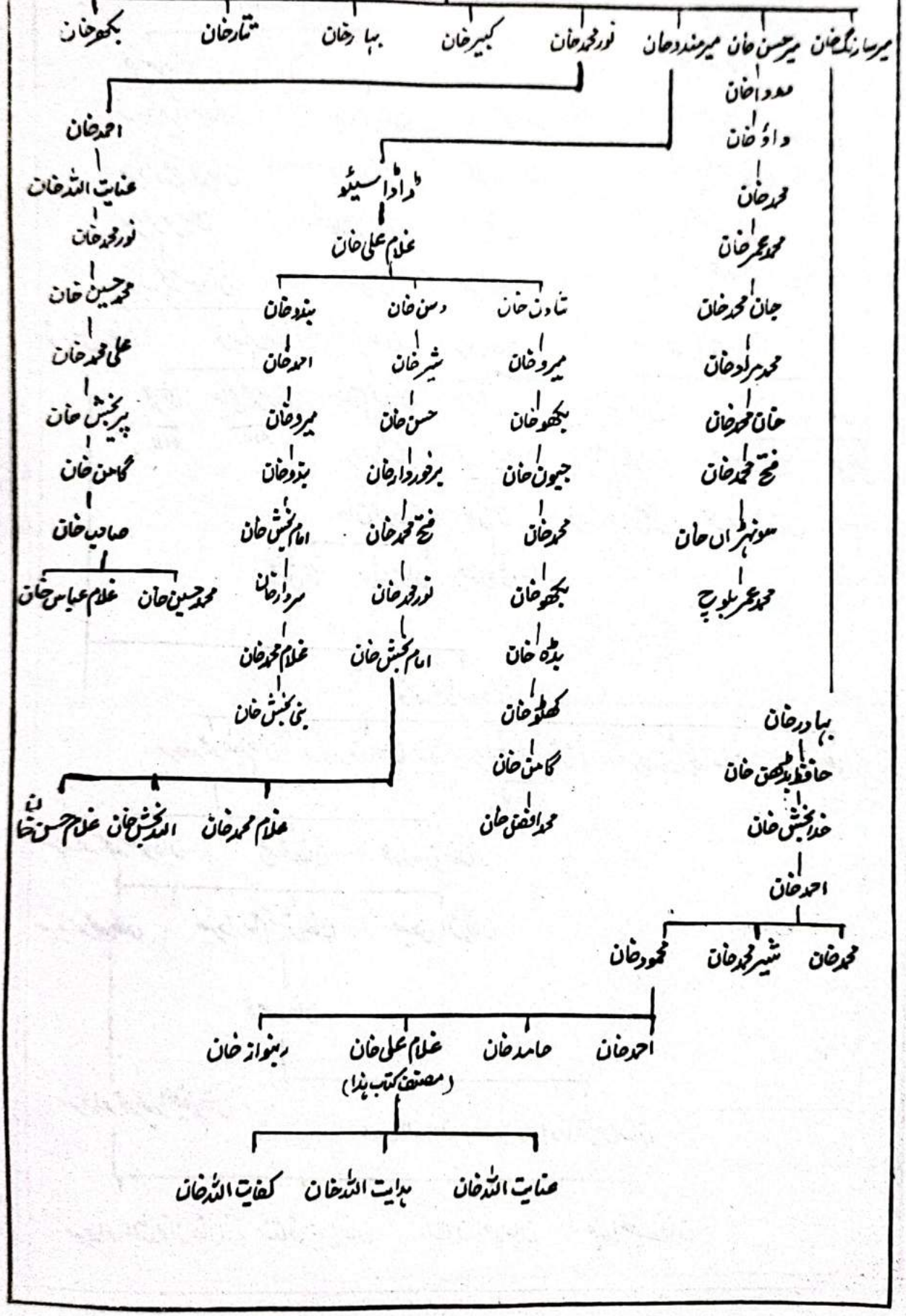

۵۔ سردار تنگو خان

- میر حمزہ خان
- جلب خان
- جمال خان
- حمید خان
  - پٹھان خان
    - سنجش خان
      - محمد خان
        - سردار خان
          - سردار نور محمد خان
            - سردار خان
              - سردار فیض علی خان
                - سردار فیض محمد خان
              - نور محمد خان
                - لاولد
              - فتح محمد خان
                - سردار خان
                  - احمد نواز خان
                  - فتح محمد خان
                  - سعد اللہ خان
              - حامد خان
                - عبد اللہ خان
                - لاولد
              - محمود خان
                - محمد یار خان
                - احمد یار خان
                - دوست محمد خان
                - محمد نواز خان
                - احمد نواز خان
                - احمد خان
                - لاولد
- ساون خان
- مانک خان
- محمد خان
- یار محمد خان
- لعل خان

۶۔ سردار حسن خان

- ورہ خان
  - سارنگ خان
    - ورہ خان
      - اسمٰعیل خان
        - عنایت خان
          - نوبت خان
            - عنایت خان
              - محمد خان
                - اللہ بخش خان
                  - غلام علی خان
                    - حافظ اللہ بخش خان
                      - اسد اللہ خان
                      - حبیب اللہ خان
                      - نصر اللہ خان
- میرواد خان
- خمیسہ خان
- سید خان
  - کبیر خان
    - شہباز خان
      - خان خان
        - شہباز خان
          - گامن خان
            - نور محمد مشہور رحبت خان
              - نواب خان
                - خدا بخش مشہور رحبت خان
- میروڈہ خان
- پلیہ خان

سردار عمر خان

- عثمان خان
  - نور محمد خان
    - سردار خان
      - فضل خان
        - گلشیر خان
        - محمد شفیع خان
- شہرو خان
  - کوڑا خان
    - شہرو خان
      - دوست محمد خان
        - احمد یار خان
      - محمد حیات خان
        - عطاء اللہ خان
        - فیض اللہ خان

۷۔ سردار مٹھو خان

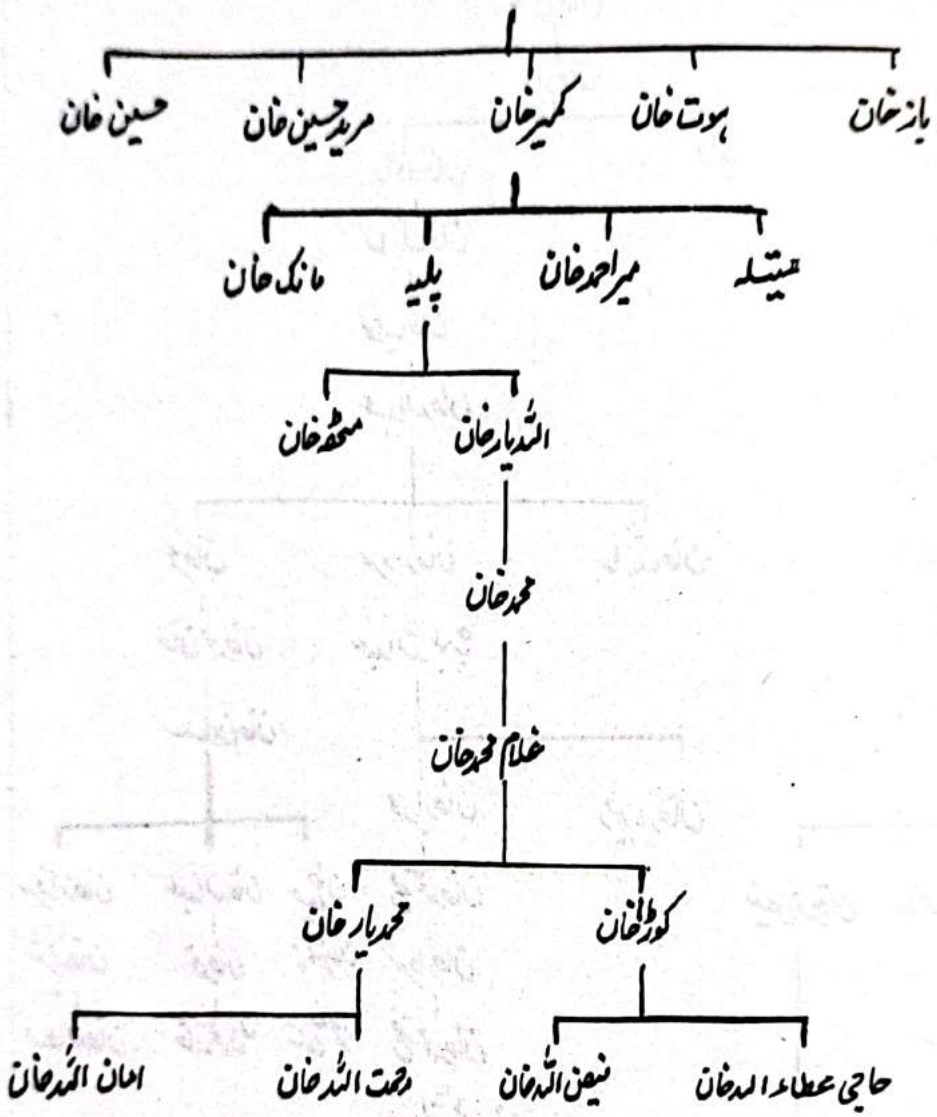

۸۔ سردار سنجر خان
اسحاق خان
داد خان
داؤد خان
ولیہ
سارنگ خان
نواب خان
عبداللہ خان
عمر خان
سردار خان
سارنگ خان
خان محمد خان
عبداللہ بلوچ
سلطان خان
محمد یار خان
رحیم یار خان
سرفراز خان
عبداللہ خان
حیدر خان
شیر محمد خان
محمد خان
خان محمد خان
سلطان محمود
فتح محمد خان
سردار خان
فتح محمد خان
درویش محمد خان
۹۔ سردار جنگو خان
میرآدم خان
خاتن خان
محمد باقر خان
سارنگ خان
یوسف خان
محمد خان
خدابخش خان
فضل احمد خان
خدابخش خان
فضل احمد خان
فیض محمد خان
در محمد خان
خان محمد خان
سردار فضل احمد خان
فاروق احمد خان
منظور احمد خان
در محمد خان
حمید احمد خان
سعید احمد خان

نتکانی ریاست کا قیام: نتکانی قبیلہ کا تعلق بلوچوں کے معروف اور اہم رند قبیلہ سے ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر یا سولھویں صدی کے اوائل میں بلوچستان سے ترک سکونت کر کے یہاں آیا تھا۔ یہ قبیلہ ابتدا میں ہڑند کی سرزمین پر اترا اور ایک عرصہ تک وہاں پر اپنی قسمت آزمائی کرتا رہا۔ بالآخر اسے کامیابی حاصل ہوئی اور چند پشت تک ہڑند کی سرزمین پر رہ کر حکومت کی۔ چونکہ اس قبیلے کے مورثِ اعلیٰ جس نے ہڑند میں مستقل سکونت رکھی تھی۔ میر عالی نوتک خان تھا، چنانچہ اس کی نسبت سے یہ نوتک یا نتکانی قبیلہ مشہور ہو گیا۔

محمد حیات خاں بیدار لکھتے ہیں۔ یہ قوم میر نوتک نامی سے ہے، جو محمد خان کا لڑکا تھا[1] بیدار نے میر عالی نوتک خان کے والد کا نام عبداللہ لکھا ہے مگر یہ اس کا سہو قلم ہے۔ لالہ حکم چند بیان کرتے ہیں کہ میر عالی نوتک خان سیستان سے اٹھ کر پہلے ہڑند میں آیا کہ قبر اس کی ہڑند میں ہے[2]۔ احسن البیان میں ہے محمد خان کو میر چاکر نے دہلی پر حملہ کے وقت بلایا جو لشکر کثیر لے کر اس کی اعانت کو دہلی پہنچ گیا، فتح دہلی کے بعد جب وہ قلات[3] (ہڑند) کو واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ اس پر ناہڑوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس لئے علاقہ سنگھڑ میں جا کر آباد ہو گیا۔

میر محمد خان: میر محمد خان بن میر حسن خان اور میر چاکر خان بن میر شہک خان اپنے وقت کے دو بڑے سردار تھے۔ جب بلوچستان میں تھے تو چاکر خان کل قوم بلوچ کا سردار تھا میر چاکر خان اور میر گہرام خان لاشاری کے درمیان تیس ۳۰ سال میں پچیس ۲۵ بار لڑائی ہوئی جن میں پندرہ لڑائیاں میر چاکر خان اور دس لڑائیاں میر گہرام خان نے جیتیں۔ چنانچہ آخری فتح میر چاکر خان کو نصیب ہوئی۔ اور لاشاری بلوچستان سے بھاگ کر کچھ کاچھی (سندھ) کی طرف چلے گئے۔ اور جو رہ گئے وہ رند قبیلہ کے مطیع و منقاد بن کر رہے۔

اس فیصلہ کن رند و لاشار لڑائی کے بعد میر چاکر خان تیس ۳۰ سال تک علاقہ کچھی مقام فتح پور میں امن و سکون سے بیٹھا رہا۔ اس دوران برصغیر پاک و ہند میں ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میر چاکر خان نے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھانا چاہا اور چاہا کہ پنجاب پر حملہ کر کے اس میں اپنی

---

[1] احسن البیان ص ۵۹۔ [2] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۸۵۔ [3] قلات یا کلات ایسے پہاڑ کے دامن میں واقع قلعہ کو کہتے ہیں۔

حکومت قائم کرے۔ لیکن اس کے عمزادگان میر محمد خان اور میر محمد ابراہیم خان کو اس بات سے اختلاف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہم بلوچ لوگ کوہ و صحرا کے باسی ہیں ہمیں یہ میدان (پنجاب) اور اس کی آب ہوا راس نہیں آئے گی۔ اور ہماری نسلیں آرام طلب اور سست ہو جائیں گی۔ اور ہم اپنی قبائلی روایات کھو بیٹھیں گے۔ مگر میر چاکر خان اپنے اس ارادہ پر قائم رہا اور پنجاب کی فتح پر چل کھڑا ہوا۔ میر محمد خان اور میر محمد ابراہیم خان بادل نخواستہ اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو پڑے۔ یہ دونوں بلوچ سردار اپنا لاؤ لشکر لے کر درّہ کاہا سے باہر ہڑند کے پاس نالہ وزیری پر آکر خیمہ زن ہوئے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمزادگان پنجاب کی اس مہم کے نفع و نقصان پر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ مگر ان میں کوئی فریق اپنے موقف سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہوا۔ اور ان میں کشیدگی بڑھ گئی۔ اس وقت میر محمد خان نالہ وزیری سے اٹھ کر رود کاہا کے دوسرے کنارہ پر چلا گیا اور محمد داہ پر جا کر قیام کیا۔ اب میر چاکر خان کو تشویش ہوئی کہ دوسرے بلوچ عساکر میر محمد خان سے جا کر مل نہ جائیں۔ اور اس کا پنجاب فتح کرنے کا منصوبہ ناکام ہو۔ اس لئے اپنے بلوچی لشکر سے مخاطب ہو کر کہا، کوئی ہے؛ جو محمد داہ پر جا کر میر محمد خان کا سر قلم کر کے لے آئے۔ مگر اس کے لشکریوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس میر محمد خان سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ میر چاکر خاں نے جب یہ جواب سنا تو لشکر کو مقام وزیری سے کوچ کرنے کا حکم دے دیا اور شہر ڈیرہ غازیخان سے چھ میل مغرب میں ایک مقام پر آکر قیام کیا اس مقام پر قدیم دور کے آثار ہنوز موجود ہیں۔ اور وہ "لجہ میر چاکر خان" کے نام سے مشہور ہے چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے وقت کے غازی خان سے میر محمد خان کے خلاف فوجی امداد چاہی۔ جو اسے مل گئی۔ اس موقع پر میر خدا بخش خان بجارانی مری لکھتے ہیں کہ میر چاکر خان اور میر محمد خان کے درمیان سرزمین ڈیرہ غازیخان پر دس سال تک لڑائیاں لڑی گئیں۔ اور یہ لڑائیاں ۱۵۱۱ء سے ۱۵۲۰ء کے درمیان ہوئیں[1] اور نور احمد خان فریدی بیان کرتے ہیں کہ بلوچستان میں رند، لاشار قبائل کے درمیان لڑی جانے والی آخری جنگ ۱۴۸۵ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میر

[1] ۔ ازمنہ بلوچ ص ۶۱۔

چاکر خان نے فتح پور میں رہ کر تیس ۳۰ سال گزارے اور پھر وہ بلوچستان سے پنجاب کو روانہ ہوا۔ اس لحاظ سے میر خدا بخش خان کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ غازی خان دوم کا تھا۔

سردار میرو خان: غرضیکہ غازی خان دوم اور میر محمد خان کے مابین ان لڑائیوں میں سے کسی ایک میں میر محمد خان مارا گیا۔ میر محمد خان کے اس طرح مارے جانے کے بعد جملہ بلوچ لشکر میر چاکر خان سے بدظن ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر میرو خان بن میر محمد خان کے پاس چلے آئے اور اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ ان میں شامل دو بہادر اور مشہور سردار میر بجار خان مری اور میر ہیبتان خان مزاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انہیں لڑائیوں میں میر محمد ابراہیم خان کا لڑکا میر شبیر خان بھی مارا گیا تھا۔ اور اس کا دوسرا لڑکا میر آدم خان برابر ان لڑائیوں میں شریک رہا۔ میرو خان اس وقت ایک طاقتور سردار بن گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس وقت یہ بلوچی قبائل تھے۔ مری، بگٹی، لغاری، بلیدی، دریشک، گورچانی، باقری رحکلانی لنڈ، قیصرانی، جالی، عمرانی، اور جتوئی[1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ میرو خان نے باپ کے مارے جانے کے بعد بھی برابر جنگ جاری رکھی تا آنکہ دو دائیوں کے سات سردار مارے گئے اور وہ ہڑند کا قبضہ چھوڑ کر ڈیرہ غازیخان کو واپس لوٹ آئے تھے۔ چنانچہ فریدی صاحب لکھتے ہیں "میر ہیبتان اور میر بجار تھیڑ جو بلاشبہ میر صاحب (میر چاکر خان) کے دست و بازو تھے۔ میر محمد خان وزیر کے قتل کے واقعہ سے مشتعل ہو کر میر صاحب سے الگ ہو چکے تھے۔ اور لکھتے ہیں "میر چاکر خان تن بہ تقدیر آگے بڑھے ابھی ملتان کے مضافات میں ہی تھے کہ نواب حاجی خان فرمانروائے ڈیرہ غازیخان کا قاصد خط لے کر حاضر ہوا جس میں اس نے ان حملہ آوروں کا ذکر کیا جو میر ہیبتان کی سرکردگی میں ڈیرہ تک بڑھ آئے تھے .... اس نے میر صاحب کے پیغام سے کوئی اثر قبول نہ کیا اور بڑی شدّت سے دودائیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے" آگے چل کر میر بجار خان کے متعلق اس طرح لکھا ہے "اس بار میر بجار پھر سنگ راہ بن گیا۔ میر حاجی خان نے لکھا کہ، میر بجار نے کوہ سلیمان کے بلوچوں کی مدد

[1] تاریخ بلوچستان صفحہ ۱۷۱

سے میرے ملک کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا ہے ۔ اس کی جمعیت کافی ہے اور میں تنِ تنہا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا "[1]

الغرض ایک غیر معیّنہ عرصہ تک سردار میرو خان ہڑند میں رہا ۔ اپنے والد میر محمد خان کا مقبرہ تعمیر کرایا ۔ یہ مقبرہ ہڑند سے متصل موضع گرکنا وزیری میں بوسیدہ حالت میں اب بھی موجود ہے اور اپنے عہد رفتہ کی تاریخ کو زبانِ حال سے بیان کر رہا ہے ۔ ازاں بعد سردار میرو خان ہڑند کی حکومت اپنے چھوٹے بھائی میر عالی نوتک خان کے حوالے کر کے خود اندر پہاڑ واپس چلا گیا ۔ موجودہ علاقہ قیصرانی سے باقرانی (بھکرانی) تک کے تمام بلوچ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ۔ اور ہمیشہ کیلئے اپنا سردار مان لیا ۔ چنانچہ یہی میرو خان موجودہ تمن ڈومبکی کا بانی اور مورثِ اعلیٰ ہے ۔

تاریخ بلوچستان میں اس تمام واقعہ کو بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے ۔ " میر چاکر بنیاد و بیخ لاشاریاں برکندیدہ و نشست و تخت گاہ خود در ملک کچھی در رود خانہ ناڑی .... سکونت نمود ۔ و ہمیں شہر را نام فتح پور نہاد .... و مدت سی سال در فتح پور بتمام امن و عافیت و بفرصت کمال حکمرانی نمود ۔ پس بہ عمزادگان خود یعنی میر محمد خان و میر محمد ابراہیم خان رنجیدہ گشت ۔ و بخیال گرفتن ملک پنجاب و ہندوستان کوچیدہ رواں گشت ۔ و عمزادگان نیز تنہا از او طاقت نشستن ندیدہ بہمراہ میر چاکر کوچیدند ۔ و در آں وقت ملک پنجاب و ہندوستان زیر حکمرانی پادشاہ ہمایوں خان چغتہ بود ..... میر محمد خان و میر محمد ابراہیم خان ہر دو عمزادگان از میر چاکر رنجیدہ از مقام وزیری کوچ نمودند ۔ پس میر چاکر خان در دل خود خیال نمود ، کہ مبادہ بلوچاں ہمراہ عمزادگانم بروند ، مناسب است کہ بکدام تجویز عمزادگان خود را بکشانم ۔ پس تمام بلوچاں را گفت کہ رفتہ محمد و ابراہیم را بکشند ۔ کسے از بلوچاں طاقت مقابلہ ہمراہ محمد و ابراہیم نداشتند ۔ آخر الامر قوم ددرائی تیار شدہ در محمد واہ رفتہ ہمراہ محمد و ابراہیم جنگ نمود ، و میر محمد خان و میر شبیر خان کہ پسر میر براہم خان بودند بقتل رسانید و ابراہیم نیز بمقام لونی وفات یافت ۔ و پسر محمد خان ، میرو خان و پسر میر براہم خان ، آدم خان بودند ۔ و در کوہ سلیمان سکونت نمودند

[1] بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۲۴۹ تا ۲۵۱

مقبرہ میر عالی نوتک خاں واقع ہڑند

مقبرہ میر آدم خان واقع منگڑوٹھہ غربی ۔

دسردار میروخان شد . . . . چونکہ میرچاکر عمزادگان خود را بقتل رسانید، پس اکثر بلوچاں از او بیدل و رنجیدہ شدہ سرداری میروخان بر سر خود قبول نمودہ بہ میرچاکر نرفتند۔ تمام نزد سردار میروخان آمدند۔ وازیں ملک بلوچستان تاحد قیصرانی و باترانی تمام بلوچاں سرداری منظور نمودہ نشستند۔ درمقدم بجار آدم پھٹر رند کہ لیکال تمن بود نیز ہمراہ میروخاں متفق شدہ۔ چنانچہ الحال اولاد بجارخان درتمن مری بجارانی مشہور اند۔ و دراین وقت سردار میروخان را کمال قرت شد۔ نہ بہ دودائی ہا را خصومت شد، و ہرکس کہ از دودائی ہا سردار مے شد اورا ڈومبکیاں مے کشتند۔ تاکہ ہفت سرداران دودائی ہا را بکشتند۔ بعدازاں از خوف کسی سردار دودائی نمے شد۔ وسرداری دودائی کم شدہ رفت، و میروخان سکونت درکوہ سلیمان نمود۔[51]

غرضیکہ سردار میروخان کی اولاد بعد میں ڈومبکی مشہور ہوگئی۔ جس کا ایک حصہ بدستور علاقہ لڑی بیں مری اور بگٹی تمنات کے درمیان آباد چلا آتا ہے اور دوسرا حصہ سرحد سندھ پر جیکب آباد کے پاس رہتا ہے۔ میر محمد خان کی نسبت سے یہ قبیلہ محمدانی بھی کہلاتا ہے اس قبیلہ کی دوسری بڑی شاخیں وزیرانی اور جھکرانی ہیں۔ اس قبیلے میں میر بجر خان ایک زبردست اور طاقتور سردار ہوگزرا ہے۔ جس نے اپنے دور میں انگریزوں کو ناک چنے چبوائے تھے۔[52]

اس قدر واضح بیانات کے باوجود نور احمد خان فریدی رقمطراز ہیں کہ میر محمد ابراہیم خان نے جنگ میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مقام لونی پر وفات پائی۔ اور میروخان بن میر محمد خان اور آدم خان بن میر محمد ابراہیم خان کم سن بچے تھے۔ اور لڑائیوں میں زندہ بچ رہے تھے۔ جنہوں نے کوہ سلیمان کی دشوار گزار گھاٹیوں میں روپوش ہوکر جان بچائی۔

میر چاکر خان کے متعلق لکھتے ہیں "میر چاکر خان قبائلی تنظیم کے سلسلے میں روجھان مزاری میں مقیم تھا۔ اسے شہنشاہ ہمایوں کی صحرا نوردی کا علم ہوا تو وہ کوہستان مری میں پہنچ کر بادشاہ سے ملا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔ "بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چاکر خان اعظم نے خود ایران جاکر شہنشاہ سے ملاقات کی اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔"

" دوسری بار وہ قندھار میں بادشاہ سے ملا اور ۹۶۲ھ میں جب ہمایوں ہندوستان پر

---

۵۱ . چونکہ یہ قبیلہ ایک گہری (ڈھونگی) ندی پر آباد تھا اس لئے ڈومبکی مشہور ہوگیا۔ تاریخ بلوچستان صفحہ ۷۲۔

۵۲ . تاریخ بلوچستان ص ۶۵ تا ۶۷۔ ۵۳ - ایضاً ذکر تمن ڈومبکی

وہ اس مقبرہ کی دیکھ بھال اور جھاڑو بہار بھی کرتے ہیں اور نذریں اور چڑھاوے بھی چڑھاتے ہیں یہ رسم دراصل دادا کی جھنڈے کے نام سے پڑی تھی جو اب ایک مستقل نذر و نیاز کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ یہ مندرانی خاندان بھی میر عالی نوتک خان کی اولاد سے ہیں۔ اور موندر خان کی نسبت سے مندرانی مشہور ہیں۔ اس خاندان کا اس وقت وڈیرہ امام بخش خان ہے۔ ان لوگوں کی گزر معاش کھیتی باڑی پر ہے۔

یہاں پر یہ بیان کر دینا مناسب نہیں ہوگا کہ نور احمد خان فریدی کو میر عالی نوتک خان کے والد میر محمد خان کے نام اور اس کے لڑکوں کی تعداد پر اختلاف رائے تھا۔ ان کے سامنے صرف ایک کتاب گل بہار تھی جب کہ مجھے "صاحب البیت ادری بما فیہا" کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں پر اِن اختلافات کو چھیڑنا اور ان پر حرف گری کرنا گویا کہ "الف لیلہ" کی داستان بیان کرنا ہے۔ صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ میری نظر میں لالہ حکم چند کی تواریخ ڈیرہ غازیخان اور محکمہ مال کا ریکارڈ ایزادی طور پر تھا۔ اسی طرح فریدی صاحب کی نظر میں احسن البیان بھی نہیں گزری تھی۔ بہرحال اگر کوئی صاحب اس بحث میں جانا چاہے تو ہفت روزہ بلال ڈیرہ غازیخان کے شمارہ ہائے ۱۳ نومبر ۶۸ء اور ۲۴ ستمبر و ۳ دسمبر ۶۹ء ملاحظہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی ماہنامہ بلوچی دنیا کے شمارہ جات اگست، ستمبر اور نومبر ۶۹ء پر ایک طائرانہ نظر ڈال لے۔

غرضیکہ ناہڑ خاندان کے بیان میں پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ وہ سلطنت دہلی کے اجارہ دار ہوتے تھے۔ اور انہیں مرکزی حکومت کا تحفظ حاصل تھا۔ لیکن جب ہمایوں بادشاہ دہلی کے یہاں سے پاؤں اکھڑ گئے اور شیر شاہ سوری نے اسے ایران بھاگ جانے پر مجبور کر دیا، اور خود ملک کے انتظام میں مصروف ہو گیا تو یہ چھوٹے چھوٹے اور علاقائی سردار بھی خود مختیار ہو گئے جہاں انہیں یہ آزادی حاصل ہوئی وہاں ان کا تحفظ بھی جاتا رہا۔ چنانچہ یہی وہ دور تھا جبکہ غازی خان دوم اور میر چاکر خان مل کر ہڑند کے علاقہ میں میر محمد خان اور اس کے بلوچی عساکر کے ساتھ دس سال تک لڑتے رہے۔ اور ناہڑ اس وقت یا تو گوشہ گیر ہو بیٹھے اور بلوچوں کی

حملہ آور ہوا تو جو اکبر اعظم چالیس ہزار کا لشکر جرار جلو میں لئے ہوئے اس کے ہمراہ تھا۔ یہ بلوچوں کے مایۂ ناز سپوت پر ایک بڑا بہتان ہے اور بلوچی تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے چونکہ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے اس لئے قارئین کتاب تاریخ بلوچستان کا دیا گیا فارسی اقتباس ایک بار پھر پڑھ لیں اور فریدی صاحب کے ان اقتباسات سے اس کا موازنہ کریں۔

میر عالی نوتک خان:۔ محمد حیات بیدار نے میر محمد خان کے چار لڑکے گنائے ہیں یعنی میرو خان، میر عالی نوتک خان، اِسحاق خان اور بہادر خان۔ اِسحاق خان کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ وہ اندر پہاڑ علاقہ کچھی میں واپس چلا گیا تھا۔ اس کی اولاد وہاں پر بدستور آباد ہے اور اِسحاقانی کہلاتی ہے۔ اس نے اپنا سلسلہ نسب بھی اِسحاق خان کی اولاد سے ملایا اور اپنے آپ کو اس کی اولاد میں لکھا ہے۔

بہادر خان کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ وہ دہلی کے مضافات میں جا کر آباد ہوا تھا اور وہاں پر بہادر گڑھ نام کی آبادی قائم کی تھی۔ جو بعد میں ایک مشہور و معروف شہر بہادر گڑھ نامزد ہوا[1]۔ مگر ہمارے خیال میں اسے دھوکا ہوا ہے۔ یہ آبادی بہادر گڑھ کی نہیں بلکہ بہادر کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ کوٹ جھنگ میں تھا جس کے اب آثار باقی رہ گئے ہیں۔ یعنی بہادر خان دہلی میں نہیں بلکہ جھنگ میں جا کر آباد ہوا تھا۔ خود محمد حیات خان بیدار بھی اسی جھنگ سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال سردار میرو خان کی اندر کوہ سلیمان واپسی کے بعد ہڑند کی عنانِ اقتدار میر عالی نوتک خان نے اپنے ہاتھ میں لی، اور وہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی چنانچہ آپ نے جب وفات پائی تو آپ کو اپنے والد میر محمد خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات کے تیسرے روز آپ کی ایک بیوی فوت ہوئی تو اسے آپ کے پہلو میں اسی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ یہ تینوں قبریں اب بھی موجود ہیں۔ جو اسی مقبرہ میں ہیں۔ میر عالی نوتک خان کی زندگی کے آخری ایام اکبر اعظم کے دور سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ مقبرہ بلوچی روایات کے مطابق تعمیر ہوا تھا اور اس پر قبہ بنا ہوا تھا اس لئے اس قبرستان کا نام قبے والا قبرستان ہے اور یہ مقبرہ میر عالی نوتک خان کے نام سے مشہور ہے۔ صاحب مزار کو لوگ پیر و مرشد بھی مانتے ہیں اس لئے اسے قبے والا پیر اور عالی مرشد کہتے ہیں۔ یہ مقبرہ اپنے دور کے بہترین مقابر میں شمار ہوتا ہے اپنی نفاست اور صناعی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس مقبرہ کے پاس شرقاً اور غرباً دو بستیاں قائم ہیں وہاں پر مندرانی خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ وہ

[1] بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۲۴۴ [2] احسن البیان ص ۵۱

اِس لڑائی کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے، پھر اس وقت ہڑند کا علاقہ غازیخان اوّل کے دور سے برابر میرانی خاندان میں چلا آرہا تھا۔ یہی دوسری صورتحال صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال آخری نتیجہ نوتک قبیلہ کے حق میں ظاہر ہوا، اور وہ ہڑند میں آباد ہوگیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے بعد جب اکبر اعظم کا دور آیا تو ناہڑ سرداروں نے پھر سر اٹھایا اور شہنشاہ وقت سے جاکر اِستدعا کی اور اپنا پرانا حق اور ہڑند کا قبضہ حاصل کرلیا جو انہیں سابق روایات کے مطابق اجارہ پر دے دیا گیا۔ تاریخی حالات کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت سلطان محمد خان ناہڑ نے ہڑند کا اجارہ حاصل کرلیا اور اسے سیت پور کی حکومت میں ملا لیا تھا اب نوتک قبیلہ کو وہاں سے بیدخل ہونا پڑا اور وہ اندر درّہ کاہا سے گزر کر کوہ سلیمان میں محاذ منگروٹھ پر چلا آیا۔ اس وقت ناہڑوں سے جنگ کرنا گویا کہ شہنشاہ دہلی سے لڑنا تھا۔ نتکانی قبیلہ کے لوگ اندر درہ سنگھڑ مقامات بارتھی، سومن، کیچی، کچھی، گلکی، کرنی، پٹھانی، نکسٹھ اور کچھی مہوئی پر آکر قابض ہوگئے۔ اِن علاقوں میں اس وقت افغان رہتے تھے۔ افغانوں سے لڑائی کی اور انہیں مغلوب کیا اور اِن علاقوں سے نکال دیا۔

تواریخ ڈیرہ غازیخان میں ہے کہ میر عالی نوتک خان نے ہڑند میں وفات پائی اور اس کی اولاد نے وہاں سے کوچ کیا اور اندر کوہ سلیمان محاذ منگروٹھ پر آکر قیام کیا۔ اس وقت اِس موقع پہاڑ میں پٹھان لوگ رہتے تھے جنہیں نتکانیوں نے وہاں سے نکال دیا اور خود اس پر قابض ہوگئے۔[۵۱] تذکرہ رؤسائے پنجاب میں ہے کہ نتکانی قوم علاقہ سنگھڑ اور اس سے ملحقہ پہاڑیوں میں اپنی سکونت اختیار کرلی۔[۵۲]

رائے بہادر ستھورام لکھتے ہیں: نتکانی اندر پہاڑ کوہ بارتھی، سومن، کیچی، گلکی، کرنی، پٹھانی نکسٹھ اور کیچی مہوئی میں آئے اس وقت یہاں پر افغان رہتے تھے انہیں نکال باہر کیا اور خود قابض ہوگئے۔[۵۳]

محکمہ مال بندوبست قانونی ۱۸۷۲ء کے بیانات میں ہے۔ یہ ملک (سنگھڑ) نوتک خان نے جانب (طرف جنوب) سے آکر بذریعہ لڑائی لیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سنگھڑ کا علاقہ بادشاہ دہلی (اکبر اعظم) نے بلا اخذ نذرانہ عطا کیا۔

۵۱۔ کتاب مذکور ص ۸۵ ۔ ۵۲ تذکرہ رؤسائے پنجاب ج۔ ص ۶۴۳ ۔ ۵۳ ایضاً گل بہار ص ۱۸۷

مؤرخین کا یہ بھی بیان ہے چونکہ ننکانی قبیلہ مالدار لوگ تھے اور مال مویشی چراتے ہوئے پہاڑ (درہ سنگھڑ) سے باہر نکل آئے تھے اور ان کے مال مویشی یہاں کے باشندوں کی کھیتی کا نقصان کرتے تھے۔ جس کے باعث آئے دن لڑائی ہو جاتی اور نوبت جنگ و جدل تک پہنچ جاتی تھی۔ اِن لڑائیوں کے دوران اکثر مردم گاڈی اور لنگاد مارے گئے۔ کچھ رُوپ فرار ہو کر مظفر گڑھ کو نقل مکانی کر گئے اور جو بچ رہے وہ تابع ہو کر رہے۔ ان اقوام کی صرف دو آبادیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک گاڈی دوسری لنگاہ، جو تاحال موجود اور آباد ہیں۔

سردار ملغ خان:۔

الغرض جب یہ قوم ہڑند سے چل کر اندر درہ سنگھڑ چلی آئی، تو اس کا سردار ملغ خان بن میر عالی نوتک خان تھا۔ اور اس نے اندر پہاڑ وفات پائی اور اس کی قبر محلہ توخ کے مقام پر موجود ہے۔ جو غیر معمولی طور سے لمبی بتائی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگ غالباً اِسے کسی اصحاب کی قبر سمجھتے ہیں۔

سردار لعل خان:۔ سردار ملغ خان کے چار پسر تھے۔ جن میں بڑا لعل خان تھا، ان دنوں سید طاہر شاہ بخاری مشہور دین پناہ صاحب کے زہد و ورع اور تقویٰ کا بڑا چرچا تھا۔ اور ان کی نیکی اور پارسائی کی ہر طرف دھوم تھی، دور دور سے لوگ آکر ان کے دست حق پرست پر بیعت ہو رہے تھے۔ اور اپنی عقیدتمندی کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ نوتک قوم کے بڑے بڑے سردار بھی ان کی بیعت سے مشرف ہوئے اور ان کی عقیدتمندی کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے اکثر نے "دین پناہ کے اصحاب" کا لقب پایا۔ چنانچہ سردار لعل خان بھی شاہ صاحب کے مریدانِ خاص میں سے تھا اور لعل اصحاب کے نام سے مشہور تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لعل خان کا باپ سردار ملغ خان بھی دین پناہ صاحب کے مصاحبین میں سے تھا اور ان کا مرید تھا۔

ہر کیف باپ کی وفات کے بعد لعل خان قوم نوتک کا سردار تسلیم کر لیا گیا۔ چنانچہ اس نے درہ چٹ پانی پر ایک کوٹ (قلعہ) تعمیر کرایا۔ جو سادہ پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے رہائشی مکانات اور گھوڑوں کا اصطبل بنوایا تھا۔ چنانچہ اِن عمارات کے آثار بدستور موقع پر موجود ہیں۔ اور اپنی گزشتہ تاریخ کی داستان سنا رہے ہیں۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب میں سنگھڑ میں نتکانی ریاست کے قیام کے متعلق کہا گیا ہے، کہ نتکانی سردار مسو خان کے عہد سے پہلے نتکانی قوم کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی گئی۔[1]

غرضیکہ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ میر عالی نوتک خان کے ہر لڑکے کے نام پر ایک علیحدہ خاندان وجود میں آیا تھا۔ اب جبکہ نوتک قوم اندر درہ سنگھڑ سے باہر میدان کی طرف نکل رہی تھی۔ تو یہ اپنی انہیں شاخوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اپنے اپنے محاذ کے درہ سے باہر منتقل ہو رہی تھی جیساکہ سردار لعل خان نے اول آبادی رکوٹ اچٹ پانی کے درہ پر تعمیر کی اور وہ اسی درہ سے باہر میدان کو نکلا۔ جہاں اور اس کا سامنا وہاں پر آباد قوموں سے ہوا۔ جس میں گاڈی اور لنگاہ کا نام صف اول میں آتا ہے۔

جو نتکانی خاندان درہ سنگھڑ سے باہر آئے انہیں جچہ اور بھٹہ سے لڑنا پڑا، اسی طرح درہ مہوئی کے باہر جٹ مکول سے مسابقہ ہوا بہرکیف سردار ملغ خان کے دور میں سید طاہر شاہ بخاری نے فریقین ملغ خان اور جٹ گاڈی قبائل میں صلح و صفائی کی کوشش کی گئی مگر گاڈی نہیں مانتے تھے۔ اب لعل خان کا زمانہ تھا۔ اس نے درہ چٹ پانی پر بیٹھ کر گاڈی اور لنگاہ اقوام پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر دوسرے علاقوں کی طرف نقل مکانی کر گئے اور جو رہ گئے انہوں نے اطاعت قبول کرلی۔ اب لعل خان میدان میں نکل آیا "سوکڑ" اور "لعلو" دو قصبات آباد کئے۔ لعلو تو لعل خان کی نسبت سے مشہور ہوا اسے اس نے اپنا صدر مقام بنایا۔ جبکہ قصبہ سوکڑ کا نام وہاں کی فصلات کے سوکھ جانے کی وجہ سے سوکڑ مشہور ہوگیا۔ لعل خان کے باقی تین بھائیوں کی اولاد سوکڑ میں آباد ہوئی اور لعل خان کی اولاد اس کی نسبت سے "لعلوانی" کہلاتی ہے۔ لعل خان کی اولاد کچھ لعلو میں اور کچھ قصبہ نتکانی میں آباد ہے۔ لعل خان جب فوت ہوا تو اس کی قبر غیر معمولی طور پر لمبی بنائی گئی جو درہ چٹ پانی پر موجود ہے۔ لوگ اسے "لعل اصحاب" کہتے ہیں۔ اس کی قبر پر جاکر منتیں مانتے ہیں اور نذر گزارتے ہیں یہ قبر بارہ قدم لمبی اور دو قدم چوڑی ہے لیکن زیادہ بلند نہیں ہے۔

سردار میر احمد خان:۔ اگرچہ گل بہار میں سب سے پہلے جس نتکانی سردار کا ذکر ملتا ہے وہ میر احمد خان بن صاحب خان ہے۔ جو میر عالی نوتک خان کے ایک لڑکے میرو خان کی اولاد سے

[1]۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب ج ۲ ص ——

تھا۔ مگر زیادہ تفحص اور جستجو کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی دستارِ فضیلت ملغ خان اور اس کی اولاد میں رہی ہے، جو چند پشتوں کے بعد میرو خان کی اولاد کو منتقل ہوگئی۔ سردار میر احمد خان نے ریاست کا انتظام سنبھالتے ہی قصبہ لعلو کی بجائے "بنڈی" کو اپنا مستقر بنایا اور ریاست کے صدر مقام کی حیثیت دی۔ یہ قصبہ بھی لعلو کی طرح دریائے سندھ کے کنارہ پر تھا۔ جو لعلو سے چار میل جنوب میں واقع تھا۔

لالہ ہتو رام کا بیان ہے کہ میر احمد خان کے دور میں نتکانی اور سوری لنڈ بلوچ قبائل کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لنڈ اس وقت پہاڑ سے میدان کی طرف آنا چاہتے تھے ان کی پیشقدمی کو روکنے کیلئے یہ لڑائیاں لڑی گئیں۔ غرضیکہ میر احمد خان جب فوت ہوا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا اللہ یار خان ہوا مگر اس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ یار خان کے دور کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اس سلسلہ میں تاریخ خاموش ہے۔

سردار شیر خان: چونکہ بلوچوں میں اس وقت اس قسم کا رواج چلا آتا تھا، کہ قبیلے کا جو شخص دوسروں کی نسبت اپنی ذاتی خوبیوں کے باعث زیادہ باکردار سمجھا جاتا تھا سرداری کا منصب اسے ہی ملتا تھا، چنانچہ اللہ یار خان کے بعد یہ منصب ایک بار پھر ملغ خان کی اولاد میں منتقل ہوگیا اور شیر خان جو لعل خان بن ملغ خان کی اولاد سے تھا برسرِ اقتدار آگیا۔ شیر خان کے نام سے بہرکیف "دلیری" کی توقع کی جاسکتی ہے روباہی اور بیشی کی نہیں

شیر خان نے ریاست سنگھڑ کے صدر مقام کو پھر سے بنڈی کی بجائے لعلو کو بنایا اور خود بھی اسی میں رہتا تھا شیر خان کے دور میں پہاڑ نشین بزدار بلوچ میدان میں آکر ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ مال مویشی اور جو کچھ ہاتھ لگا لوٹ کر بھاگ جاتے۔ شیر خان نے ان کی ہر قسم کی بھگی اور ڈاکے کو بزور شمشیر روک دیا تھا جب تک وہ زندہ رہا یہ لوگ پہاڑ سے باہر پھر نہیں نکلے

دلشاد خان قیصرانی کا سنگھڑ پر حملہ:۔ سردار شیر خان کے دور کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ غازی خان سوم سردار شیر خان نتکانی کا حلیف اور وفادار دوست تھا۔ اس زمانہ

میں دِلشاد خان قیصرانی نے درّہ کنّواں سے نکل کر سنگھڑ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کر کے اندر پہاڑ واپس لوٹ گیا اس طریقۂ واردات کو اس نے اپنا معمول بنالیا۔ چنانچہ سنگھڑ پر اس نے کئی بار حملے کئے اور بچ کر نکل جاتا رہا۔ شیر خان نے اس کی اس بھگدی کو مستقلاً بند کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور غازیخان سوم سے نامہ و پیام کر کے ایک تربیّت یافتہ فوجی لشکر منگوالیا۔ چنانچہ شیر خان نے اس فوج کی مدد سے دِلشاد خان قیصرانی کو اندر درہ کنّواں روک لیا۔ اور اسے دوبارہ باہر آنے کا موقع نہ دیا۔ غازی خان کی اس فوج کو اس نے مستقل طور سے درہ کنواں کے باہر بٹھا دیا، اور ان کے پینے کے پانی کا بندوبست ایک کنواں کھدوا کر کر دیا۔ یہ کنواں بدستور کوٹ قیصرانی میں موجود ہے، اور چاہ خان والا (غازیخان والا) کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کنویں میں کام آنے والی اینٹیں قصبہ ناڑی میں پکائی گئی تھیں اور فوج کے ہاتھوں ہاتھ دست بدست کوٹ تک پہنچائی گئیں۔

چنانچہ دِلشاد خان قیصرانی نے جب یہ صورتحال دیکھی اور میدان میں اپنے رستے کو مسدود اور تنگ پایا تو ٹانک کی طرف چلا گیا اور "قتل خان" کٹھ خیل نواب ٹانک کی جا کر ملازمت اختیار کی۔[1]

شیر خان کے انجام کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیسے اور کیا ہوا، کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے سندھ کو چلا گیا تھا، جو کوٹ کر واپس نہیں آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرزا شاہ حسن ارغون نے ان دنوں ملتان پر حملہ کیا تھا۔ ڈیرہ غازیخان میں بھی آیا۔ اور غازی خان سوم کا قلعہ دِلورائے میں کئی دن تک محاصرہ کئے رکھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ سنگھڑ میں بھی آیا ہو اور شیر خان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ سندھ کو لے گیا ہو۔ جہاں پر شیر خان نے قید تنہائی میں دن کاٹ کر قیدِ حیات سے رہائی پائی۔

[1] - گل بہار ص ۲۹۴۔

سردار میر آدم خان :- سردار شیر خان کے بعد میر آدم خان ریاست سنگھڑ کا حکمران ہوا۔ میر آدم خان، میر عالی نوتک خان کے تیسرے لڑکے کارٹ خان کی اولاد سے تھے۔ راج بمعنی ریاست اور میر بمعنی سردار اس لیئے یہ سردار راج میر کے نام سے مشہور تھے اب غلط العام ہو کر "لاج میر" بولا جاتا ہے چونکہ اِس خاندان کا تعلق منگروٹھ غربی سے تھا اِس لئے میر آدم خان نے ریاست سنگھڑ کا صدر مقام بھی لعلو سے منگروٹھ میں منتقل کر دیا جو تا دمِ آخر چلا آیا۔

راج میر (میر آدم خان) نے آبنوشی کی خاطر ایک راجباہ بھی کھدوایا تھا جو تا ہنوز موجود ہے اور "راج واہ" کے نام سے مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر آدم خان نے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ جس میں وہ اور فوجی عساکر رہا کرتے تھے آثار اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ قصبہ رود سنگھڑ کے کنارہ پر واقع تھا جس کے آثار سوکڑ کو جانے والے راستہ پر پڑتے ہیں۔ یہ قصبہ سنگھڑ کی تیز رو لہروں کی نذر ہو گیا یا کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو گیا تھا، کیونکہ موقع پر موجود آثار میں راکھ کی موٹی اور دبیز تہیں ملتی ہیں جو مسلسل چلی گئی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کسی بیرونی حملہ کے وقت اس قصبہ کو نذرِ آتش کیا گیا تھا۔ بہرحال اس قدیم قصبہ سے چند نادر تاریخی اشیاء ملی ہیں جن کا فوٹو کسی اور مقام پر دیا گیا ہے

لالہ ہتو رام میر آدم خان اور اس کے بیٹے فتح محمد خان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے دور میں زیادہ تر لڑائیاں قیصرانی بلوچوں سے لڑی گئیں، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان دِنوں دِلشاد خان قیصرانی علاقہ ٹانک سے واپس آگیا تھا اور اس نے دھوا کے پاس مقام قیصرانیوالہ پر اپنی سکونت رکھ لی تھی۔

ہتو رام ان لڑائیوں کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قیصرانی اندر پہاڑ درہ کنّواں میں رہتے تھے اور نتکانی سرداروں سے وہ زمینیں لے کر کاشت کیا کرتے۔ جب فصل کی بٹائی کا وقت آتا تو راتوں رات اسے اٹھا کر اندر پہاڑ بھاگ جاتے اور بٹائی ادا نہ کرتے تھے یا پھر بٹائی کے وقت نتکانی کارداروں سے خواہ مخواہ جھگڑ پڑتے اور انہیں موقع پر

مار ڈالتے اور خود نسل اٹھا کر رنو چکر ہو جاتے تھے اس طرح فریقین کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو کسی نئے عہد و پیمان پر منتج ہوتا[1]۔ بہرکیف ان لڑائیوں میں فریقین کا بہت سا مالی اور جانی نقصان ہوتا۔ ایک موقع لڑائی میں نتکانی لشکر کی طرف سے محمد سلیمان خان رئیس منگروٹھ اور لسکانی سردار محمد خان مارے گئے تھے۔

الغرض جب میر آدم خان فوت ہوا تو اس کا ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جو اپنی سطوت رفتہ کے نشان لئے ہوئے منگروٹھ غربی سے ایک میل مغرب میں واقع ہے اور لاج میر کے نام سے مشہور ہے یہ بہترین عمارت کا مظہر ہے اور بلوچی فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ چونکہ بلوچوں میں "دادا کی جھنڈی" دینے کا رواج تھا، جس کے بعد وہ ایک مستقل رسم کی صورت اختیار کر گئی لوگ اسے کراماتی بزرگ سمجھ کر ماننے لگے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ مگر مقبرہ میں موجود اور ظاہر قبر بعد کی ہے۔ قبر کا اصل تعویذ جس کا تعلق میر آدم خان سے ہے وہ مقبرہ کے درمیان مٹی اور اینٹوں کے نیچے دب کر رہ گیا ہے جس کے دوبارہ برآمد کرنے کی ضرورت ہے دیکھیں یہ سعادت کس کو حاصل ہوتی ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نواب محمد مسو خان :۔ سردار میر آدم کے بعد اگرچہ اس کا لڑکا فتح محمد خان والی ریاست ہوا مگر اس کے حالاتِ زندگی نہ ملنے کے باعث یہاں پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ہتیو رام کے بیان کے مطابق سردار فتح محمد خان اور پھر اس کا بیٹا لعل خان ریاست سنگھڑ کے حکمران ہوئے اور ان کا عہدِ حکومت زیادہ تر قیصرانی بلوچوں کے ساتھ لڑتے اور ان کی شورشیں دباتے گزر گیا۔

تذکرہ رؤسائے پنجاب کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ سنگھڑ میں نتکانی ریاست کے قیام سے متعلق نواب محمد مسو خان سے قبل کوئی تاریخ مرتب نہیں کی گئی ہے۔

[1] گل بہار صفحہ ۲۸۹ - ۲۹۵۔

مسو خان کے دور کا بھی ہم صحیح تعین نہیں کر سکتے۔ البتہ ہتیو رام کی ایک روایت سے مترشح ہوتا ہے کہ سردار محمد مسو خان کا دور نادر شاہ افشار کے ابتدائی عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ مسو خان سے اس کے پوتے اسد خان تک نتکانی سرداروں نے ایک سو سال تک حکومت کی۔ اسد خان کا آخر دور ۱۸۳۶ء ہے اور نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں قندھار کا حکمران ہوا تھا۔ بہرکیف نادر شاہ نے جب دہلی پر حملہ کیا اور دریائے سندھ سے مغرب کے ممالک کی سندِ حکومت اپنے نام حاصل کر لی تھی۔ اس وقت نادر شاہ نے مسو خان کو خطاب نوابی اور خلعت عطا کیا، اور سندِ حکومت دی اور اپنا باجگزار بنا لیا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ درانی نے کابل و قندھار کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے بھی خلعت کے ساتھ سندِ حکومت کی توثیق کر دی ۱۷۶۹ء میں احمد شاہ نے جب دوسری بار میاں غلام شاہ کلہوڑہ کو ڈیرہ جات کی حکومت تفویض کی، اور غلام شاہ نے یہاں پہنچ کر غازیخان آخر کو گرفتار کیا، اس وقت بعض دیگر سرداروں کے ساتھ مسو خان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان سب کو وہ اپنے ساتھ سندھ لے گیا تھا۔ جہاں پر بعض کو جیل میں ڈال دیا اور بعض رہا ہو کر اپنے علاقہ کو واپس آ گئے چنانچہ سردار محمد مسو خان بھی رہا ہو کر واپس آ جانے والوں میں سے تھا۔[1] لالہ حکم چند کے الفاظ ہیں کہ اس وقت نتکانی حکومت کا بڑا زور تھا جو اس قوم کے آخری نواب محمد اسد خان تک برابر رہا۔[2]

نواب محمد مسو خان کے عہد میں ریاست سنگھڑ کی حدود اس طرح تھیں شمال میں گڑانگ (فتح خان)، اور دہوا تک مشرق میں لیہ کا وہ علاقہ جو کچھی کہلاتا ہے اور پہاڑپور (سوبا تھل) اور دائرہ دین پناہ کا علاقہ کچھی اور جنوب میں احمدانی (قصبہ، مٹی بھوئی اور مغرب میں اندر درہ سنگھڑ در بھلہ اور ڈڈھاچی شامل ہیں۔ اسد خان کے دور میں شمال سے گڑانگ اور فتح خان سے لے کر حدود ریاست سنگھڑ موجھنگی اور دہوا تک رہ گئی تھیں۔ جبکہ باقی حدود بدستور قائم رہیں۔

۱۔ بہرحال ہتیو رام کے بیان کے مطابق سردار محمد مسو خان کے وقت علاقہ فتح خان کے کلاچیوں

[1] گل بہار ص ۹۔ [2] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۷۹۔

قلعہ منگروٹھ

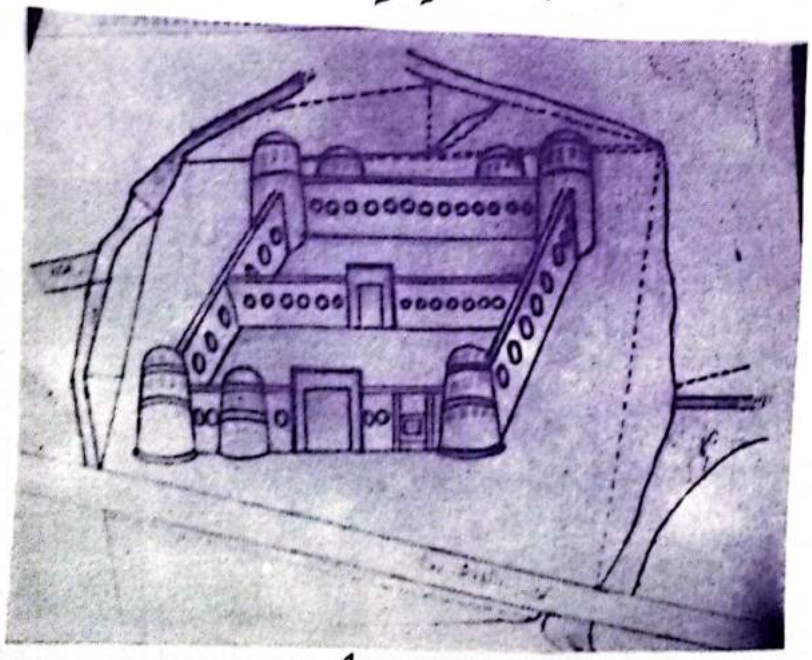

قلعہ منگروٹھ

اور کچھی و تحصیل لیہ ، کے بسکانیوں کے ساتھ لڑائیاں رہیں ۔ کبھی فتح اور کبھی شکست کی صورتحال رہی ۔ اسی مصنف کا بیان ہے کہ حل نواز پسر دلشاد خان قیصرانی کا محمد مسوخان نتکانی سے اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں ۔ سردار برخوردار خان کھوسہ آپ کے پاس آیا اور کچھ فوجی خدمات انجام دیں جس سے خوش ہوکر نواب صاحب نے اسے مٹی اور مہوئی میں جاگیر دی ، ساتھ ہی اپنی ایک پوتی کا رشتہ اس کے لڑکے کوڑا خان سے کردیا ۔ یہ بی بی علی اکبر خان کی لڑکی اور اسد خان کی ہمشیرہ تھی۔[1]

نواب محمد مسوخان اپنے وقت کا ایک طاقتور اور منتظم حکمران تھا اس نے اپنے ہمسایہ پٹھان قبائل لونی اور اُسترانہ کے سردار گھرانوں میں شادیاں کیں اور انھیں اپنا طرفدار بنالیا تھا۔

شہزادہ ہمایوں مسوخان کی پناہ میں : ۱۷۹۳ء میں جب تیمور شاہ درانی فوت ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا زمان شاہ تخت پر بیٹھا تو اس کے بڑے بھائی شہزادہ ہمایوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی ، کیونکہ وہ اپنے آپ کو حکومت کا مستحق سمجھتا تھا ۔ بالآخر ہمایوں نے شکست کھائی اور ۱۷۹۴ء میں وہ سنگھڑ کی طرف بھاگ آیا ۔ اور نواب محمد مسوخان کا مہمان آکر ٹھہرا نواب صاحب نے چند دن اسے مہمان رکھنے کے بعد اپنے چند گھوڑ سواروں کی نگرانی میں لیہ کو روانہ کردیا چنانچہ ان گھوڑ سواروں نے شہزادہ ہمایوں کو فتح خان کے پاس دریائی گزرگاہ عبور کرادی اور وہ لیہ کی طرف نکل گیا ۔ حالانکہ ہمایوں کی گرفتاری کا اس وقت سخت حکم تھا اور اس کے لئے ایک بھاری انعام مقرر ہوچکا تھا۔

"In A.D. 1794 Humayun made his second attempt to recover the kingdom from Zaman Shah, but was defeated, and fled to Sagar, where Massu Khan Nutkani, Chief of Sagar assisted him and managed to smuggle him across the Dera Fatih Khan ferry".

[1] - گل بہار ص ۲۷۲ - [2] - ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ اسماعیل خان ص ۳۶ -

CamScanner

میاں رضا محمد کا قتل[1]: نواب محمد مسو خان کو میاں رضا محمد سے بڑا پیار تھا۔ وہ اسے "میرا بیٹا" کہہ کر پکارتا تھا۔ جب میاں رضا محمد کسی کام کی غرض سے باہر چلا جاتا اور بخیر و خوبی گھر کو واپس لوٹ آتا تو نواب صاحب اس کی خوشی میں ہفتہ عشرہ تک برابر جشن مناتا اور کہتا کہ میرا بیٹا خیریت سے گھر واپس آگیا ہے اور اس پر لطف و کرم کی نوازشیں کرتا تھا۔ غرضیکہ میاں رضا محمد خوجہ سکھ دربار میں عہدہ سفارت پر فائز تھا اور خراج کی رقم جو چار یا پانچ ہزار روپے تھی۔ خالصہ دربار میں پہنچائی۔ جب وہ خراج کی رقم دے کر ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۹ء) میں وطن واپس روانہ ہوا تو یار لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ اس موقع پر میاں صاحب سنگھڑ کی سند حکومت اپنے نام پرے کر آرہا ہے۔ یہ بات نواب صاحب کے کانوں تک پہنچی تو وہ غصے سے لال انگارہ ہوگیا اور کہا کہ اگر یہ بات سچ ہے تو رضا محمد کو مجھ تک پہنچنے سے پہلے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ دربار کے وہ جلاد جو اس حکم کے منتظر تھے حکم پاتے ہی فوراً تونسہ کو روانہ ہوگئے۔ تونسہ کے قلعہ سے باہر تھوڑے فاصلہ پر منگروٹھہ کو آتے ہوئے میاں رضا محمد انہیں ملا اور اجل کے ان فرشتوں نے اسے لے لیا اور نواب صاحب کا حکم پڑھ کر سنایا اور پاس ہی کھڑے ہوئے اراک (ٹولہ) کے درخت سے لٹکا کر میاں رضا محمد کو پھانسی دے دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹولہ کا وہ درخت ابھی تک موجود

---

[1] ایک بیان کے مطابق میاں رضا محمد خوجہ ڈیرہ اسماعیل خان سے یہاں آیا تھا اور یہاں آکر محمد مسو خان کی ملازمت اختیار کرلی وہ ایک قابل اور اچھا انشا پرداز تھا اور اپنی لیاقت کی وجہ سے ترقی پاکر مدار المہام ہوگیا تھا۔ میاں رضا محمد اور اس کا خاندان خوشنویس تھا اور فن تحریر بھی اچھا جانتا تھا اس باعث سے وہ منشی مشہور ہوگیا اور اب تک یہ خاندان منشی کہلاتا ہے میاں رضا محمد کے بعد اس کے بیٹوں میاں یار محمد اور میاں احمد یار کو وزارت کے مناصب اور سفارت کا کام تفویض کیا گیا اور وہ ریاست سنگھڑ کی طرف سے کابل اور لاہور دربار میں بھیج دیئے گئے دونوں بھائی نواب محمد مسو خان کے عہد سے نواب محمد اسد خان کے دور تک ان مناصب پر برابر فائز رہے۔ میاں محمد یار نے تونسہ اور احمد یار نے منگروٹھہ میں سکونت رکھ لی۔ چنانچہ انکی اولادیں ان دونوں مقامات پر پائی جاتی ہیں تونسہ والے خوجے اور منگروٹھہ والے منشی مشہور ہیں۔ میاں محمد یار کو خواجہ محمد سلیمان نے ابوالوفا کا خطاب دیا تھا اور اسی ابوالوفا نے خواجہ صاحب کی تاریخ وفات لفظ "غریب نواز" سے نکالی تھی۔

[2] تذکرہ سلیمان ص ۱۷۵۔

پر موجود ہے اور اس مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔

رضائے محمد چو رحلت بساخت   تاریخ او گفت شہادت بیافت

۱۲۰۳ھ

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رضا محمد کے قتل کے بعد اس کی جملہ جائیداد ضبط کر لی گئی اور گھر کا تمام اثاثہ لے لیا گیا تھا۔

الغرض میاں رضا محمد خوجہ کے بعد اس کے دو بیٹوں میاں محمد یار اور میاں احمد یار کو منصب وزارت و سفارت سونپا گیا، اور وہ ریاست سنگھڑ کی طرف سے کابل اور لاہور دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیئے گئے جو نواب محمد مسو خان کے دور سے لے کر نواب محمد اسد خان کے عہد حکومت تک برابر اس منصب پر فائز چلے آئے۔ میاں محمد یار نے تونسہ میں اور میاں احمد یار نے منگروٹھہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی، چنانچہ ان کی اولادیں انہیں دو مقامات پر موجود ہیں جو کہ خوجہ اور منشی مشہور ہیں۔ لفظ خوجہ کے متعلق مولانا حسن نظامی لکھتے ہیں کہ اس کی اصل کھوجہ (متلاشی) ہے اسلام آنے سے قبل ہندوستان کے بعض باشندے حق کی تلاش میں رہتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان لوگوں نے اسے فوراً قبول کر لیا اسی بنا پر وہ لوگ کھوجہ کہلائے، اور یہ لفظ غلط العام ہو کر خوجہ بن گیا۔ اور منشی کے لفظ میں اعلیٰ انشا پرداز کا مفہوم پایا جاتا ہے چونکہ یہ لوگ اعلیٰ پایہ کے خوشنویس اور انشا پرداز تھے اس لئے منشی مشہور ہو گئے، بہر صورت میاں محمد یار کو خواجہ محمد سلیمانؒ نے ابوالوفا کا خطاب دے رکھا تھا۔ اسی ابوالوفا نے خواجہ صاحب کی تاریخ وفات لفظ "غریب نواز" سے نکالی۔ (۱۲۶۷ھ)

مسو خان کی وفات: سردار محمد مسو خان نتکانی کی وفات ۱۷۹۵ء کے لگ بھگ ہوئی تھی اور انہیں منگروٹھہ کے قدیم قبرستان مشہور "عالیں والہ" خواہ "آلیں والہ" کے پاس دفن کیا گیا اور ان کا مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ جو ملتانی روغن دار ٹائل سے تعمیر ہوا تھا اول وہ سکھوں کے دستِ تظلم کا شکار ہوا۔ پھر اس کی بچی کھچی اینٹیں مقامی لوگوں نے اکھاڑ لیں، اور قریب کے قبرستان میں ایک عورت کے کمرہ کی تعمیر پر لگا دی گئیں یہ بی بی کورد کے باشندے تگہ خان دریشک کی ہمشیرہ اور منڈرانی کے سید گھرانے کی مریدہ تھی۔

قضائے کہ ایں باغ را آفرید۔ نواب محمد مسو خان نے کم و بیش پچاس سال تک حکومت کی اور ایک سو سے زائد عمر میں وفات پائی تھی۔ آپ کے آخری ایام میں آپ کا بڑا لڑکا علی اکبر خان کاروبار مملکت چلاتا رہا۔ سردار محمد مسو خان جہاں تلوار کا دھنی تھا، وہاں پر وہ علم و فضل میں بھی یکتا تھا، اور اہل علم کی قدر کرتا تھا، وہ عبادت گزار اور پرہیز گار حاکم تھا اس نے اپنی ریاست میں اسلامی قانون کو رواج دیا چنانچہ وصیت، وراثت اور قاضی عدالتوں کا قیام اس نے جاری کیا۔ اس کے عہد میں محمد عمر خان دتانی پہلا قاضی مقرر ہوا تھا شریعت کا وہ اتنا پابند تھا کہ اس نے وراثت کے نظام کو اسلامی بنیادوں پر رواج دیا اس میں بے شمار ذاتی خوبیاں تھیں۔ بایں ہمہ اس کے مزاج میں تیزی کا عنصر غالب تھا خویش و اقارب کی پرواہ کئے بغیر بات بات پر اکھڑ جانا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ انہوں نے لوٹ مار اور غارت گری کے قبائلی نظام کو حکماً بند کر دیا تھا اور "پنجک" کے نظام کو ختم کر دیا۔ پنجک سے مراد مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ہے۔ جو اسلامی جنگوں سے بلوچی رواج میں منتقل ہو چکا تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کے لوگ جب کسی علاقہ غیر سے مال و اسباب لوٹ کر لے آتے تو اس کا پانچواں حصہ سردار کو دیا جاتا تھا اور یہ ریاست کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح علاقہ غیر میں حملہ کے وقت اگر ریاست کا کوئی آدمی مارا جاتا تو سردار اس کے ورثاء کا وظیفہ مقرر کر دیتا تھا۔ یہ طریقہ کار بھی مسو خان نے بند کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا ہوگا لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے ہونگے، اور ڈاکہ زنی اور لوٹ مار سے لوگوں نے ہاتھ اٹھا لیا ہوگا۔

نواب محمد مسو خان کے وزیر اور سفیر میاں رضا محمد کا بیان ہے کہ سردار مسو خان ریاست سنگھڑ کا خود مختیار نواب تھا۔ اس کے تعلقات لاہور اور کابل دربار سے دوستانہ تھے میں (رضا محمد) ان ہر دو دربار میں نواب صاحب موصوف کی طرف سے سفیر بھی رہا نواب صاحب اس وقت کابل کی بجائے لاہور دربار کو خراج دیتا تھا سردار محمد مسو خان کے ملازمین میں ہمیں ہندو لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جن میں ایک روپا رام ہندو کاردار تھا۔ محصولات کی وصولی اور دیگر معاملات اس کے سپرد تھے

آخریں نواب صاحب کی سیرت اور کردار کے متعلق یہ منظوم کلام پیش کیا جاتا ہے۔ جو اس کے فہم و فراست اور علم و فضل کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ نظم اُستاذ محترم مولوی صالح محمد خان نے حیاتِ سلیمانی میں نقل کی ہے۔

قضائے کہ ایں باغ را آفرید   عجب لالہ، خانِ مسود دمید
بود ہر زماں چو گل افروختہ   بد اندیشی مثلِ سپند سوختہ
ریاضت کشی را حسّن ثانیے   بدانش فلاطون یونانیے
بہ حشمت او سالارِ جمشید است   چو جمشید خورشید تاباں تراست
بہ ہنگام تیغ است چوں کوہ وکاف   بدرد سرِ دشمناں تا بہ ناف
رود گر رگ خونی بدر باریش   خدایا! مراکن سرکارِ خویش
چہ وصفش کند واصفِ ناتواں   چو دریائے نیل است موجش گراں
بود تا زمین، آسمان را بقا   خدایا! نگہدارش از لغزہا[1]

یعنی جب دنیا جہاں پیدا ہوا، تو مقدّر سے یہ بات عجیب ٹھہری کہ لالہ کا پھول مسوخان کی شکل میں کھلا۔ وہ پھول کی مانند ہر وقت خنداں رہتا ہے اور اس کی سوچ اس قدر بڑی ہے کہ وہ ہر بات پر سپند کے دانہ کی طرح تڑپ اٹھتا ہے۔ عبادت اور ریاضت میں اسے حسّن ثانی سمجھا جائے، اور فہم و فراست میں وہ یونان کا افلاطون ہے، حشمت و جلالت میں جمشید کا سالار معلوم ہوتا ہے اور جمشید کی مانند اس کا بخت سورج سے زیادہ روشن ہے۔ لڑائی کے وقت اس کی تلوار کوہ قاف سے بھی زیادہ سخت ہے۔ جو دشمن کو سر سے ناف تک برابر کاٹتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے جبّار بھی بھیڑیں بن کر آتے ہیں۔ اے خدا مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ ایک ناچیز انسان (شاعر) اس (مسوخان) کی کیا تعریف بیان کرے۔ وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریائے نیل کی مثل ہے۔ زمین و آسمان میں امن اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے، اے خدا! جبکہ تو اس کا ہر لحاظ سے نگہبان رہے۔

[1] حیات سلیمانی ص ۴۸، ۴۹

نواب علی اکبر خان - عام روایات میں نواب صاحب کے دو لڑکے علی اکبر خان اور لعل خان بیان کیے جاتے ہیں تیسرے لڑکے کبھی محمد خان کا ذکر ملفوظات خواجہ محمد سلیمانؒ میں ملتا ہے اور چوتھے لڑکے سلطان محمود کا نام موضع سہرہ تحصیل تونسہ کے ریکارڈ محکمہ مال بندوبست قانونی سنہ ۱۸۷۲ء میں درج ہے اس لحاظ سے آپ کے چار لڑکے تھے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کا بڑا لڑکا علی اکبر جانشین ہوا۔ جیسا کہ اس روایت سے واضح ہے "چوں مسوخان والی منگنوٹھ (منگروٹھ)، فوت شد، پسرش علی اکبر خان، پدر اسد خان، بر مسند وے نشست"[1]

تذکرہ سلیمان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علی اکبر خان اپنے والد نواب محمد مسوخان کے حین حیات مسند ریاست پر بیٹھ چکا تھا اس کی اصل وجہ نواب صاحب کی ضعیف العمری نظر آتی ہے۔ ایک بیان میں آیا ہے، ایک روز ایک شخص نے حضرت قبلہ (خواجہ سلیمانؒ) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ غریب نواز مجھے میرے اہل و عیال گالیاں دیتے ہیں اور میری خدمت نہیں کرتے (آپ نے) اس کے حال حکایت فرمائی .... کہ مسوخان مرحوم علاقہ سنگھڑ کا حاکم تھا اس نے مرتے وقت اپنے اہل و عیال سے ایک سو روپیہ طلب کیا، انہوں نے جواب دیا، ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے جو تم کو دیں۔ حالانکہ مسوخان حکمران رہ چکا تھا[2] بہرحال علی اکبر خان جب حکمران ہوا تو اسے بھی حکومت کابل کی طرف سے سند حکومت خطاب نوابی اور خلعت دیا گیا۔

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۱۸ - [2] تذکرہ سلیمان ترجمہ نافع السالکین ص ۲۳۰ -

لکھی محمد خان کا قتل: نواب علی اکبر خان کا دورِ حکومت کوئی زیادہ عرصہ نہیں رہا ہے۔ وہ اپنے باپ کے وقت سے سنگھڑ کا حکمران چلا آیا۔ مگر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اس کے عہد کے حالات ہماری نظر سے اوجھل ہیں اور ہم زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتے۔ علی اکبر خان نے جب اقتدارِ حکومت سنبھالا تو اپنے بھائی لکھی محمد خان سے کسی وجہ سے ناراض ہوگیا اور اس کے قتل کے درپے ہوگیا، لکھی محمد خان اس خوف سے سنگھڑ سے کہیں اور چلا گیا۔ مگر بھائی کی کسی یقین دہانی کے بعد گھر کو واپس لوٹ آیا اور خواجہ محمد سلیمانؒ سے آکر ملا آپ نے لکھی محمد خان سے پوچھا کہ تم بھائی کے کون سے اعتبار پر یہاں آئے ہو؟ عرض کی کہ اس نے قرآن کریم کی قسم کھائی ہے۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ خواجہ صاحب نے کہا تم نے نہیں سُنا کہ مردم خراسان کہتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے دونوں بازو تیل میں تر کر کے تِلوں میں ڈبو دے اور اپنے بازوؤں کے ساتھ لگے ہوئے ہر تِل کے بدلہ میں قرآن مجید کی قسم کھائے، تو بھی اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ کیونکہ دشمن جب سامنے آتا ہے تو اسے وہ معاف نہیں کرتے۔

چنانچہ یہی ہُوا اور اس کے دوسرے روز علی اکبر خان نے لکھی محمد خان کو قتل کرا دیا اور اس واقعہ کے ایک سال بعد خود بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔[1]

استاذ محترم مولوی صالح محمد خان ملغانی نے اس واقعہ میں مذکور لکھی محمد خان کو علی اکبر خان کا بھائی لکھا ہے۔ نور احمد خان فریدی اسے لکھی محمد خان نمبردار لکھتا ہے۔ ہمارے زیرِ مطالعہ مناقب المحبوبین کا جو نسخہ رہا ہے وہ دیمک خوردہ تھا۔ تاہم مولوی صالح محمد خان اس روایت میں دھوکا نہیں کھا سکتے، اور ان کی روایت درست ہے۔

سردار علی اکبر خان نے ایک سال یا اس سے کچھ عرصہ زائد تک حکومت کی اور وفات پائی۔ انھیں قبرستان "عالیں والہ" سے چند قدم مشرق میں "گنوکھ" نامی ایک بزرگ کے قریب دفن کیا گیا۔ اور اس پر ایک مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا گیا۔ جو قوم کی بد مذاقی کا شکار ہو گیا اس کی اینٹیں اکھاڑ کر تگہ خان دریہن کی ہمشیرہ کے مقبرہ پر لگا دی گئیں۔ اب یہ قبر جس کے گرد مقبرہ کے نشان موجود ہیں کھلے آسمان کے تلے رکھی ہے۔

[1] حیاتِ سلیمانی ص ۱۲۵۔

علی اکبر کا سوا روپیہ: علی اکبر خان کے متعلق ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ اس کا والد نواب محمد مسو خان جب فوت ہُوا اور اس کی تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ اٹھایا گیا اس وقت علی اکبر خان اپنے ساتھ سوا روپیہ لے کر گیا کہ شاید کسی ضرورت میں کام آئے لیکن وہ اسے واپس لے آیا اور خرچ نہ کیا۔[1] اس روایت میں اگرچہ غلو کا عنصر شامل ہے اور راوی کا مقصد اس خانوادہ کی تذلیل کرنا ہے جس گھرانے کے ٹکڑوں پر یہ لوگ پلے تھے۔ تاہم علی اکبر خان کے بخل کا پہلو یہاں سے ظاہر ہوتا ہے۔

نواب لعل خان۔ علی اکبر خان جب فوت ہُوا تو اس کا بیٹا محمد اسد خان کم سن تھا۔ اس لیے اس کا چچا لعل خان سربراہِ مملکت ہُوا۔ مناقب المحبوبین میں ہے" چوں علی اکبر خان پسر مسو خان فوت شد، و پسرش اسد خان طفلک بود۔ بجائش برادرِ خوردش لعل خان بن مسو خان بر حکومت بلدہ منگنوٹھہ (منگروٹھہ) مقرر شد"

لعل خان کا آغازِ حکومت زمان شاہ درانی کے عہد ۱۷۹۷ء سے معلوم ہوتا ہے۔ لعل خان کے ابتدائی دور میں نواب محمد خان سدوزئی والی منکیرہ نے سنگھڑ پر حملہ کیا اور اس کا شمالی حصہ گڑانگ اور فتح خان اگ کر لیا۔ اس طرح سڑک کے مشرق میں دریائے سندھ تک کا علاقہ جنوب میں مور جھنگی تک ریاست سنگھڑ سے جدا ہوگیا اور یہی حدود ریاست نواب محمد اسد خان تک بدستور رہیں۔ وہوا بہر حال سنگھڑ میں شامل رہا۔ اس موقع پر یہ روایت بیان کی گئی ہے" لعل خان بن مسو خان بر حکومت بلدہ منگنوٹھہ (منگروٹھہ) مقرر شد، نواب محمد خان سدوزئی کہ والی ملک جولتان و بلدہ منکیرہ بود، سپاہ خود را ہمراہ مانک رائے ولو ملک سنگھڑ فرستاد تا قلعہ منگنوٹھہ را بتصرف آورد۔"[2]

نواب لعل خان کو عرصہ چار، پانچ سال کا گزرا تھا کہ محمود شاہ درانی نے اپنے بھائی زمان شاہ کو گرفتار کر کے اقتدارِ حکومت خود سنبھال لیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں شاہ شجاع نے محمود شاہ کو تخت سے اتار دیا اور ۱۸۱۲ء تک کابل پر خود حکمران رہا اس دوران میں ڈیرہ جات کا دو مرتبہ دورہ کیا اور خراج وصول کیا اس موقع پر محصول کی عدم ادائیگی ہی ہو سکتی ہے جس کے باعث وہ لعل خان نتکانی کو گرفتار کر کے کابل اپنے ساتھ

[1] حیاتِ سلیمانی ص ۱۳۵۔ [2] مناقب المحبوبین ص ۲۲۰

لے گیا اور اسے جیل میں ڈال دیا۔ جہاں پر وہ بارہ سال تک قید تنہائی کاٹتا رہا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے " چو وقت ظہر رسید چہار ہزار سوار یکایک از خراسان براہ کوہستان در منگنوٹھہ (منگروٹھہ) رسیدہ قلعہ را محاصرہ کردند۔ لعل خان را اسیر کردہ در ولایت بردند چنانچہ دوازدہ سال در قید خراسانیان بماند"[1]۔

۱۸۱۲ء میں محمود شاہ نے شاہ شجاع سے کابل کی حکومت واپس لے لی۔ اور اسے اقتدار سے بیدخل کر کے پنجاب کی طرف بھگا دیا۔ محمود شاہ نے اب لعل خان کو بھی قید سے رہا کر دیا۔ اور وہ دوبارہ سند حکومت لے کر سنگھڑ میں واپس آ گیا۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب میں ہے کہ لعل خان نے اسیری کے ایام میں عبدالجبار خان سے اپنے کنبے کی ایک لڑکی بیاہ دی تھی اور وہ لعل خان کا طرفدار بن گیا تھا۔ اس کتاب میں محمود شاہ کی جگہ زمان شاہ لکھا ہے۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

بہرحال لعل خان کے دورِ اسیری میں سنگھڑ کی زمام حکومت علی اکبر خان کے بیٹے محمد اسد خان نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی جس کا کہ لعل خان سربراہ بنایا گیا تھا۔ اب لعل خان نے واپس آ کر اسد خان سے سنگھڑ کا اقتدار واپس لینا چاہا۔ مگر اسد خان اس وقت ایک زبردست حکمران بن چکا تھا۔ اور آس پاس کے علاقائی سرداروں کی لڑکیوں سے شادیاں کر کے ان کی حمایت حاصل کر چکا تھا۔ خصوصاً لغاری سردار جبال خان کی لڑکی سے اس کا ناطہ نسبت بندھ چکا تھا۔ کھوسہ قبیلے سے اس کے پہلے سے قریبی تعلقات قائم تھے۔ کھوسہ اور لغاری یوں بھی ایک دوسرے کے اس وقت حلیف اور دوست تھے: اتفاق سے کھوسہ تمن کا ایک معتدبہ حصہ سنگھڑ میں آباد ہو چکا تھا تاہم تکانی[2] نُتکانی (؟) سردار اور استرانہ قبائل نواب لعل خان کے ساتھ تھے۔

کھوسہ سردار کا قتل: الغرض چچا اور بھتیجا کے درمیان ٹھن گئی۔ نواب محمد اسد خان اس وقت قلعہ منگروٹھہ پر قابض تھا کھوسے قلعہ مہوئی اور مٹی کی حفاظت کر رہے تھے۔ قلعہ تونسہ میں افغانی ناظم رہتا تھا اس وقت بیہڑ کا قلعہ ایسا تھا جس میں بیٹھ کر نواب لعل خان اپنے حریف سے پنجہ آزمائی کر سکتا تھا۔ چنانچہ قلعہ بیہڑ میں آ کر بیٹھ گیا

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۱۲۔ [2] نتکانی سے مراد یہاں پر قبیلہ نتکانی کے باشندے ہیں۔ [3] گل بہار ص ۲۷۳

اپنا اصل حریف وہ کھوسوں کو سمجھتا تھا چنانچہ اس نے سب سے پہلے قلعہ مہوئی کا رخ کیا کھوسہ سردار اس وقت برخوردار خان تھا وہ لعل خان سے لڑتا ہوا تن دود سنگھڑ میں مارا گیا[1]۔ اب اس کا بیٹا غلام حیدر خان اپنے قبیلے کا سردار ہوا، اس نے باپ کا بدلہ چکانے کی غرض سے لعل خان پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ بالآخر لعل خان کو بیہڑ کے قلعہ میں جا کر پناہ لینا پڑی

لعل خان کی شکست: اس وقت کا دستور یہ تھا کہ کوئی چھوٹا حکمران جو معقول نذرانہ پیش کر دیتا تو کابل کی حکومت یا پنجاب کی حکومت اسے سند حکومت دے دیتی تھی۔ ساتھ ہی ایک فوجی لشکر بھیج دیا جاتا تھا جو متعلقہ حکمران کو جا کر قبضہ دلاتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا، اول لعل خان سنگھڑ کا پروانہ حکومت اور فوجی کمک اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنے مخالفین سے جنگ آزما ہو گیا۔ دوسری طرف نواب محمد اسد خان نے درانی دربار میں نذرانہ بھیج کر اپنے نام پر سند حکومت حاصل کر لی۔ اور لعل خان کی حمایتی فوج اس وقت کابل میں واپس بلا لی گئی۔

چنانچہ اس واقعہ کو اس روایت کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے " چونکہ عطا بانی جور وجفا از شامت اعمال خود معزول شدہ، و بجائش محمد رضا خان نواب شدہ (ناظم ڈیرہ جات) در ڈیرہ غازیخان آمدہ نشست۔ عبدالجبار خان پوپلزی را در شہر تونسہ شریف قلعدار کردہ فرست۔ پس اہلکاران اسد خان والی منگنوٹھہ (منگروٹھہ) بہمراہی قلعدار مذکور لعل خان بن مسو خان را از ملک سنگھڑ خارج کردہ"[2]۔ یہ واقعہ ۱۸۱۸ء یا اس سے تھوڑا عرصہ قبل کا ہے۔

لعل خان کا مہوئی پر حملہ: بہرکیف لعل خان ایک بار پھر محمود شاہ درانی کے پاس پہنچا اور فوجی مدد چاہی مگر اس وقت وہ خود بارکزئیوں کے عتاب میں تھا، لعل خان کی مدد نہ کر سکا۔ اب لعل خان لاہور دربار میں چلا گیا اور رنجیت سنگھ سے امداد کا خواستگار ہوا مگر وہاں سے بھی کوئی مدد نہ مل سکی آخرکار وہ امیر بہاولپور کے پاس پہنچا اور فوجی امداد طلب کی اس دوران ۱۸۲۰ء میں رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان کو فتح کر کے اسے خالصہ حکومت میں شامل کر لیا تھا اور پھر نواب بہاولپور کو اجارہ پر دے دیا۔ اس وقت

[1] گل بہار ص ۲۸۹۔ [2] مناقب المحبوبین ص ۲۲۴۔

CamScanner

نواب صادق محمد خان نے اپنے ایک امیر امام شاہ کی ماتحتی میں دو ہزار کا لشکر لعل خان کے حوالے کر دیا چنانچہ یہ لشکر قلعہ مہوئی پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کیا اس موقع پر مناقب المحبوبین کا بیان ہے "بعد از دوازدہ سال لعل خان کہ از قید خراسانیاں آمدہ در احمد پور رفتہ ملازم نواب صادق محمد خان شد۔ چوں مردم کھوسہ دست تعدی در علاقہ ڈیرہ غازیخان دراز کردند۔ لعل خان مذکور را صادق محمد نواب، افسر فوج کردہ برائے گوشمالی مردم کھوسہ فرستاد، تا او آمدہ قلعہ موضع مٹی راکہ در سرحد سنگھڑ است . . . . در تصرف اسد خان بود . . . . محاصرہ کرد۔

لعل خان یا رادھا کشن : غرضیکہ قلعہ مہوئی پر محاصرہ کے دوران میں احمد پور کا ایک شخص غلہ باجرہ کے چند بار شتر بہار سے تونسہ کو لے جا رہا تھا، کہ لعل خان کے آدمیوں نے اسے لوٹ لیا۔ خواجہ محمد سلیمانؒ کو جب اسی واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے یار محمد ملغانی کو لعل خان کے پاس خط دے کر بھیجا اور کہا کہ غلہ کے یہ بار شتر واپس کرے۔ لعل خان نے وہ خط پھاڑ دیا اور پڑھنا تک گوارہ نہ کیا اور ساتھ ہی قاصد کو دھکے دیئے اور نکال دیا۔

پائندخان خاکوانی جو علاقہ سنگھڑ کا اس وقت اجارہ دار تھا۔ لعل خان کو اس کی اس حرکت پر شکوہ کیا لعل خان نے اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے اور کہا کہ حضرت صاحب (خواجہ صاحب) نے اپنی جو کرامت دکھانی ہے، یہ بازو حاضر ہیں اور اگر کوئی چھرا گھونپنا ہے تو بغل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ موجود ہے۔ قاصد نے جب واپس جا کر خواجہ صاحب سے یہ ماجرہ کہہ کر سنایا تو آپ نے کہا " اے یار محمد" ہم فقیروں کے پاس خنجر کہاں ؟ بلکہ جو شخص جو کچھ چاہتا ہے پالیتا ہے۔ اس کے دوسرے روز یار محمد خان اور نور محمد خان کھوسے قرآن مجید لے کر خواجہ صاحب کے پاس آئے اور کہا، آپ ہمارے ساتھ مہوئی تشریف لے چلیں اور لعل خان سے کہیں کہ وہ قلعہ مہوئی کا محاصرہ اٹھا لے، آپ نے جواب دیا، کہ تم نے نہیں سنا ہے کل لعل خان نے میرا خط نہیں پڑھا اور اسے پھاڑ ڈالا تھا اور قاصد کو دھکے دیئے، میں کس طرح اس بدفطرت انسان کے پاس جا سکتا ہوں

مگر وہ نہ مانے اور خواجہ صاحب کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا ان کے اس اصرار پر خواجہ صاحب نے میاں محمد لغلانی کو اپنا خط دے کر لعل خان کے پاس بھیج دیا، اور فرمایا، لعل خان کو پہلے میرا سلام دینا پھر کہنا، میں نے نوک قلم کو سفید حریر کے جامہ پر الٹ کر رکھ چھوڑا ہے کہ خدا معلوم یہ افسر فوج لعل خان ہے یا منشی رادھا کشن ؟ اور کہنا کہ جنگل میں آگ لگانا آسان ہے اور اس کا بجھانا مشکل۔

مہوئی کے قلعہ کو تونسہ سے باہر کوئی نہیں جانتا لیکن آپ کو دنیا جانتی ہے۔ اگر تم صلح کرنا چاہو تو میں آجاؤں۔ لعل خان نے اس کے جواب میں کہا اب جبکہ قلعہ فتح ہو چکا ہے میرے لئے صلح کرنا مناسب نہیں ہے۔

لعل نہیں کوئی لالڑی رہا ہے : غرضیکہ اس سے اگلے روز خواجہ صاحب گھوڑی پر سوار ہو کر لعل خان کے پاس خود آگئے، لعل خان سے ملتے ہی کہا، اے لعل خان ! دنیا تجھے شیر بہادر کہتی ہے اور تو اتنے دن ہوئے اس قلعہ کو فتح نہیں کر سکا۔ لعل خان نے جواب دیا کہ کل انشاء اللہ یہ فتح ہوگا۔ اب خواجہ صاحب اور لعل خان نتکانی کے درمیان صلح و صفائی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا میں نواب صادق محمد خان کو لکھتا ہوں اگر وہ محاصرہ اٹھانے پر رضامند ہوگئے تو فبہا بصورت دیگر قلعہ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ چنانچہ لعل خان کو ظہر تک اس بات کی اجازت دے دی گئی۔ کہ وہ سوچ کر اس کا جواب دیں۔ اس وقت اس نے اپنی فوجیں بھی پیچھے کو ہٹالیں اور خواجہ صاحب قیلولہ کرنے کی غرض سے جھوک منجوٹھ والی پر چلے گئے۔

اسی اثنا میں غالباً کچھ مردان کھوسہ نواب محمد اسد خان کے پاس منگروٹھ میں چلے گئے تھے اور ان سے نور محمد خان اور یار محمد خان کے لئے جان بخشی چاہی۔ اسد خان نے ابراہیم خان قلعدار مہوئی کے نام خط دیا، اور لکھا کہ وہ ان دونوں سرداروں کو قلعہ میں رکھے اور ان کی حفاظت کرے۔ چنانچہ ابراہیم خان نے انہیں قلعہ میں باہر رہنے کی اجازت دے دی۔

ادھر اسد خان نے ایک سو سواروں کا دستہ لعل خان کے پاس بھیج دیا۔ لعل خان نے اس وقت یار محمد خان اور نور محمد خان کی خبر گیری کے لئے اپنے چند آدمی بھیج رکھے تھے۔ اتنے

ہیں انہوں نے آکر یہ کہا کہ دونوں کھوسہ سردار قلعہ مہوٹی کی فصیل کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ لعل خان نے چند شمشیر زن اور بہادر آدمی ان پر حملہ کرنے کی غرض سے بھیج دیئے وہ چھپتے چھپاتے کھوسہ سرداروں کے پاس پہنچ گئے اور ان پر یکبارگی حملہ کیا اور ان کے سر قلم کر کے لعل خان کے پاس واپس آگئے۔ اس بات کی جب خواجہ صاحب کو خبر ہوئی تو کہا :-

لال نہیں کوئی لالڑی ہے۔ نانواں اینداوالڑی ہے۔

اب خواجہ صاحب تونسہ کو واپس لوٹ آئے، اور پھر کبھی لعل خان کا نام زبان پر نہ لیا بلکہ "او سگ" کے نام سے یاد کرتے تھے، اور اپنے ملنے والوں سے پوچھتے کیا وہ کتا (لعل خان) ابھی تک مارا نہیں گیا ہے ؟ بہرصورت لعل خان نے قلعہ جات مہوئی اور مٹی کھوسہ بلوچوں سے خالی کرا لئے اور انہیں پیچھے کو دھکیلتے ہوئے کوٹ دلانہ میں لے جا کر محصور کیا۔

لعل خان دلانہ میں۔ یہاں پر تیر و تفنگ کی جنگ جاری تھی کہ لعل خان نتکانی کو بندوق کی مسلسل دو گولیاں آکر لگیں اور وہ مارا گیا۔ اس کی لاش کو ڈولی میں ڈال کر ڈیرہ غازیخان لایا گیا۔ جہاں پر اسے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔

خواجہ صاحب کو یہ واقعہ ان کے ایک درویش مرید نے آکر سنایا، خواجہ صاحب نے اپنے اس مرید کا لقب "فضلِ خدا" رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ دربار میں حاضر ہوا، تو علیک سلیک کے بعد خواجہ صاحب نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا اے فضل خدا دی دال تو جنگ کی خبر کیوں نہیں سناتا۔ اس نے کہا سناتا ہوں اور سنیئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فضل خدا دی نال" ڈیرہ غازیخان سے میں آرہا تھا کہ راستہ میں چور مل گئے اور میرے بدن کے تمام کپڑے اتار لیے۔ دوسری بات یہ ہے میں نے اس راستے پر ایک جنازہ آتے ہوئے دیکھا، جب پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ لعل خان نتکانی کا جنازہ ہے، جو قلعہ دلانہ پر محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ بندوق کی دو گولیاں ایک کے بعد دوسری آکر اس کے سینے میں لگیں اور وہ مر گیا۔

لہ۔ گلِ بہار ص ۲۷۵، تذکرہ رؤسائے پنجاب ج — ص ۵۸۳

خواجہ صاحب نے یہ خبر سنی تو کہا وہ (لعل خان) اپنے باپ دادا کے پاس نار دوزخ میں پہنچ گیا نعوذ باللہ من ذالک الشیطان والانسان۔ المختصر اس طویل داستان کے اصل اقتباسات یہ ہیں :-

"چوں ایں خبر بہ پائینده خان افغان خاکوانی کہ یکی از مریدان حضرت بود۔ رسید . . . ملامت کردن شروع کرد۔ کہ ای بدبخت! ایں فعل سخت کردی۔ کہ پروانۂ حضور نہ خواندی، و دکیل حضور را بہ عزت کرده دور کردی۔ ایں قدر جرأت از نادر شاہ ہم بوقوع نیامده باشد۔ او نیز بآدمیان آنحضرت ایں چنیں نہ کردی کہ تو کردی۔ پس آں مردود بازو خود را بالا کرد گفت، کہ اگر میانصاحب کدام کرامت دارد، بنماید۔ و توفیق خنجر زدن دارد۔ اینک بازو بالا کردم، بزند، چوں یار محمد واپس بخدمت حضرت ما آمد، تمام حقیقت بیان کرد، فرمودند، اے یار محمد! نزدِ ما فقیراں خنجر کجا است۔ مگر ہر آنکس کہ جو بد، یابد۔ . . . روز دیگر یار محمد و نور محمد نام ہر دو سرداران قلعہ مٹی ہمہ قبائل خود قرآن شریف را ہمراہ آورده بخدمت رسیده عرض رسانیدند کہ ہمراہ بایاں در مٹی رفتہ و لعل خان را گفتہ، قلعہ را کہ محاصره کرده اند، خلاص کنانیده دہند۔ فرمودند مگر شما نشنیده آید کہ دیروز خطِ مرا نخوانده، و درویش فرستاده مرا از نزد خود دور ساختہ دلشستن نداده۔ من چگونہ نزد آں بدکیش روم ؟

باز او شاں قرآن شریف را پیش حضرت بداده عرض کردند، کہ برائی خدا و رسول و ایں قرآن شریف ہمراهِ مایاں ضرور روید۔ فرمودند، ای عزیزان! وقتی مادر صدیق ولد دوست محمد مرا واسطہ قرآن داده بود، من قبول نکرده ام۔ تا الیوم پشیمانم اگرچہ زندگانی صدیق مقتول ایں قدر بود، اما منظور کردن واسطہ قرآن ضرور بود۔ الحال شما کہ مرا واسطہ قرآن می دہیده رفتن ہمراہ شما ضرور است، انکار نمی کنم۔ اما تقدیر حق را کسی باز نہ گرداند۔ اکنوں نیز ہماں خواہد شد۔ اما بموجب صلاح وقت یک دو روز شما واپس روید۔ من میاں لغلانی را برائے لعل خان فرستادند و فرمودند کہ لعل خان را بعد از سلام از جانب بگوئی، کہ سر قلم را بر جریرِ سفید ایں جہت نگونسا ختم۔ کہ واللہ اعلم اِفسر

نوح لعل خان است یا منشی را دهان کشن ؟ وا ورا از زبانِ من خواہی گفت، کہ آتش را
انداختن در جنگل آسان است و فرونشاندن آن مشکل است . . . . . . در جواب گفت
(لعل خان) اکنون آمدن اوشان مناسب نیست، کہ قلعہ فتح شدہ ایستادہ است، اگر . . .
. . . خواہد آمد، میاں محمد مذکور از نزد لعل خان برخاستہ نزدیک مردم کھوسہ رفتہ
کیفیت . . . . بخدمت حضرت رسیدند، آں جناب شباشب سوار شدہ نقل تھجدرا . . .
. . . مردم کھوسہ بعد از مطالعہ پروانہ اسدخان، حوالہ ابراہیم خان قلعدار نمودند،
ابراہیم خان . . . . قلعہ حضور اند ۔ حاجت پروانہ اسدخان ہیچ نیست ۔ درین اثناء نور محمد
کھوسہ سوال کرد، کہ سعادت ما یان ہمرکابی رفتن حضور است ۔

فرمودند، شما را رفتن نزد لعل خان مناسب نیست، و سودمند نخواہد شد ۔ اگر شمارا
یقین نیست کہ نزد من لعل برائی شما سفارش نخواہم ساخت ۔ یک آدم معتبر خود را
ہمراہ من بہ فرستند . . . . الغرض چون نزدیک دروازۂ قلعہ مٹی رسیدند، میاں صدیق
ملاں را فرمودند، کہ لعل خان را از آمدن من خبر کن ۔ چون لعل خان بخدمت رسید
فرمود کہ ای لعل خان! مخلوق ترا شیر بہادر می گویند، و چند روز شد کہ قلعہ را محاصرہ کردی
و تا ہنوز فتح نہ شدہ است ۔ او گفت ، بامداد آنجناب فتح خواہد شد ، بعدہٗ حضرت صاحب
از سر ملامت و عتاب فرمودند، ای لعل! این کارِ مردانگی نکردی ۔ بازی طفلاں کردی
. . . . و حضرت صاحب سپاہ اندرون بیرون را از حرب توپ و تفنگ زدن منع کردہ
بود، کہ اکنون از طرفین ہیچ کارزار نکنند ۔ لعل خان بدافعالی گفت ، اکنون قلعہ مفتوح
را چگونہ گزارم، فرمودند، من بطرف صادق محمد خان می نویسم ، و ترا ہم مناسب است
کہ حقیقت آمدن اینجا بنا بر صلاح فیمابین مناسب است ، و تا رسیدن جواب سپاہ
خود را از جنگ منع سازد ۔ بلکہ ازین جا برخاستہ در بلدہ حمدانی (احمدانی) دیرہ کنند
اگر صادق محمد بر نوشتہ ما عمل خواہد کرد، فہوالمراد ۔
والا از من کلید قلعہ را بتو حوالہ خواہم کرد ، و نیز این صلاح با رفیقانِ خود کردہ جواب
آن بوقت ظہر مرا خواہی، بعد لعل خان برخاستہ در دیرۂ خود آمد و حضرت قیلولہ فرمودند

و درین اثناء باندازہ یکصد سوار بطریق کمک از جانب اسدخان نزد لعل خان در رسیدند
و از آن میاں دو نفر قوم استرانہ خبر بیرون نشستن از قلعہ مٹی یار محمد و نور محمد کھوسہ را
بہ لعل خان رسانیدند ۔ تا لعل خان باسماع این خبر فوراً چند سواران از برائی قتل آن ہر دو
شخصان فرستاد ۔ چنانچہ تمام درویشان حضرت را میدیدند ۔ کہ سوار مسلح از لشکرگاہ بیرون
شدہ . . . . مردمان پوشیدہ شدند بر خیال شہادت اوشان رخ بشمال آوردند . . . . .
بطرف آن مردمان کھوسہ بطور قریب آہستہ آہستہ آمدہ و از ہر چہار طرف اوشان را محاصرہ
. . . سر آں ہر دو مظلومان بریدہ و موئی سر ایشان را گرفتہ پیش لعل خان انداختند . . .
پس توپ و تفنگ شروع شدند ۔ ہر کس کہ می آمد، پرسیدند کہ ہنوز آن سگ لعل کشتہ نشدہ
است ؟ و او را قتل نہ نمودہ اند . . . . پس روز دیگر لعل خان از قلعہ مٹی تاخت آوردہ
بر سر مردم کھوسہ موضع دلانہ والا رسیدہ بود ۔ کہ تفنگی از دست یک کھوسہ بر سینۂ او
رسید و فوت شد ۔

درویشی کہ حضرت او را فضلِ خدا ملقب ساختہ بود، رسید، حضرت پرسیدند کہ ای فضلِ
خداد ی والا کدام خبر فوج نمی گوئی ، او گفت چرا نمی گویم ، اول اینکہ فضلِ خدادی نال ، دزدان
براہ ڈیرہ غازیخان بمن رسیدہ ، ہمہ جامہ ہائی بدن من گرفتند ۔
دیگر آنکہ یاران را لاشۂ میت لعل خان را دیدم ، کہ بطرف دیرہ می بردند ۔ از آنہا را
پرسیدہ بودم گفتند، او قلعہ دلانہ را تاخت کردہ بود، در آنجا او لاً بر ہمان دست کہ بالا کردہ
بود، زخم خنجر خوردہ بود ۔ بعدہٗ گولی تفنگ خوردہ و ہمان گولی راہ بر جگرش گرفتہ، بعدہٗ
در تفنگ دیگر خورد . . . . و چون این خبر حضرت صاحب شنید، فرمود، حوقی النار و السقر
مع الجد و البدر[1]

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۱۲ تا ۲۱۸

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی زِ آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

(حکیم سنائی)

نواب محمد اسد خان

نواب محمد اسد خان کی پیدائش کا اگرچہ صحیح علم نہیں ہو سکا تاہم گزشتہ روایات اور مسٹر چارلس میسن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب وہ اسد خان سے ملا تو وہ پنتالیس[۵] سال کا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی پیدائش ۱۷۹۰ء کے قریب ہوئی تھی کیونکہ ۱۷۹۶ء کے بعد جب آپ کے والد سردار علی اکبر خان کی وفات ہوئی تو اس وقت آپ کم عمر تھے اور ۱۸۰۳ء میں آپ کا چچا لعل خان جب کابل کو گرفتار ہو کر گیا تو اس وقت سنگھڑ کی ریاست کا انتظام آپ ہی نے سنبھال لیا تھا۔ آپ اس وقت تیرہ چودہ سال سے کم نہیں تھے۔

غرضیکہ آپ نے چودہ سال کی عمر میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور بارہ سال تک پرامن طور سے حکومت کی۔ پھر لعل خان درانیوں کی قید سے رہائی پاکر اور سند حکومت لے کر سنگھڑ میں واپس آگیا۔ چونکہ اس وقت آپ اپنی جڑیں مضبوط کر چکے تھے اور قلعہ منگروٹھ خالی نہیں کیا اور نہ ہی اقتدار چچا کے سپرد کیا۔ چنانچہ لعل خان نے اس وقت قلعہ بیہڑ کو اپنا مستقر بنا لیا اس طرح ایک اقلیم میں دو بادشاہ یا ایک نیام میں دو تلواروں کی سی صورت پیدا ہو گئی۔

رسم دستار بندی ۱۸۰۳ء میں لعل خان کی گرفتاری کے بعد نواب محمد اسد خان کی باقاعدہ دستار بندی کی گئی تھی۔ اور رسم وقت کے درویش حضرت خواجہ محمد سلیمانؒ نے انجام دی تھی۔ چنانچہ بیان کیا ہے "چوں وقت ظہر رسید، چہار ہزار سوار یکا یک از خراسان براہ کوہستان در منگنوٹھ (منگروٹھ) رسیدہ قلعہ را محاصرہ کردند، لعل خان را گرفتار کردند و بردند۔ بعدہٗ حضرت صاحب دستار نوابی ملک سنگھڑ بر سر برادر زادش اسد خان بستند۔ چنانچہ تا مدتے ایں ملک سنگھڑ در تصرف اسد خان بماند۔"[۱]

اسد خان کو اس موقع پر درانی حکومت کی طرف سے خلعت اور پروانۂ حکومت ملا اور خطاب نوابی بخشا گیا۔ ۱۸۱۵ء میں لعل خان درانیوں کی قید سے رہا ہو کر اور

[۱] مناقب المحبوبین ص ۱۴۰۔

اپنے نام سند حکومت لیکر سنگھڑ میں واپس آگیا، چونکہ ریاست سنگھڑ کا اصل حقدار نواب محمد اسد خان تھا، اور وہ اس دوران میں قرب و جوار کے سردار گھرانوں میں اپنی شادیاں کر کے انہیں اپنا ہمنوا بنا چکا تھا۔ ان سردار گھرانوں میں استرانہ، لونی، کلاچی، قیصرانی، بزدار، لنڈ، کھوسہ اور لغاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں[۱]

اور بعض قبائل جو لعل خان کی حمایت میں تھے، نتکانی، بزدار اور استرانہ وغیرہ ہیں، چنانچہ ان لڑائیوں کا مفصل بیان نواب لعل خان نتکانی کے ذکر میں آچکا ہے تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چچا بھتیجا کی ان جنگوں کے آخر میں آپس میں صلح ہو چکی تھی۔ اور اسد خان کی کھوسہ سردار سے شکر رنجی بڑھ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کھوسہ سردار کوڑا خان نے اپنی ایک لڑکی کا رشتہ اسد خان کے بیٹے محمد عظیم خان کو دینا کیا تھا۔ مگر بعد میں وہ رشتہ نواب بہاولپور کو دے دیا۔ جس کا نتکانی سردار کو بہرحال رنج پہنچا۔ اور وہ کھوسہ سردار کا مخالف ہو گیا۔[۲]

اسد خان ناظم ڈیرہ غازیخان ۔ نواب محمد اسد خان نتکانی کو درانی حکومت کی طرف سے ڈیرہ غازیخان کا ناظم بنایا گیا۔ یہ غالباً ۱۸۱۸ء کا واقعہ ہے۔ ایک شخص سرفراز خان کی انگیخت پر اسد خان نے ریاست بہاولپور پر حملہ کر دیا۔ ابھی وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے شاہ جمال (کنجر) تک پہنچا ہی تھا کہ اسے نواب بہاولپور کی فوج کی آمد کی خبر ہو گئی، جس کی قیادت بخشی محمد یعقوب کر رہا تھا۔ چنانچہ اسد خان بغیر کسی لڑائی اور فیصلہ کے ڈیرہ غازیخان کو واپس لوٹ آیا۔ تاہم اپنے اس غلط اقدام کی پاداش میں اسے امیر بہاول پور کو پچاس ہزار روپیہ بطور تاوان ادا کرنا پڑا، اور معذرت خواہی اس سے مستزاد تھی۔[۳]

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں ملتان کو فتح کر لیا تھا۔ اس سے اگلے سال اس نے حافظ احمد خان سدوزئی سے لیہ اور بھکر کا علاقہ لے لیا۔ ۱۸۲۰ء میں حافظ احمد خان کو منکیرہ سے بیدخل کر دیا اور وہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کو منتقل ہو گیا۔ اسی سال رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان پر بھی قبضہ کر لیا۔

[۱] گل بہار ص ۲۷۳، ۲۸۸ [۲] گل بہار ص ۲۷۵۔ [۳] ریاست بہاولپور گزیٹیر ۴۲۷۔

CamScanner

سنہ ۱۸۲۱ء میں رنجیت سنگھ نے فتح خان سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور یہاں کے مشہور قلعہ گڑھ انگ[1] کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس میں تین سو سواروں کے ساتھ اپنے ایک معتمد سردار بھوانی داس کو بٹھا دیا اور اسے منکیرہ یا ملتان کی بجائے براہ راست لاہور دربار سے منسلک رکھا۔ چارلس میسن نے فتح خان کے اِس مفتوحہ علاقہ کے متعلق لکھا ہے کہ ڈیرہ فتح خان سکھوں کے پاس ہے اور اس سے متعلق حلقہ مغرب کی طرف دس کوس اور شمال کو پانچ کوس کی مسافت پر ہے اور کیا یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دریائے سندھ کے مغرب میں یہ واحد خطۂ زمین ہے جو حقیقی طور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس ہے۔[2]

سنگھڑ پر سکھوں کے ناکام حملے۔ غرضیکہ سکھ حکومت نے ریاست سنگھڑ کا دائرہ محدود کردیا، اور اس کے گرد و نواح میں اپنی انتظامی گرفت مضبوط کرلی۔ اب اس نے ایک طرف ریاست ٹانک کے نواب غلام سرور خان کٹی خیل ملقب بہ شہنواز خان کا اور دوسری جانب نواب محمد اسد خان نتکانی کا گھیراؤ کرلیا اور انہیں اس بات پر مجبور کردیا کہ آئندہ وہ حکومت پنجاب کو خراج دیا کریں[3] تاہم نواب محمد اسد خان نے اس وقت سکھوں کو خراج دینے سے انکار کردیا۔

"An expedition to bring the northern past of the Derajat under subjection was, however, found necessary in A.D. 1821 and it was not till then that Assad Khan, the Chief of Nutkani tribe, who was then the dominant authority in the Sangarh Tehsil, was forced to engage for tribe."

چارلس میسن بیان کرتا ہے کہ اسد خان کا یہ ریکارڈ ہے اس نے ایک سے زائد لڑائیوں میں اپنے آپ کو ایک بہادر سپاہی ثابت کیا، اور ایک موقع پر اس نے منکیرہ کے ایک

[1] تذکرہ اٹک کے متعلق تواریخ [illegible] ۔ ۱۲۴، ۱۲۵۔

[2] گزیٹیئر آف ڈیرہ غازی خان؟ [illegible] ۔ ریویو آف دی ریس جرنیز بلوچستان، افغانستان اینڈ پنجاب ص ۲۸۔

[3] ظفر نامہ رنجیت سنگھ ص ۴۱۔ حیات افغانی ص ۲۹۵۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر میانوالی ص ۳۷۔

سکھ گورنر پر دریائے سندھ کے کنارے پر لڑی گئی ایک جنگ میں شاندار برتری حاصل کی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے دیکھا کہ سکھوں نے اپنے آپ کو سنگھڑ کا مالک بنانے کی ایک پالیسی اختیار کرلی ہے اور انہوں نے ایک سخت کوشش کے بعد ایسا کیا۔ جس میں اسد خان نے اپنی سابقہ ساکھ بحال رکھی اور سکھوں کو دو یا تین بار شکست دی۔[1]

سکھوں نے ڈیرہ غازیخان کو فتح کرکے جب نواب بہاولپور کو پانچ لاکھ روپے کے عوض ٹھیکہ پر دے دیا تو انہوں نے یہ بھی اجازت دے دی کہ اگر نواب چاہے تو بغیر کسی زائد معاوضہ کے سنگھڑ اور ہڑند کے علاقوں کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔

نواب بہاولپور کا حملہ اور اسد خان کی اطاعت حسنِ اتفاق کہ نواب لعل خان نتکانی کے دلانہیں مارے جانے کے بعد کھوسہ تمندار غلام حیدر خان اندر پہاڑ کوٹ گوجر میں جا بیٹھا تھا۔ نواب بہاولپور نے اس کے خلاف فوج بھیج دی ساتھ ہی کہا کہ اگر وہ اس بات پر صلح کرے کہ آئندہ اطاعت گزار رہے گا۔ اور اپنی ایک لڑکی کا رشتہ بھی دینا منظور کرے۔ تو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ مگر سردار غلام حیدر خان کو یہ شرائط منظور نہ تھیں اور وہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اب اس کا بھائی کوڑا خان سردار ہوا اس نے نواب بہاولپور سے کہا کہ وہ اس شرط پر رشتہ دینے کو تیار ہے جبکہ لغاری، گورچانی اور نتکانی سرداروں سے بھی ایک ایک رشتہ لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ریاست بہاولپور گزیٹیئر کا بیان ہے کہ اس وقت کوڑا خان اور اسد خان نواب بہاولپور کے مطیع ہوگئے اور دونوں نے سنہ ۱۸۲۱ء میں اپنی ایک ایک لڑکی کی شادی امیر بہاولپور سے کردی۔[2]

سنہ ۱۸۲۸ء میں (غالباً)، نواب بہاولپور نے سنگھڑ پر حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اپنے ایک سپہ سالار یعقوب محمد خان کو تین ہزار کا لشکر دے کر سنگھڑ کی طرف روانہ کردیا۔ اِن دنوں ایک انگریز سیاح چارلس میسن احمد پور میں آیا ہوا تھا۔ اس نے نواب بہاولپور سے اِس امر کی اجازت طلب کی کہ وہ بھی اس فوجی مہم کے ساتھ سنگھڑ کو چلا جائے اور یہاں کے فنونِ حرب و ضرب اور روایات سے آگاہی حاصل کرسکے۔ چنانچہ وہ اپنے اس سفر کے حالات میں لکھتا ہے۔

[1] ریویو آف دی ریس جرنیز بلوچستان، افغانستان اینڈ پنجاب ص ۳۶۔

[2] گزیٹیئر مذکور ص ۳۸۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ خان (امیر بہاولپور) کا وزیر یعقوب محمد خان ایک لشکر کے ہمراہ ڈیرہ غازیخان اور سنگھڑ کی طرف جا رہا ہے، جس کا مقصد موخر الذکر جگہ کے چھوٹے سے سردار کو خراج کی ادائیگی پر مجبور کرنا ہے تو میں نے احمد پور سے روانگی کا انتظام کر لیا اور کوئی خاص انتظام کیئے بغیر ضلع سنگھڑ میں داخل ہونا ہوشمندی نہیں ہو سکتی تھی جب ہم شہر ڈیرہ غازیخان میں چند دن ٹھہر کر سنگھڑ کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں یعقوب محمد خان کی زیر قیادت فوج کے مشاہدہ کا موقع ملا۔ فوج میں تین ہزار آدمی تھے، جن میں گھوڑ سوار اور پیادے معہ چھ توپوں کے تھے۔

سنگھڑ کے خان (اسد خان) کی کمان میں حزب مخالف کے ذرائع سے مجھے بتایا گیا کہ وہ ذاتی طور پر ایک بہادر آدمی ہے، اور یہ کہ اس کے پاس سات سو گھوڑ سوار کی جمعیت ہے اور اکثریت افغانوں کی ہے۔ لیکن سنگھڑ کی جاگیر میں داخل ہونے پر وزیر (یعقوب محمد خان) نے جوکس رہنے کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ بھرپور اطلاعات آ رہی تھیں۔ کہ اسد خان کے ارادے جنگ کرنے کے ہیں۔ بلاشبہ اس کے ارادے ایسے ہی تھے۔ ہم ایک دیہات کے پاس ایک ٹیلے[1] پر مقیم ہوئے، اور نیچے میدان میں کیمپ کا بہترین مظاہرہ کرتے تھے۔ تاخیر نے اس حد تک اکتا دیا تھا کہ ہم دل میں خواہش کرنے لگے کہ معاملات کسی نہ کسی صورت میں طے ہو جائیں تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں بالآخر یہ تصفیہ ہوا کہ سنگھڑ کا سردار مطلوبہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کرے اور یعقوب محمد خان اس کی سرحد سے واپس لوٹ آیا۔

---

[1] یہ ٹیلہ اب ٹبہ شیخ بلاقی کے نام سے مشہور ہے اور قصبہ احمدانی سے درّہ مہوئی کو جانے والے راستہ پر چار فرلانگ جنوب کو واقع ہے اور قصبہ احمدانی سے تین میل مغرب میں ہے وہ ایک بڑے ٹیلہ کے ذیل میں جنوبی سمت پر ہے اس بڑے ٹیلے کو لوگ "بڑی ریخ" کہتے ہیں اور سرخ رنگ کی یہ ریخ ہے ٹبہ شیخ بلاقی یقیناً ایک بلند مقام ہے جس کے تین طرف میدان تھے جو اب مزروعہ رقبہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ٹبہ شیخ بلاقی پر ایک پختہ کمرہ کی بنیاد کے آثار موجود ہیں لیکن اس میں کسی قسم کی قبر کا نشان نہیں ہے البتہ چراغ جلانے کے لئے لوگوں نے کچھ اینٹیں رکھ دی ہیں۔ ایک جھاڑی میں چھوٹا سا جھنڈا لگا ہوا ہے اس ٹیلے کی اترائی میں پتھر اور ٹھیکر بھی ملتے ہیں اسی طرح ٹبہ شیخ بلاقی صـ۲۰۲

چارلس میسن کی اسد خان سے ملاقات

چارلس میسن اپنا سفر آگے کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ اب ہم نے سنگھڑ کی راہ لی، جہاں پر اسد خان نے شائستگی سے ہمارا استقبال کیا اور خوب خاطر تواضع کی، وہ قومی لحاظ سے بلوچ تھا اور تقریباً بتالیس سال کی عمر کا وجیہہ اور عظیم الجثہ جوان تھا۔ اس نے سکھوں کی بے جا مداخلت کی شکایت کی اور افسوس ظاہر کیا کہ اس کے پاس ان کی مزاحمت کرنے کیلئے کوئی طاقتور ذرائع نہیں ہیں۔

اس کے بعد چارلس میسن افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ جس طرح (اسد خان) کا چھوٹا سا علاقہ ان طاقتور ہمسایوں میں گھرا ہوا ہے۔ آخر کار بمشکل ہی ان گرفت سے بچ سکے گا۔ اگر وہ سکھوں کی غلامی میں رہ کر خوشامد سے بچا چاہتا ہے تو اس کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ پہاڑوں میں چلا جائے اور اپنی شخصی آزادی کو محفوظ رکھ کر بقیہ زندگی گزارے۔ مگر اس صورت میں اسے اپنے آباؤ اجداد کی ملکیت سے ہاتھ دھونے ہونگے اور پھر اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خان اسد خان مٹی (خام) کے ایک چھوٹے اور کمزور دفاعی صلاحیت رکھنے والے قلعہ میں رہتا تھا۔ ساتھ ہی اس کی فوج کی معمولی جھونپڑیاں تھیں اور تھوڑے سے فاصلے پر منگلوٹ (منگروٹھ) کا دیہاتی بازار تھا۔ پھر لکھا ہے ریاست (سنگھڑ) کا مالیہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے بتایا گیا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بہاولپور کا نواب سکھوں کے اکسانے پر یا ایک طاقتور ہونے کی حیثیت سے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے تیس ہزار روپے کی ادائیگی پر مجبور کرتا ہے۔

آخر میں وہ کہتا ہے۔ اس (اسد خان) نے پہاڑوں میں پناہ لی اور ابھی تک اس کے

بقیہ: کی طرف آتے ہوئے دو فرلانگ قبل فاصلہ پر کافی مقدار میں پتھر اور ٹھیکر پڑے ہوتے ہیں۔ جو کسی قدیم چھوٹی سی آبادی کا پتہ دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ وہی آبادی ہو جس بستی کا ذکر چارلس میسن نے کیا ہے ٹبہ شیخ بلاقی پر قائم کمرہ غالباً اس وقت امیر بہاولپور کی فوجوں نے ایک یادگار کے طور پر تعمیر کر دیا ہو جو کسی وجہ سے ٹبہ شیخ بلاقی مشہور ہو گیا ہو۔ اور لوگوں نے اسے متبرک مقام سمجھ کر چراغ جلانے کی رسم قائم کر لی ہے۔

متعلق کچھ نہیں سنا گیا۔[1] اس آخری حملے سے معلوم ہوتا ہے کہ چارلس میسن کے سفر کے دوران سکھوں نے نواب محمد اسد خان پر اس وقت حملہ کیا ہوگا جس وقت ۱۸۳۰ء کے بعد ڈیرہ غازیخان کا علاقہ نواب بہاول پور سے واپس لے لیا تھا اس وقت انہوں نے جنرل ونتورہ کو بھیج کر ڈیرہ غازیخان پر اچانک قبضہ کر لیا اس کے بعد اس نے سنگھڑ پر حملہ کیا۔ مگر نواب محمد اسد خان اندر پہاڑ جاکر بیٹھ گیا اور اس کی دوبارہ اطلاع چارلس میسن کو نہیں مل سکی۔

ایک نیام میں دو تلواریں نواب عبدالصمد بادوزئی دائرہ دین پناہ ضلع مظفر گڑھ کا جاگیر دار تھا۔ کسی سے خواہ مخواہ لڑنا اس کا شیوہ تھا۔ وہ نواب مظفر خان والئی ملتان سے بھی کئی بار لڑ چکا تھا، اور نواب محمد اسد خان سے بھی اس نے کئی بار جھگڑا کیا بالآخر ناکام ہو کر لاہور جا بیٹھا۔ مؤرخین اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جھگڑالو عبدالصمد خان کچھ بھی خوش نصیب ثابت نہیں ہوا۔ اسد اللہ خان بلوچ رئیس سنگھڑ جس نے لیہ کے محصولات کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اس کا سخت دشمن تھا اور ان دونوں میں متواتر اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ تمام ملک بدامنی کی وجہ سے مفلس ہو گیا۔ اور اسد اللہ خان کو مجبور ہو کر ٹھیکہ چھوڑ دینا پڑا۔[2]

یہ صورت پیش آنے پر مہاراجہ نے عبدالصمد سے کہا کہ وہ یا تو ملک کے کسی اور حصہ میں جاگیر لے لے یا ٹھیکہ بھی خود سنبھالے۔ عبدالصمد نے جاگیر کے تبادلے سے ٹھیکہ لینا اچھا سمجھ کر اس بات کو منظور کر لیا۔ مگر یہ امر اس کے حق میں زیادہ مضر ثابت ہوا۔ ... دو ہی سال بعد اس کے ذمہ دو لاکھ روپیہ بقایا میں آگرا، اور چونکہ وہ اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کی تمام جائیداد ضبط اور جاگیر قرق کر لی گئی۔[3]

کھوشل سنگھ عبدالصمد کی مدد پر۔ عبدالصمد بادوزئی کو ۱۸۲۸ء میں لیہ اور بھکر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کا نواب محمد اسد خان خکانی کے ساتھ سرحدی جھگڑا پہلے ہی سے چلا آرہا تھا۔ عبدالصمد اور اسد خان کی فوجیں بیٹ بالو علاقہ کچھی، دائرہ دین پناہ میں جمع ہوئیں ادھر عبدالصمد خان بھی پہنچ گیا۔ فریقین میں سخت مقابلہ ہوا۔

[1] ۔ [illegible] پنجاب ص ۲۹ تا ۳۱ ۔
[2] تذکرہ رؤسائے پنجاب ج۔ ذکر خاندان بادوزئی
[3] ایضاً ص ۵۲۲۔

اس موقع پر افغان لشکر میں ناصر خان پوپلزئی معکونہ دوربٹہ اور بھیڈوال بڑی بے جگری سے لڑے۔ خصوصاً بھیڈ والوں کا گھوڑ سوار دستہ میدان جنگ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا۔ اور باقی دستے بلوچوں کی تیز دھار تلواروں کے سامنے نہ ٹھہر سکے بالآخر ناصر خان اور بھیڈ والوں کو بھی میدان خالی کرنا پڑا اور خکانی سردار اس متنازعہ علاقہ پر بدستور قابض رہا۔ رنجیت سنگھ نے اب کھوشل سنگھ خالصہ کو عبدالصمد خان کی مدد کو بھیجا۔ وہ اپنے دستہ فوج کے ساتھ منکیرہ میں پہنچا اور عبدالصمد خان سے ملا۔ اس نے اسد خان کو متنازعہ علاقہ سے نکال دینے اور علاقہ عبدالصمد خان کے حوالے کرنے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ عبدالصمد خان اسے پچیس ہزار روپیہ بطور حق الخدمت ادا کرے۔ چنانچہ عبدالصمد خان نے یہ رقم اسے دے دی۔ اب کھوشل سنگھ نے دریائے سندھ کو سنگھڑ کی طرف عبور کیا اور اسد خان کے پاس پہنچا۔ اسد خان سے اب اس شرط پر پچیس ہزار روپے طلب کئے کہ وہ فریقین کے درمیان مداخلت نہیں کرے گا اسد خان نے بھی اسے پچیس ہزار روپے تھما دیئے اس طرح وہ پچاس ہزار کی خطیر رقم لے کر لاہور واپس چلا گیا۔

الغرض اس لڑائی اور رشوت نے عبدالصمد خان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اجارہ کی رقم خالصہ حکومت کو ادا نہ کرے اور اس نے ایسا ہی کیا، جس کے نتیجہ میں اسے گورنری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اور دائرہ دین پناہ کی جاگیر بھی بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔[1]

جنرل ونتورہ کا سنگھڑ پر حملہ۔ امیر بہاول پور نے ۱۸۲۰ء میں ڈیرہ غازیخان کا ٹھیکہ لیا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں اس نے سکھوں کی ایما پر ہڑند اور داجل کا علاقہ ریاست قلات سے علیحدہ کر لیا۔ اور ڈیرہ غازیخان میں ملا دیا۔ اسی دور میں اس نے سنگھڑ پر بھی حملہ کیا تھا۔ لیکن اسے ڈیرہ غازیخان سے ملانے کی بجائے خراج گزار بنا دیا۔ وہ ڈیرہ غازیخان پر اپنے ناظم بھیج کر حکومت کرتا رہا۔ چنانچہ غلام قادر خان ڈاہر، دائم خان اور قائم خان کے نام اس وقت کے ناظمین میں ملتے ہیں۔ اس دوران میں نواب بہاول پور نے مظفر گڑھ کے بعض علاقے بھی ہتھیا لیئے اور انہیں ریاست بہاولپور میں شامل

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر میانوالی ص ۳۸۔

کرلیا۔ نواب کے یہ عزائم دیکھ کر سکھ حکومت کو تشویش ہوئی، مبادہ کہ وہ زیرین ڈیرہ جات اور اس سے ملحقہ دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنا حق جتلا دے۔ اور انہیں بھی ریاست میں شامل کرے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے جنرل ونتورہ کو بھیج کر اول ڈیرہ غازیخان پر قبضہ کیا اور دو سال تک اسے ناظم بنائے رکھا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا واقعہ ہے۔ اب جنرل ونتورہ نے نواب محمد اسد خان سے خراج کا مطالبہ کیا، جو اس سے قبل نواب بہاولپور کو ادا کر رہا تھا۔ مگر اسد خان نے خراج دینے سے انکار کر دیا، جس پر جنرل ونتورہ نے دیوان کرپا رام کو ایک لشکر دے کر سنگھڑ پر بھیج دیا۔ اسد خان اس وقت اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پاکر اندر درّہ سنگھڑ قلعہ دربھلہ و دڈھاچی میں جا بیٹھا۔ جنرل ونتورہ نے خوشی رام ہندو کو منگروٹھ میں قلعدار بنا دیا۔ اور پائندخان افغان کو سنگھڑ کا اجارہ دے دیا جنرل ونتورہ نے ان سے جب اجارہ کی رقم طلب کی تو انہوں نے خسارہ کا بہانہ بنایا، اور رقم دینے سے انکار کر دیا۔ تب جنرل ونتورہ نے اپنے سپاہی بھیج کر ان دونوں کو گرفتار کرالیا۔ اور لاہور دربار میں رنجیت سنگھ کے پاس بھیج دیا۔[1]

چارلس میسن نے یہی خبر سنی تھی اور کہا کہ نواب محمد اسد خان پر سکھوں نے حملہ کر دیا ہے اب وہ اندر پہاڑ چلا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ کے بارے میں وہ کہتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ غرضیکہ ۱۸۳۲ء میں جنرل ونتورہ کو ڈیرہ غازیخان سے واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ دیوان کرپا رام کو ناظم ڈیرہ بنا کر بھیجا گیا۔ ادھر اسد خان بھی پہاڑ سے نکل کر سنگھڑ میں واپس آگیا۔ اور زمام حکومت سنبھال لی۔ رنجیت سنگھ کو جب یہ خبر ملی تو اس نے دیوان کرپا رام کو لکھا کہ وہ سنگھڑ پر حملہ کر کے اسد خان کو گرفتار کرے اور سنگھڑ کو اپنی تحویل میں لے لے۔ جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے۔ "دیوان کرپا رام را بہ تسخیر قلعہ ممنوتلہ (منگروٹھ) و تخریب آں نواحی مامور فرمود، برای حاضر شدن اسد خان بلوچ کہ در تمرّد و سرکشی نظیرے نہ دارد ارشاد فرمودند"[2]

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کرپا رام کے سنگھڑ پہنچنے پر نواب محمد اسد خان تنکانی نے خراج کی رقم جو ستاسی ہزار روپے تھی دے دی اور اپنے ایک صاحبزادے کو بھی یرغمال میں اس کے

[1] تذکرہ رؤسائے پنجاب ج۲ ص ۴۲۵ [2] ظفرنامہ رنجیت سنگھ ص ۱۵۸۔

حوالے کر دیا اور خود بدستور حکمران رہا۔ اس امر کا پتہ اس روایت سے ملتا ہے یعنی "حضرت دیوان کرپا رام بوضوح پیوست کہ قلعہ ممنوتلہ (منگروٹھ) بہ سطوت اقبال بادشاہ مفتوح۔ و اسد خان شغال سیرت از روباہ سیرتی باز آمدہ۔ ہشتاد و ہفت ہزار روپیہ نذر گزرانیدہ۔ برائی مستقبل پسر خود را سپردہ۔۔۔ حضور والا بابجائی اسد خان منظور داشتہ حکم بمراجعت بخشیدند"[1]

سکھوں کا سنگھڑ پر قبضہ: اس وقت دیوان کرپا رام نے ستاسی ہزار روپیہ بطور نذرانہ اور ایک شہزادہ بصورت یرغمال لے کر رنجیت سنگھ کی خدمت میں پیش کیے اور سنگھڑ پر اسد خان کی حکومت بحال رہی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسد خان نے غالباً خراج دینا بند کر دیا۔ جس پر ۱۸۳۵ء میں شہزادہ کھڑک سنگھ سنگھڑ پر چڑھ آیا اور حملہ کر دیا۔ اسد خان پھر قلعہ منگروٹھ خالی کر کے اندر پہاڑ کوٹ دربھلہ و دڈھاچی میں جا بیٹھا۔ لیکن کھڑک سنگھ اب منگروٹھ میں بیٹھ گیا، اور رنجیت سنگھ کی سخت ہدایات کے بموجب اسد خان کی گرفتاری کے منصوبے سوچنے لگا۔ اسد خان اب میدان میں نہیں آتا تھا۔ اس بار وہ منگروٹھ سے خزانہ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بہرصورت اسد خان نے جب دیکھا کہ کھڑک سنگھ واپس جانے کو تیار نہیں ہے۔ تو اس نے اپنے لڑکے ذوالفقار خان کو پچیس ہزار روپے دے کر اس کے پاس بھیج دیا کھڑک سنگھ نے یہ رقم وصول کر لینے کے ساتھ ساتھ شہزادہ کو بھی گرفتار کر لیا۔ رقم اور شہزادے کو اس نے رنجیت سنگھ کے پاس لاہور روانہ کر دیا۔

اسد خان کی گرفتاری - رنجیت سنگھ نے جب دیکھا کہ اسد خان کسی صورت میں اس کے ہاتھ نہیں آتا ہے اور نہ ہی آسانی سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسد خان نے بھی سنگھڑ کی واگزاری کے لئے بہت سے منصوبے بنائے۔ اس کے آدمی میدان میں آکر شب خون مارتے اور لوگوں کے مال مویشی ہانک کر اندر پہاڑ لے جاتے تھے۔ لیکن یہ تمام حربے ناکام رہے۔ اب اسد خان دربھلہ سے اٹھ کر بارتی سے آگے مقام ٹھیکر پر جا پہنچا، جہاں کے شہوانی بزدار اس کی حمایت پر تھے چنانچہ وہاں

[1] ظفرنامہ رنجیت سنگھ ص ۱۶۴۔

پر موجود ایک قدیم مسجد اور اس سے ملحقہ مکان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سنگھڑ کا رئیس محمد اسد خان یہاں آکر رہائش پذیر ہوا تھا، اور اس کمرہ میں اس نے اپنا خزانہ رکھ چھوڑا تھا۔ الغرض "تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ" رنجیت سنگھ نے ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نواب شیر محمد خان سدوزئی کو اسد خان کی گرفتاری کیلئے تیار کر لیا۔ شیر محمد خان، اسد خان کا نہایت گہرا دوست تھا۔ اس نے اپنا ایلچی بھیج کر اسد خان کو اپنے پاس بلوا لیا اور کہا کہ آپ میرے پاس آجائیں آپ کو جس قسم کی فوجی مدد کی ضرورت ہو گی بہم پہنچائی جائیگی آخر کار سنگھڑ کا یہ ٹیپو ثانی اپنے یار کے جھانسے میں آگیا۔ چنانچہ جونہی اس کے پاس پہنچا اس نے گرفتار کر لیا اور رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیج دیا۔ رنجیت سنگھ نے اسد خان کو قیدِ تنہائی میں ڈال دیا۔

دیوان ساون مل اس وقت ملتان کا گورنر تھا۔ اور اسد خان کا دوست تھا، اس نے رنجیت سنگھ سے یہ کہہ کر کہ اسد خان کو اس کے پاس ملتان رہنے کی اجازت دی جائے چنانچہ اسد خان ایک نظر بند کی حیثیت سے ملتان میں آگیا۔ اس وقت اس نے اپنے اہل و عیال کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ چنانچہ نواب محمد اسد خان نتکانی کی گرفتاری اور نظر بندی کے بعد سنگھڑ میں مستقل طور سے سکھ ناظم آنے لگے۔ بلوچوں کی یہ چھوٹی مگر حریت پسند ریاست ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ ملتان میں رہائش کے دوران دیوان ساون مل نے نتکانی رئیس کا چار ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا جو اس عرصہ میں انہیں ملتا رہا۔

ایڈورڈسن کی سنگھڑ میں پیشقدمی - اللہ تعالیٰ ایک پر دوسرا زور آور نہ بناتا تو زمین کا نظام یقیناً بگڑ جاتا۔ ۱۸۴۸ء میں ملتان کا گورنر دیوان ساون مل کا لڑکا مولراج تھا اس وقت ملتان میں دو انگریز افسر مارے گئے اور ملتان کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ان دنوں انگریزی حکومت دریائے ستلج کے پار تک قائم ہو چکی تھی اور ان کا ایک ریذیڈنٹ لاہور میں رہتا تھا۔ رنجیت سنگھ کا جانشین ایک کمسن دلیپ سنگھ تھا۔ مگر مملکت کا کاروبار اس کی والدہ چندر کور کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے آدمیوں کے ملتان میں مارے جانے کی پاداش میں دیوان مولراج کے خلاف ہر طرف فوجیں بھیج دیں

ـــــــــــ
لہ تذکرہ رؤسائے پنجاب ج۔ ص ۶۲۶ - ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان ص ۲۸۔

سر ہربرٹ ایڈورڈس جو اپر ڈیرہ جات میں تھا اسے حکم ہوا کہ وہ زیریں ڈیرہ جات میں فوراً پہنچے اور ان پر قبضہ کر لے۔[1] وہ حکم پاتے ہی ڈیرہ فتح میں پہنچ گیا اور قلعہ منگروٹھ کی فتح کے منصوبے بنانے لگا۔ دوآبہ سندھ ساگر میں اس وقت انگریزوں اور دیوان مولراج کی فوجیں صف آرا تھیں اور نواب محمد اسد خان وہاں پر قائم ایک کیمپ میں نظر بند تھا۔

اپنی اپنی پیشکش - اس وقت دیوان مولراج اور ایڈورڈس نے اپنے اپنے طور پر نواب محمد اسد خان کو اپنے ساتھ ملانا چاہا، اور اس کی حمایت لینا چاہی۔ مولراج نے ریاست سنگھڑ کی واگزاری اور اس کی بحالی کی پیشکش کی۔ مولراج کی اس پیشکش کی خبر ایڈورڈس کو بھی ہو گئی، چنانچہ اس نے اپنے ریذیڈنٹ لاہور کو لکھا کہ اسد خان سے میری زبانی باتیں ہوئیں جس سے میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اگر یہی پیشکش اسے میں کر دوں تو سنگھڑ کا یہ رئیس مولراج کی طرف سے تلوار سے کام نہیں لے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دیوان نے کچھ زیادہ پیشکش کی ہے اور اسد خان کو کم از کم اس وقت کے لئے اپنے حق میں محفوظ کر لیا ہے۔

تاہم اسد خان یہ بھی جانتا ہے کہ سنگھڑ پر قبضہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے ایڈورڈس نے یہ بھی کہا کہ اسد خان نے مٹھا خان قیصرانی کی معرفت تجاویز بھیجی ہیں اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ سنگھڑ کا علاقہ بطور سابق حیثیتِ ریاست، وہوا بطور جاگیر اور دس ہزار روپے نقد دیئے جائیں تو وہ قلعہ منگروٹھ پر حملہ کر کے سکھوں کے پنجہ سے نکال سکتا ہے۔

> "... He has again sent overtures through Mitha Khan, Kusranee, demanding the farm of Sungurh, ten thousand rupees cash, and the country of Wahoa in Jageer as the price or desertion."

ایڈورڈس کہتا ہے۔ میں پہلے ہی اسد خان کو ایک مردہ آدمی سمجھتا تھا۔ جس کے ساتھ زیادہ بحث کرنا بیکار ہے اسے اس وقت خوش آمدید کہا جا سکتا ہے جب وہ بغیر کسی شرط کے سنگھڑ کو حاصل کرتا یہ صاحب لوگ (انگریز) کا دستور نہیں ہے کہ وہ چھوٹے باغیوں کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کر کے انھیں خریدے اور بیچے اور اگر اسد خان نے اپنے آپ کو بیچ ڈالنے کا کوئی عزم کر دکھایا ہے

ـــــــــــ
[1] - اپر ڈیرہ جات سے مراد بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان ہے اور زیریں ڈیرہ جات سنگھڑ اور ڈیرہ غازیخاں ہے۔

CS CamScanner

تو پھر وہ آئے جو کچھ اس کے پاس توپیں وغیرہ ہیں، لے آئے تاکہ اس کی قیمت بلند ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایڈورڈس، اسدخان کے مذکورہ بالا شرائط کے پیش نظر کہتا ہے " نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز"۔

اسدخان کی شرائط چونکہ یہ گفتگو مٹھا خان قیصرانی اور ایڈورڈس کے درمیان ہو رہی تھی جو کہ ایک ایلچی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ تو ایڈورڈس کہتا ہے مٹھا خان نے فوراً اپنا لہجہ ڈھیلا کر دیا اور کہا کہ اسدخان آپ کے پاس اپنا وکیل (ایلچی) بھیجے گا تاکہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکے چونکہ ایڈورڈس صاحب اپنی روزانہ ڈائری ریذیڈنٹ لاہور کو لکھ کر بھیجا کرتا تھا اس لئے وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اس وقت جبکہ سنگھڑ کے سابق رئیس کا یہ حال ہے کہ وہ دریا کے دوسرے کنارہ (سندھ ساگر دوآب) پر بیٹھا ہے۔ اور اپنے اس علاقہ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا ہے جس کے لینے کا اس نے مولراج سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس لئے میری نقل و حرکت کا انحصار دشمن کی نقل و حرکت سے وابستہ ہے۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں ڈیرہ غازیخان کی طرف چلا جاؤں اور اپنے پیچھے اسے دریا عبور کرنے کا موقع دے دوں[1]۔

ایڈورڈس کی ڈائری کے یہ اقتباسات اس وقت کے ہیں جبکہ وہ ابھی فتح خان میں بیٹھا تھا۔ "صاحب لوگ" کا انداز گفتگو ملاحظہ ہو ایک طرف وہ سنگھڑ کے رئیس اسدخان کو ایک مردہ شخص سمجھتا ہے دوسری طرف اس کا دل اس بات پر ڈوبا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو میں کسی طرف کھسک جاؤں اور اسدخان آ کر سنگھڑ پر قبضہ کر لے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک اور موقع پر لکھتا ہے۔ زیرین ڈیرہ جات یا وہ علاقہ جس پر قبضہ کرنے کا حکم ہوا تھا اس کے متعلق پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ دو ضلعوں پر مشتمل ہے شمال میں سنگھڑ اور جنوب میں ڈیرہ غازیخان۔ بلاشبہ سنگھڑ قریب ترین ہونے کی وجہ سے قبضے میں پہلے لے لینا چاہیئے تھا ضلع سنگھڑ کی کلید منگروٹھ کا قلعہ ہے۔ جو صوبہ ملتان میں دریائے سندھ کے مغربی علاقوں میں برٹرنڈ کے بعد اپنی اہمیت کا حامل واحد قلعہ ہے۔ ۱۱ مئی ۱۸۴۸ء کو قلعہ منگروٹھ فتح کر لینے کے بعد ایڈورڈس لکھتا

[1] اے ییئر ان دا پنجاب فرنٹیر ۲۲۰۔ ص ۱۹۶ تا ۱۹۸۔

ہے یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے اتنی آسانی سے قلعہ منگروٹھ فتح کر لیا کیونکہ اس سے فتح خان اور ڈیرہ غازیخان کے درمیان کا پورا علاقہ بغیر کسی محاصرہ اور تاخیر کے کھول دیا گیا[1]۔

ایڈورڈس کے ایک بیان سے یہ تأثر ملتا ہے کہ اسدخان سکھ فوج کے کسی ایک دستہ کی کمان خود کر رہے تھے اور وہ قلعہ منگروٹھ کو انگریزوں سے واپس لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۴ مئی کے خط میں ایڈورڈس لکھتا ہے کہ مولراج اپنی افرادی اور توپوں کی تمام طاقت کو ڈیرہ غازیخان کے بالمقابل قریشی کے مقام پر جلد مرکوز کر دے گا۔ اور اسدخان اور ہر بھگوان داس کی فوج جو کہ اس وقت میرے عین مقابل پڑی ہوئی ہے اس مقصد کے حصول کی خاطر دریا کے بائیں کنارہ کے ساتھ ساتھ نیچے کو لائی جائے گی۔

ایڈورڈس کی ایک اور پیشکش قلعہ منگروٹھ کی فتح کے دوران اسدخان نے ایڈورڈس کی پیشکش قبول نہیں کی تھی اور نہ ہی ایڈورڈس نے اس کی شرائط مانی تھیں۔ اب جبکہ ایڈورڈس نے ڈیرہ غازیخان کی طرف پیشقدمی کی ہے۔ تو اسدخان کو پھر دعوت دی گئی کہ وہ سکھوں کی حمایت کرنے سے باز آ جائے اور انگریزی لشکر میں شامل ہو کر ان کی مدد کرے۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت بھی اسدخان نے ایڈورڈس کے سامنے اپنی کچھ شرائط رکھیں جنہیں منظوری کی غرض سے ریذیڈنٹ لاہور کے پاس بھیجا گیا تھا شاید وہ مان بھی لی گئیں۔ اور ایڈورڈس کو اس سے مطلع کر دیا گیا۔ اب وہ ان شرائط سے انحراف کرتے ہوئے اپنے ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے تین چار روز قبل مجھے سرکار سے اسدخان کے متعلق اس وقت پروانہ ملا جب میں دشمن کے بالمقابل ڈیرہ ڈالے پڑا تھا۔ اس (اسدخان) نے بغاوت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کر لیا ہے۔ اور اپنی جاگیر کے رکھنے کے اس وعدہ کا وہ بہت کم مستحق ہے۔ جس کا پروانہ میں ذکر کیا گیا ہے اس لئے میں نے اسے آگاہ کر دیا ہے کہ اگر وہ ان شرائط سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اسے فوراً ہمارے ساتھ مل جانا چاہیئے ورنہ وہ اپنی ان شرائط کو منسوخ سمجھے (میں جو کچھ لکھ رہا ہوں درست ہے)

[1] اے ییئر ان دا پنجاب فرنٹیر ج ۲ ص ۱۷۱ تا ۱۷۴۔

CamScanner

کیونکہ سرکار ان فاصلوں سے آگاہ نہیں ہو سکتی جہاں تک وہ (اسدخان) پہنچ چکا ہے۔

پھر بیان کیا ہے کہ آج صبح اسدخان کی طرف سے مجھے ایک جواب آکر ملا، جس میں اس نے یہ عذر کیا ہے کہ اس کا کنبہ ملتان میں ہے اس لئے وہ ہماری مدد نہیں کر سکتا، حالانکہ یہ اس نے جھوٹ کہا ہے کہ مجھے ایک صحیح خبر کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے اپنے بال بچے ملتان سے مخدوم رشید بھیج دیئے ہیں جہاں پر وہ چاہے گا اپنے بچوں کو بھیج دے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہے باقی سب دعوے اس کے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی آخری مرحلے میں ہمارے ساتھ آکر ملے گا

اسدخان کا سکھوں کی قید سے فرار آگے چل کر لکھتا ہے کہ سکھ فوج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو باقاعدہ ملازم ہیں، ہماری مدافعت کر سکتے ہیں، باقی نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسدخان نتکانی ملتان کو نہیں گیا بلکہ وہ کسی کشتی و پیچ میں ہے اور عملاً ہر بھگوان داس نے اسے کیمپ سے علیٰحدہ کسی مکان میں گرفتار کر رکھا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ امین آباد کا جواہر مل اس سے سلسلہ جنبانی کر رہا ہے کہ وہ دو سو آدمیوں کے ساتھ دشمن سے فرار ہو کر ہمارے ساتھ آملے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ آؤ باتیں نہ کرو۔ اسدخان تک پہنچنے میں ہمارے قاصدوں کو سخت دقت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک قاصد کی ناک کاٹ دی گئی۔ آخر میں کہتا ہے بہت دن ہوئے کہ اسدخان فرار ہو کر بہاولپور کو چلا گیا ہے۔[۴۸]

یہ ایڈورڈس کے ۲۰ جون کے روزنامچہ کی رپورٹ ہے اس وقت وہ ڈیرہ غازیخان کو فتح کر کے ملتان کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے چنانچہ انہوں نے لغاری سردار کو اور نتکانی سردار کو اپنی حمایت پر بلایا اور ملتان کے محاذ پر چلنے کو کہا، لغاری سردار تو ایڈورڈس کے پاس چلا گیا تھا مگر اسدخان نہیں گیا جس کا ذکر اس اقتباس میں کیا گیا ہے۔

" Jalal Khan Leghari, soon came in, made his submission and added 80 men to their force. Asad Khan Nutkani declined to come

[۴۸] - اسد میگران وا پنجاب فرنٹیر ج ۲ ص ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۲۳۸ - ۲۳۹ -

in, but he did not oppose and ultimately joined, the British side as one of the force, under the Nawab of Bahawalpur."

اوپر بیان کی گئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسدخان سکھوں کی بارہ سالہ نظر بندی سے چھٹکارا حاصل کر کے امیر بہاولپور کے پاس چلا گیا۔

اسدخان ملتان کے محاذ پر۔ اسدخان جون ۱۸۴۸ء میں سکھوں سے آزاد ہو کر بہاولپور پہنچا تھا اور وہاں پر رہا مارچ ۱۸۴۹ء میں ملتان کے محاذ پر برٹش فوجوں کا زبردست اجتماع ہوا اور وہ ہر طرف سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ملتان میں جمع ہونے لگیں۔ یہ چھوٹے بڑے فوجی لشکر مقامی سرداروں اور وڈیروں کی طرف سے بھیجے جا رہے تھے جن میں ایک لشکر نواب بہاولپور کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ اس فوج میں سنگھڑ کا سابق نواب محمد اسدخان، اس کا پوتا سردار محمد مسو خان اور حاجی محمد مسو خان بن لعل خان نتکانی شامل ہو کر آئے تھے ان کے ساتھ چار سو کا فوجی دستہ تھا جس کا تعلق نتکانی قبیلہ سے تھا۔ اس دستہ کی کمان خود محمد اسدخان کر رہا تھا یہ لوگ اپنے قدیم دشمن دیوان مولراج کے خلاف آکر لڑے۔[۴۹]

کُلّ من علیہا فان: نواب محمد اسدخان سابق والئے سنگھڑ ملتان کے ہنگامہ سے فارغ ہو کر بہاولپور چلا گیا اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بہاولپور کے مالیہ سے اسے تا دم حیات پنشن ملتی رہی جو اس کی وفات کے بعد بند کر دی گئی۔ اپنی زندگی میں وہ سنگھڑ واپس نہ آیا اور نہ ہی اس نے کسی جائیداد یا اعزاز کے حصول کی کوشش کی۔ اور نہ ہی اس نے اپنی قوم و قبیلہ کی دوبارہ بحالی کی طرف قدم اٹھایا۔[۵۰] اسدخان کا ضمیر اس بات پر مطمئن تھا کہ سکھ نہلا تھا تو انگریز دہلا" ہے اس لئے ان کے سامنے سنہری لباس پہن کر جانے سے گھر پر کھدر کا لباس پہن کر بیٹھ جانا زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ اسدخان نے اپنی بقیہ زندگی خلوت میں بیٹھ کر بہاولپور میں گزار دی۔

سنگھڑ کے اس ٹیپو سلطان صفت نواب نے ۱۸۶۰ء میں وفات پائی تھی۔

[۴۹] گل بہار ص ۸ ۲۵ تذکرہ رؤسائے پنجاب ج - ص ۲۴۷ [۵۰] ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ڈیرہ غازیخان ص ۶۶۔
تذکرہ رؤسائے پنجاب ج - ص ۲۴۷
تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۸۵ -

اس کی میت کو بہاول پور سے لا کر منگروٹھہ غربی کے قبرستان بخاری صاحب میں دفن کیا گیا، جہاں پر اب آپ کی قبر کا نشان باقی نہیں رہا ہے۔ اسد خان کے ورثاء صرف اس کی قبر کا موقع بتا سکتے ہیں مگر اس کا دوبارہ تعویذ نہیں بنا سکتے۔

میں نے جب اسد خان کے ایک وارث سے ان کی قبر کا نشان دوبارہ قائم کرنے کو کہا تو وہ کہنے لگے کہ ہم (منگروٹھہ والے) احمد پور شرقیہ والے اور بہاول پور والے امرائے نتکانی مل کر اس مسئلہ پر غور کریں گے اگر ضرورت محسوس کی گئی تو چندہ اکٹھا کر کے اسد خان کی قبر کا تعویذ دوبارہ بنا دیا جائے گا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کا خط آیا جس میں لکھا ہوا تھا "کل من علیہا فان"

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک زایشان شکم خاک است آبستن جاویداں

ایک خاتم المؤرخین کی اپیل اور نیک مشورہ - ابتدا میں مجھے جب بلوچوں کی تاریخ بعنوان "صحیفۂ بلوچاں" لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ سوءِ اتفاق یا حسنِ اتفاق کہیئے، میں نے ایک شخص کو اپنا شریک سفر بنا لیا اور تاریخی سفر شروع کر دیا اس دوران میں جو کچھ تاریخی مواد حاصل ہوتا اسے میں اپنی یادداشت بک میں نوٹ کر لیتا اور اگلے سفر کے دوران اپنے اس ہم سفر سے ذکر کرتا۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا پھر اس دوسرے شخص کے دل میں فتور پیدا ہو گیا اور سوچا کہ یہ شخص کتاب لکھے یا نہ لکھے۔ جو ذخیرۂ مواد میری کھوپری میں سن سن کر جمع ہو چکا ہے کیوں نہ اسے اخبار کے اوراق میں زیب داستان کر دوں۔ چنانچہ مجھ سے ذکر کئے بغیر اس نے ایسا ہی کیا اور "نتکانی قوم" کے عنوان سے ایک مقامی ہفت روزہ میں دو قسطوں میں ایک مضمون جھاڑ دیا۔ مجھے اس وقت علم ہوا جب وہ دوسری قسط نکال چکا تھا۔ چونکہ اس نے جو کچھ لکھا تھا غیر مستند اور عامیانہ رنگ میں تھا۔ میرے لئے ضروری ہو گیا کہ نوتک قوم کے کسی ایسے شخص کا ذکر کر کے اخبار میں چھپوا دوں جسے اس قوم میں کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا اور نواب محمد اسد خان سابق والئے سنگھڑ" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر لیا اور اپنے اس حریف سے اس کا ذکر کیا۔ کہ تیری غلطی اور نافہمی کے

باعث مجھے ایسا کرنا پڑا رہا ہے۔ وہ اٹھا اور اٹھ کر ایک بیان لکھا جس کا عنوان تھا "مخلصانہ اپیل اور نیک مشورہ" مقامی ہفت روزہ پرچہ جات میں اشاعت کیلئے دے دیا۔ جس کی نقل یہ ہے۔

میں اپنی واجب الاحترام بلوچی اقوام سے بالعموم اور محترم المقام قوم نتکانی سے بالخصوص اپیل کرتا ہوں کہ میں نے قوم نتکانی اور اس کے مورثِ اعلیٰ میر حالی نوتک خان مرحوم و مغفور کی مختصر مگر جامع تاریخ کی دو اقساط ضلع ڈیرہ غازیخان کے ہفت روزہ جرائد میں دے دی ہیں۔ اب کوئی صاحب اسے اخبار میں یا کتابچہ کی صورت میں شائع کرنے کی کوشش نہ فرمائے ورنہ اس کی یہ تحریر مسروقہ اور خلاف ضابطہ تصور ہو گی۔ بلکہ قوم نتکانی کے آخری نواب سردار محمد اسد خان مرحوم کے حالات بھی لکھنے کی زحمت گوارہ نہ فرمائے جبکہ بندہ نے از خود نواب صاحب مذکور مرحوم کا ذکرِ خیر ایک اچھے اور واضح پیرائے میں کر دیا ہے۔ مگر اس میں مجھے بخیل اور ممسک تصور نہ فرمایا جائے۔ اگر کسی صاحب کے پاس نواب صاحب کے مکمل حالات موجود ہیں تو وہ میری نظر سے گزروا کر شائع کرا سکتا ہے مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

نیاز کیش .... ۳ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ (۲-۵-۶۸)

اس اپیل پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے اس کے جواب میں صرف یہ شعر درج کیا جاتا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

یوں تو اس شخص کی فطرت ہی ایسی ہے اس سے شکایت اور گلا کرنا اچھا نہیں ہے عقلاء کا کہنا ہے۔

نیش عقرب نہ از پئے کیں است
مقتضائے طبیعتش این است

نور احمد خان فریدی کا ایک منطقی فیصلہ یہ تو تھا ایک اپنے کا حال، ایک

CamScanner

اور فاضل مؤرخ لکھتے ہیں۔ رائے بہادر ہتو رام نے یہ تاریخ (گل بہار) پہلی مرتبہ ۱۸۷۱ء میں طبع کرائی تھی، سردار محمد مسو خان، سردار محمد زمان خان اور سردار فتح محمد خان نتکانی اس کے معاصر تھے۔ اور وہ اپنے خاندانی حالات سے عہدِ حاضر کے نتکانیوں سے زیادہ باخبر تھے .... عصرِ جدید کے مضمون نگاروں (راقم کی طرف اشارہ ہے) کی ہمہ دانی مسلّم۔ لیکن اپنے آب و جد کے نسب سے قطعاً نابلد ہیں[1]۔

اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا۔ "اگر یہ بات درست ہے تو کیا وجہ ہے ہم اپنے اسلاف کی ان روایات پر یقین نہیں رکھتے جن میں سے ایک تحفۃ الکرام کے حوالے سے آپ نے روایت نقل کی ہے یعنی "امیر حمزہ اتفاقاً کسی شکار کے تعاقب میں جاتے ہوئے ایک کف دست میدان میں جا پڑے، وہاں ایک پری نمودار ہوئی جس سے امیر حمزہ کو تعلق ہو گیا، چند روز دل بہلانے کے بعد حمزہ تو اپنے وطن چلے گئے مگر وہ پری حاملہ ہو گئی، اور اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ ان سے ابان پیدا ہوئے، ان سے ہارون اور ان سے محمد.... محمد بن ہارون، محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ کی مہم پر آیا۔ اس کی سات بیویاں تھیں جن سے پچاس اولادیں ہوئیں۔ بلوچ انہیں کی اولاد ہیں[2]۔" عہدِ حاضر کے اِن خاتم المؤرخین کی بہرحال داد دینا پڑے گی۔

نہ سنتے گر تم غیروں کی زبانی: یہ ایک تعجب خیز بات ہے کہ غیر تو غیر ہی رہتے ہیں لیکن اپنے بھی اسدخان کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتے ہیں اس کی اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ تاریخ کے اوراق میں انہیں دو مقامات پر متمرّد اور ظالم کے الفاظ سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی حقیقت بیان نہیں کی گئی۔ پہلا لفظ "ظفرنامہ" رنجیت سنگھ کی عبارت میں ایک موقع پر آیا ہے اور دوسرا لفظ ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ غازیخان میں ملتا ہے یہ دونوں مؤرخ ہندو اور عیسائی ہیں جن سے کسی قسم کی صداقت اور اِنصاف کی توقع رکھنا عبث ہے "الکفر ملّۃ واحدہ" اور یوں بھی ان دونوں قوموں کو نواب محمد اسدخان سے خدا کے نام کا بیر تھا اور انہوں نے اسد دشمنی میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑ رکھی تھی اس کی وجوہات روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ انہیں اسدخان کے ذکر میں دوبارہ دیکھا جا سکتا ہے۔

[1] ماہنامہ بلوچی دنیا اگست ۱۹۶۱ء [2] ہفت روزہ بلال ڈیرہ غازیخان ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء بحوالہ بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ص ۳۷۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی قید و بند اور بے سکونی میں گزار دی مگر سکھ حکومت کی غلامی کا جوا اپنے گلے میں نہیں ڈالا۔

اسی طرح اسدخان نے فاتح ڈیرہ جات سر ہربرٹ ایڈورڈس سے جنگ میں کسی قسم کا تعاون اور اس کی مدد نہیں کی تھی، یہاں تک کہ ملک میں سیاسی تبدیلی آئی۔ صاحب لوگ نے ایسے سرداروں کو جاگیرات اور خطابات دے کر انہیں ہر طرح سے اپنی حمایت میں لے لیا۔ مگر اس نے یہ چیزیں قبول نہیں کیں۔ نہ خود کچھ حاصل کیا اور نہ ہی قوم کی دوبارہ بحالی میں دلچسپی لی۔ الغرض یہ بات کوئی اچھی سمجھے یا بری ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔

اسدخان پر ایک بڑا جرم لگایا جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے جبراً محصول لیتا تھا جبکہ اس وقت آبادی کے وسائل بھی زیادہ بہتر نہیں تھے۔ چنانچہ اپنی زمینیں لوگ کوڑیوں کے بھاؤ بیچ کر یا انہیں مفت میں چھوڑ کر ترک سکونت کر جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے "اشتر بہ دانگے و دانگے کو، یعنی اونٹ ایک کوڑی میں مگر کوڑی کہاں؟

یہ صورت صرف سنگھڑ تک محدود نہیں تھی بلکہ عبدالصمد خان بادوزئی جاگیردار ڈیرہ دین پناہ (شرقی)، قاضی نور محمد اجارہ دار کوٹ مٹھن وغیرہ سبھی کا یہی حال رہا۔ موتی رام ناظم سنگھڑ اور پائندخان اجارہ دار اسی محصول کی کمی کے باعث یہاں سے گرفتار ہو کر لاہور دربار کو بھیجے گئے تھے۔ اور آج بھی کوئی شخص سرکاری مالیہ کی ادائیگی میں تساہلی کرے یا وقت پر ادا نہ کرے تو اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جاتا ہے۔ سنگھڑ سے ترک سکونت کر جانے کی دوسری وجہ یہ ہے جو عوام الناس کے علم میں یقیناً نہیں ہے۔ اسدخان اور اس کے چچا سردار لعل خان کی باہمی لڑائیوں میں یہاں کے لوگ دو مختلف فریق ہو چکے تھے۔ ایک گروہ اسدخان کا حمایتی اور دوسرا لعل خان کا طرفدار تھا۔ اسدخان جب برسر اقتدار آ گیا تو اس نے اپنے فریق مخالف سے ضرور انتقام لینا تھا۔ کچھ لوگ تو اس انتقامی کارروائیوں کی زد میں آ گئے تھے اور کچھ اس خوف سے سنگھڑ کو خیرباد کہہ کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے یہ امر بھی غالباً فطری تھا۔ باقی رہی ان کے متعلق یہ عام روایت کہ وہ لوگوں کے سروں پر بیر کی گٹھلیاں تڑوایا کرتا تھا۔ اس پہلو کو سمجھنے کے لئے ذیل

عقل اور شعور والے علم کی غرورت ہے دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی جابر سے جابر شخص نظر کے سامنے آنے والے ہر آدمی کو پکڑوالے اور اس کے سر پر گٹھلیاں توڑوانا شروع کر دے۔ صاف ظاہر ہے کہ اسد خان ایسا نہیں کرتا ہو گا بلکہ کسی جرم میں جو شخص پکڑا جاتا ہو گا تو اسے تعزیر کے طور پر اس قسم کی سخت سزا دی جاتی ہو گی۔ کسی حاکم وقت کے ایسے فعل کو ہم سخت سزا کہہ سکتے ہیں ظلم اور زیادتی نہیں۔ تاہم اسد خان انسان تھا اور انسان سے اس قسم کی زیادتی ہو بھی سکتی ہے مگر بہیمت نہیں۔ ایک بار کی اس قسم کی زیادتی کو مخالف بھی خوب اچھال اچھال کر بیان کرتے ہیں اور مقامی طور پر اس کے مخالفین کی کمی نہیں ہے ساتھ ہی میرا کام اسکی وکالت کرنا نہیں ہے جو حقائق میری سمجھ میں آئے بیان کر دیئے ہیں۔ یوں غلام حسن خان حیدرانی نے ملتانی زبان میں اپنی تصنیف مسمیٰ ".." میں اسد خان کے دبدبہ اور شکوہ کے بارے میں یہ شعر لکھ دیا ہے۔

اُبھے بروہی ماریا لمڑیں کیتا درہ۔ صاحبی اسد خان دی تھر تھر کمبدے دوہ

کچھ عادل بادشاہوں کے بیان میں۔ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں "میری عمر ڈھائی قرن (۵۰ سال) سے زیادہ ہو گئی ہے اس مدت میں ان بادشاہوں کے زمانے میں جن کے حالات مجھے یاد ہیں۔ میں نے دیوانِ وزارت میں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھا کہ مشرف، عامل، خواجہ اور افسر و کلرک (عہدہ دار و نویسندگان) محاسبہ و مطالبہ کے سلسلے میں بعض امیروں اور والیوں کی زنجیروں لاتوں اور قید و بند کے ذریعے بے آبروئی اور رسوائی کرتے رہتے تھے۔ جب کسی سے دیوانِ وزارت میں مطالبہ اور محاسبہ کیا جاتا تھا تو اس کی جان خطرے میں رہتی تھی[1]۔

سبحان رائے جہانگیر کے دور کی سزاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں "حکم ہوا کہ بدبخت خسرو کو بیڑی پہنا کر قید رکھیں، حسن بیگ کو بیل کی کھال اور عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں لپیٹ کر الٹے گدھے کی سواری سے شہر کے گرد اگرد گھمائیں۔ حکم والا کی تعمیل کی گئی۔ بیل کی کھال بہت جلد خشک ہو گئی۔ اور حسن بیگ بدبختی چار پہر سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ دم گھٹ کر مر گیا"

عبدالرحیم جسے گدھے کی کھال پہنائی گئی تھی گرمی سے بیتاب ہو ہو کر کھیرا، مولی وغیرہ جو ٹھنڈی چیز ہاتھ آ جاتی کھا جاتا ایک دن ایک رات زندہ رہا۔ اگلے روز مقربانِ درگاہ کو حکم ہوا کہ اسے کھال سے نکالیں۔ کھال میں کیڑے پڑ گئے تھے

[1] ۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۰ ۔

غرض وہ مر گیا[1]۔ اس کے باوجود جہانگیر کی عدلِ جہانگیری پر حرف نہیں آیا اور وہ عادل بادشاہ مشہور رہا۔ اور اسد خان ایک ظالم سردار مشہور ہو گیا۔

شاہ شجاع درانی نے اپنے پیر و مرشد، عالم باعمل اور حاجی الحرمین الشریفین میر واعظ کو جو سید بھی تھے اور شاہ شجاع کے پورے خاندان کے اتالیق بھی، اس کی بے گناہ کھال کھنچوائی اور انہیں بازار میں ڈال دیا گیا جہاں پر میر واعظ نے تڑپ تڑپ اور سسک سسک کر تین دن کے بعد جانِ عزیز جان آفرین کے سپرد کر دی[2]۔

اسد خان خواجہ محمد سلیمان کی نظر میں۔ نواب محمد اسد خان نے جب ریاست سنگھڑ کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کی دستار بندی خواجہ محمد سلیمان نے کی۔ امیر بہادل پور خواجہ صاحب کے خاص مریدوں میں تھے اور ان کی خواجہ سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہو جاتی، اس قسم کی ایک ملاقات خواجہ صاحب اور نواب صاحب کے درمیان قصبہ سلطان پور (تحصیل علی پور) میں ہوئی دوران گفتگو نواب صاحب نے کہا کہ بندہ کو آپ کی ناراضگی کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ آخر آپ مجھ بندہ پر کیوں ناراض ہیں میں تو اسد خان سے بھی کم تر ہوں۔

خواجہ صاحب نے کہا میں تو تجھے اس (اسد خان) کے غلاموں کے برابر نہیں سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ سکھوں نے جب نواب مظفر خان پر ۱۸۱۸ء میں حملہ کیا تو انہی کی حمایت کی اور مظفر خان کے خلاف قلعہ ملتان پر فوجیں بھیجیں جبکہ اسد خان نے ان کافروں کی فوجی امداد کو ایک سپاہی بھی نہیں بھیجا۔ ملفوظات کا جو نسخہ میرے زیر مطالعہ رہا دیمک خوردہ تھا جس کی نقل ملاحظہ کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

"آخر در شہر سلطان پور ملاقات از خان صادق محمد جائز و مقرر داشتند۔ و از تونسہ شریف روانہ شدند۔۔۔۔ باز سوال کرد کہ غلام را وجہ رنجش حضور معلوم نمی شود۔ کہ بباعث کدام تقصیر این غلام ماخذ و گرفتار است۔ فرمودند ترا ہنوز معلوم نیست۔۔۔ پس بیچارہ از راہ نیاز تمام عرض کرد کہ این غلام از اسد خان نیز کم تر است فرمود ترا برابر خدمتگزارانِ اسد خان ہم نمیدانم۔ کہ تو در وقت

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۵۷۰۔ [2] تذکرہ سلیمان ص ۹۷۔

حادثہ سکھاں بر ملتان کمک لشکر ایشاں دستور ساکردہ بودی، د اسد خان لیشنیر ہم ندادہ بود- دیک نظر سپاہی برائی کمک کافراں ہم نفرستاد"[1]

ایک موقع پر خواجہ محمد سلیمان فرماتے ہیں۔ اے اسد خان تیرے دور میں ہمیں صرف اس قدر فائدہ ہے کہ ہم اذان کی آواز سن لیتے ہیں یعنی آنے والا دور اس سے اس قدر بدتر ہوگا کہ ہمیں اذان کی آواز سننا بھی نصیب نہ ہوگا۔ (اشارہ ہے سکھوں کے دور کی طرف)

ایک دفعہ اسد خان نے علاقہ ڈوگ (اندر پہاڑ) کسی شخص سے زمین خرید کی اور وہ شخص قوم جعفرے تھا ایک اور آدمی جو یہ زمین خود خرید کرنا چاہتا تھا، خواجہ صاحب سے آکر شکایت کی اور کہا کہ اسد خان سے وہ زمین واپس دلائی جائے۔ خواجہ صاحب منگروٹھ میں آکر اسد خان سے ملے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا، چنانچہ اسد خان نے وہ زمین واپس کردی۔

ایک اور موقع پر اسد خان نے سیرابی زمینات کے لئے ایک نالہ کھدوایا جو علی محمد چچہ کے رقبہ سے گزرتا تھا وہ شخص بھی خواجہ صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ اسد خان کو اس کے اس ارادہ سے باز رکھا جائے اسد خان نے اس شخص کو اس کے اس رقبہ کے عوض میں دوسری جگہ زمین دے دی تھی[2] یہ علی محمد چچہ خواجہ محمد سلیمان کے لنگر کا مہتمم اور کارپرداز تھا۔

ایک اور موقع پر بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز یار محمد خان افغان جو کہ خواجہ صاحب کے مریدوں میں سے تھا اونٹ پر سوار تونسہ کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ قصبہ ڈونہ کے پاس پہنچا تو اس نے سرکاری کھیت سے کچھ آبو (باجرہ کے بھٹے) توڑ لئے اس کھیت کے رکھوالے نے یار محمد کو پکڑ لیا اور اسد خان کے کاردار گوہر خان بزدار کے پاس لے گیا جو ڈونہ میں رہتا تھا۔ گوہر خان نے یار محمد خان پر دس روپے جرمانہ کر دیئے اور کہا کہ یہ رقم صبح سویرے یہاں پہنچ جائے، ساتھ ہی کہا کہ اپنے باپ (خواجہ صاحب) سے بھی ذکر نہ کرنا۔ یار محمد نے تونسہ پہنچ کر یہ تمام ماجرہ یار محمد خان سوکڑی سے

[1] مناقب المحبوبین ص ۱۹۹ تا ۲۰۱۔ [2] ایضاً ۲۲۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۷۳۔

کہہ سنایا۔ یار محمد ملتانی، خواجہ محمد سلیمان کے خاص مصاحب تھے اس نے یار محمد افغان کا سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا اتفاق سے اس روز نواب محمد اسد خان کا وزیر شیخ محمد بھی دربار میں حاضر تھا۔ یار محمد سوکڑی نے خواجہ صاحب کے کان میں آہستہ سے کہا کہ آپ شیخ محمد سے کہیں کہ وہ نواب صاحب سے کہہ کر یار محمد افغان کا جرمانہ معاف کر دے جو اس کے کاردار گوہر خان بزدار نے اس پر لگایا ہے۔

خواجہ صاحب نے یہ سن کر یار محمد سوکڑی کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر زوردار دھکا دیا کہ وہ پیچھے کو دیوار سے جا لگا۔[1] ساتھ ہی خواجہ صاحب نے کہا میں نے جہاں عرضی دینا تھی پہنچا دی ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کر رکھی ہے۔ تاہم آخر میں نواب محمد اسد خان کے تعلقات خواجہ محمد سلیمان سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ جس کے باعث اسد خان نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ نواب بہاولپور نے جب اسد خان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہی تو خواجہ صاحب نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا لیکن وہ باز نہ آیا اور شادی ہو گئی۔[2]

چارلس میسن کے تاثرات اور ایڈورڈس کے اندازے۔ چارلس میسن ایک انگریز سیاح تھا جو ۱۸۲۸ء میں غالباً بہاولپور کی فوجوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا اور نواب محمد اسد خان سے ملا اور اس کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ہم نے منگروٹھ کی سڑک لی جہاں اسد خان نے ہمارا شائستگی سے استقبال کیا اور خوب خاطر تواضع کی اور لکھا کہ اسد خان پینتالیس سال کا وجیہہ اور عظیم الجثہ جوان ہے۔ اس نے سکھوں کی بے جا مداخلت کی شکایت کی اور افسوس ظاہر کیا کہ اس کے پاس ان کی مزاحمت کو روکنے کیلئے کوئی طاقتور ذرائع نہیں ہیں ورنہ وہ انہیں دریائے سندھ کے دائیں کنارہ پر قدم تک نہ رکھنے دیتا۔

ریاست کا مالیہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہے جس میں تیس ہزار روپیہ وہ نواب بہاولپور کو خراج کے طور پر ادا کرتا ہے۔ یہ اسد خان کا ریکارڈ ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ لڑائیوں میں اپنے آپ کو ایک بہادر سپاہی ثابت کیا، اور ایک موقع پر اس نے منکیرہ کے سکھ گورنر کو دریائے سندھ کے کناروں پر لڑی جانے والی ایک لڑائی میں فاش شکست دی اور اس پر ایک شاندار برتری حاصل کی۔

[1] انتخاب مناقب سلیمانیہ ص ۱۸۸۔ [2] مناقب المحبوبین ص ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۶۔

" It is due to Assad Khan to record that he has, in more than one encounter, proved himself a brave soldier, and on one occasion he gained a splended advantage over the Sikh governor of Mankirah in an action fought on the banks of the Indus. Some years after I saw him, it became the policy of the Sikhs to possess themselves of Sang Ghar, and they did so after a well contested struggle, in which Assad Khan sustained his former reputation and gave them two or three defeats. He sought refuge in the hills and has since been little heard of."

اور ایڈورڈس جو ایک خالص سیاسی جرنیل تھا اسد خان کی ذات سے متعلق اپنے انداز بے بیان کرتا ہے کہ اسد خان کا نام اس کے پرانے خاندان اور رتبہ کی وجہ سے استعمال کیا جاتا رہا لیکن وہ ذاتی طور سے ایک ابن الوقت انسان تھا وہ ایک غیر مستقل مزاج اور بے وفا شخص تھا کسی مقصد کو بغیر وابستگی کے لے لیتا تھا جونہی اس کی اچھی قسمت اس کے سامنے آئی وہ اسے چھوڑ دیتا وہ اس قدر بے اثر سردار تھا کہ اس کے بیس پیروکار بھی نہیں تھے۔

" This Ussad Khan's name is much used, on account of his old family and rank, but, personally, he is a mere time-server, unstable and unfaithful taking up a cause for no attachment, and deserting it as soon as good luck sets him the example. He has not twenty followers."

قارئین کرام چارلس میسن اور ایڈورڈس کے نظریات اور مقاصد کی روشنی میں اسد خان کے متعلق صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ بلوچی سیاست کیسا سردار اور کن صلاحیتوں کا مالک تھا۔ آخر میں جناب نور احمد خان فریدی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ انہوں نے بلوچ برادری سے کیئے گئے اپنے عہد نامہ کی پاسداری اور وفاداری کا کس انداز میں ثبوت دیا ہے۔ اور ناہید نواز کے مضامین کو ماہنامہ بلوچی دنیا کے اوراق کی زینت بنایا ہے۔ ناہید نواز کی ان نگارشات نے یقیناً ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور سنگھڑ کے آخری بلوچ سردار محمد اسد خان خٹکانی کو مقالہ نگار نے اپنے حریت پسند دیوان مولاج کے خلاف غدار قرار دیا ہے۔[1]

[1] ۔ ماہنامہ بلوچی دنیا فروری ۱۹۷۲ء۔

آپ اسدخان کے حالات کو دوبارہ پڑھیں اور ناہید نواز کی تاریخ دانی اور ادب نگاری کی داد دیں اور یہ بھی دیکھیں کہ کس طرح اس نے منگڑوٹھہ کو ننگروٹھہ اور چیتن مل کو چٹان مل لکھا ہے۔

اسدخان کا نظام حکومت ریاست سنگھڑ کا انتظامی ڈھانچہ کچھ اس قسم کا تھا یعنی گاؤں، پرگنہ، تعلقہ، سرکار اور صوبہ اس کی انتظامی اکائیاں تھیں[1] اور ان میں ہر اکائی کا ایک افسر ہوتا تھا جن میں کاردار اور مقدّم خاص طور سے ذکر کیئے گئے ہیں۔ حکومت کابل کی طرف سے ایک نائب ناظم مقرر ہوتا تھا جو ناظم ڈیرہ غازیخان کے ماتحت رہ کر کام کرتا تھا۔ یہ نائب ناظم قلعہ تونسہ میں رہتا تھا، خراج کی وصولی اور سفارتی ذمہ داریاں اس کے سپرد ہوتی تھیں۔ اسی طرح والئے ریاست سنگھڑ کے سفارتی نمائندے کابل دربار اور لاہور میں رہتے تھے جن کا ذکر نواب محمد مسوخان کے بیان میں آچکا ہے۔

نواب محمد اسدخان کے وزیروں میں حافظ شیخ محمد اور نور محمد بابر کا ذکر ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد کے بعد نور محمد بابر کو یہ منصب ملا تھا۔ نورمحمد خان کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے۔" کچھ بات چلی کہ دنیاداروں کی صحبت اور سرکاری کام سے دور رہنا چاہیئے۔ حضرت صاحب (خواجہ محمد سلیمان) نے فرمایا کہ نورمحمد خان بابر بہت ہی زاہد اور عابد آدمی ہے جب اسدخان کی وزارت کا کام اس کے سپرد ہُوا تو عین ماہ رمضان المبارک میں طوائفوں کو اپنے سامنے بٹھا کر شراب خوری کرتا تھا۔"[2]

کاردار ایک سرکار میں ایک کاردار ہوتا تھا جیسا کہ ڈونہ میں گوہر خان بزدار دہوا میں نورمحمد خان کلاچی، اور بنڈی ہیرو میں نورمحمد خان تنگوانی وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔ کاردار عام طور پر اپنے تعلقہ کے جملہ چھوٹے موٹے جھگڑے طے کرتا تھا اور محصول کی وصولی کا کام بھی اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ دیگر انتظامی معاملات بھی اس کی ذمہ داری میں ہوتے تھے۔

[1] ۔ گاؤں سب سے چھوٹی اکائی تھی جس کا حاکم ملکی کہلاتا تھا اس کے بعد پرگنہ (تحصیل یا تعلقہ) اور سرکار ضلع ہوتا تھا جو کئی پرگنوں پر مشتمل ہوتی تھی بعض کے نزدیک صوبہ اور سرکار ایک ہی انتظامی اکائی تھی
[2] ۔ مناقب المحبوبین ص ۲۱۱۔

نورمحمد خان کلاچی کے بارے میں لکھا ہے۔" چون شاہ شجاع از تونسہ شریف کوچیدہ در شہر دہوا داخل شد۔ پس بحسب افواہ عوام الناس شیخ محمد وزیر اسدخان بخدمت حضرت غوث آمدہ، بعد از قدم بوس از جانب اسدخان عرض کرد۔ کہ شاہ شجاع شجاعت نخستین خود بر نورمحمد خان کلاچی والہ و دیگر کارداران شہر دہوا ظاہر ساختہ است۔"[1]

یعنی جب شاہ شجاع (درّانی) تونسہ سے روانہ ہوکر دہوا میں داخل ہُوا۔ حسب معمول عوام میں یہ افواہ گردش کرنے لگی اور اسدخان کے وزیر حافظ شیخ محمد نے خواجہ صاحب (تونسوی) کی خدمت میں آکر بعد قدم بوسی عرض کیا کہ شاہ شجاع نے شجاعت کا پہلا جوہر نورمحمد کلاچی اور دہوا کے دوسرے کارداروں پر ظاہر کیا ہے گویا کہ انہیں ناجائز تنگ کر کے نذرانہ کے نام پر کچھ نقد و جنس لینا چاہتا ہے اسے اس عمل سے روکا جائے۔

مقدّم ۔ مقدّم کسی گاؤں یا کسی قبیلے کے بزرگ اور سربراہ کو کہا جاتا تھا۔ مقدّم کا لفظ اب بھی بلوچوں میں عام پایا جاتا ہے۔ ہندی یا پنجابی میں مقدّم کو مکھیا اور چوہدری کہتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ مقدّم اسلامی حکومت کے ابتدائی دور سے گاؤں کے انتظامات کے سلسلہ میں وہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے کام لیتا تھا۔ مقدّم اپنے گاؤں یا قبیلہ میں چھوٹے موٹے قضیوں کے فیصلوں کی سماعت کرتا تھا اور انتظامی معاملات میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

قاضی ۔ تاریخی کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچ مسلم ریاست سنگھڑ میں شرعی نظام رائج تھا۔ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے معاملات پر شرعی فیصلے ہُوا کرتے تھے۔ شرعی نظام کے لئے قاضی عدالتوں کا قیام اولیں شرط ہے۔ بلکہ قاضی عدالتیں عدل و انصاف کا بنیاد ہیں۔ اس لئے سنگھڑ میں نظام مملکت چلانے کیلئے قاضی مقرر تھے۔ یہ نظام نواب محمد مسوخان نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ نوتک قبیلہ کی شاخ دتانی میں سب سے پہلا قاضی عمرخان دتانی تھا۔

وراثت ۔ وراثت کا معاملہ خالص شرعی ہے بلوچوں میں صرف دو قبائل کو چھوڑ کر باقیوں نے اسے قبول کیا ہُوا تھا۔ وراثت کا نظام ریاست سنگھڑ میں باقاعدہ تھا۔ نتکانی

[1] ۔ تذکرہ سلیمان ص ۳۷۔

شرع محمدی کے دعویدار چلے آرہے ہیں اور وراثت کے بارے میں وہ پابند آرہے ہیں۔

وصیت۔ اولاد نرینہ میں وراثت کی تقسیم یکمہ برابر کی بنیاد پر ہوتی ہے اور یہی شریعت محمدیہ کا قانون ہے جبکہ لڑکی کو لڑکے کے حصہ کا نصف ملتا ہے پوتے کو چچاؤں کی موجودگی میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا ریاست سنگھڑ میں اگر اس بارہ میں کوئی وصیت موجود ہوتی تو اس پر عمل کرکے پوتے کا حق دلایا جاتا رہا۔[1]

ٹیک (محصول) چونکہ تنکانی قوم قبیلہ ایک خالص بلوچ قبیلہ تھا اس لئے اس میں وہ سب بلوچی رسوم پائی جاتی تھیں جو کسی بلوچ قبیلہ میں ہو سکتی ہیں تاہم اس قوم میں بعض نسبتاً زیادہ نمایاں ہے جسکی اصل وجہ اس قوم کی ملکی سیاست میں جلد آجانا تھا۔ بہر حال لالہ ہتورام لکھتے ہیں کہ سابق دور میں تنکانی سردار فی پہاڑ (ہر جانور) محصول لیا کرتے تھے اور جنسی بٹائی بغیر زر چہارم و پنجم و ششم رعایا سے وصول کرتے تھے زر پنجم کو پنجک اور زر ششم کو ششک کہا جاتا تھا ہنگامہ ہندوستان (جنگ آزادی) کے وقت خان محمد خان برادر غلام محمد خان نمبردار منگروٹھ گورنمنٹ انگریزی کا ملازم تھا اور سرکار انگریزی کی عملداری کے ابتدائی ایام میں اسے مذکورہ بالا طریق پر جنسی بٹائی اور فی بیٹھ پہاڑ چار روپے محصول لینے کے اختیارات حاصل رہے۔[2]

ہنر تش نیز بگو۔ نواب محمد اسد خان نے اپنے دورِ اقتدار میں بہت سے رفاہی کام کیئے تھے قصبہ سنگھڑ (بوہڑ) میں حسن قرأت اور حفظ قرآن کیلئے چار درس قائم کر دیئے تھے دو بستی غربی میں اور دو بستی شرقی میں جہاں سے سینکڑوں حفاظ اور قاری ہوئے اور دین کی خدمت کی، بوہڑ کے قاری آج بھی حسن قرأت میں اس طرح مشہور ہیں جسطرح پانی پت کے قاری برصغیر میں شہرت رکھتے ہیں۔ حافظ محمود سیال بیان کرتے ہیں کہ اسد خان نے ان کے بزرگوں کو دینی خدمت کیلئے جھنگ سے بلوایا تھا۔ علاوہ ازیں ملک کی ترقی اور آبپاشی کیلئے رود کوہی نالے کھدوائے جن میں رود بدھو قابل ذکر ہے کیونکہ اس رود پر علاقہ سنگھڑ کی نصف آبادی کا انحصار ہے۔

پہلی حکایت۔ میاں حسن علی ذکر کرتے ہیں میرے چھوٹے بھائی احمد علی نے ایک بیوہ عورت سے شادی کرلی تو منگروٹھ کے سکھ حاکم نے اسے گرفتار کرلیا میں اس وقت کھیت پر گیا ہوا تھا گھر واپس آیا تو اس واقعہ کی خبر ہوئی میں اس وقت خواجہ سلیمانؒ کے پاس چلا گیا اور ان سے گستاخانہ مخاطب ہوا اور کہا کہ میرے بھائی کو سکھ پکڑ کر منگروٹھ کو لے گئے ہیں مگر آپ نے اس کی رہائی کی کوشش نہیں کی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ قسم ہے مجھے تیرے بھائی کی اس گرفتاری کا علم نہیں ہے

[1] تاریخ بلوچیاں ص ۱۲۶، ۱۲۷۔ [2] گلبہار ص ۲۸۹۔

منشی داخل پاس بیٹھا تھا اس نے فوراً کہا یا حضرت آپ منگروٹھ کے سکھ حاکم کے نام میاں حسن علی کو رقعہ دیں تاکہ وہ اس کے بھائی کو رہا کردے خواجہ صاحب نے فرمایا " اے بے خرد آں کافر از ما چہ واسطہ دارد، کہ من او را بنویسم واو بر نوشتۂ من کے عمل خواہد کرد[1]۔ یعنی اے بیوقوف اس کافر کا ہمارے ساتھ کیا تعلق کہ میں اسے خط لکھوں اور وہ میرے اس لکھے پر کیسے عمل کرے گا؟

دوسری حکائیت: منگروٹھ کے سکھ ناظم چیتن مل نے ایک موقع پر خواجہ صاحب کا دنبہ پکڑوا لیا اور اسے ذبح کر کے کھا گیا برخوردار خان بلوچ نے آپ سے عرض کیا "غریب نواز" شاہ صاحب دین پناہ علیہ الرحمۃ کا ایک مرغا اس کے کسی مرید نے چوری کرکے کھا لیا تھا۔ مگر مرغا اس کے پیٹ میں بول اٹھا۔ اور وہ شخص سخت شرمندہ ہوا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ کا دنبہ حاکم وقت نے مار لیا ہے اور اسے کھا گیا لیکن کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے جواب میں فرمایا وہ نر تھے اور ہم خصی ہیں۔[2]

تیسری حکائیت: ایک موقع پر اسد خان کے آدمی سکھوں کا اونٹ پکڑ کر اندر پہاڑ لے گئے اس وقت اسد خان بھی اندر پہاڑ بیٹھا تھا۔ سکھ حاکم کرپا رام نے خواجہ صاحب کے پاس اپنا ایک آدمی بھیجا۔ جب وہ خواجہ صاحب کے پاس آیا تو آپ کھانا کھانے کیلئے گھر میں تشریف لے جا چکے تھے اور وہ سکھ سردار خواجہ صاحب کی چارپائی پر آکر بیٹھ گیا اور گالیاں بکنے لگا کہا کہ میاں صاحب کو بلاؤ کہ ہمارا ایک اونٹ چوری ہو گیا ہے واپس دلا دے یا پھر ایک سو روپیہ ہرجانہ ادا کرے آپ نے اس سے دو دِن کی مہلت مانگی اور اسد خان کے پاس آدمی بھیج کر اونٹ دلا دیا لیکن اونٹ کا پالان نہیں تھا سکھ سردار نے پالان کا مطالبہ کر دیا جو کسی ساربان سے لے کر اسے دے دیا گیا۔ اس موقع پر میاں محمد جعفر پسر حاجی صاحب موجود تھا اس نے کہا " سکھاں را خود آوردہ بودند ، خود کردہ را چہ علاج۔ اعمالکم عمالکم یعنی خواجہ صاحب سکھوں کو خود لائے تھے اپنے کیئے کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ سچ ہے

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۷۵ [2] تذکرہ سلیمان ص ۳۰۰۔ [3] مناقب المحبوبین ص ۲۲۷۔

تمہارے اعمال تمہارے عمال۔ خواجہ صاحب کی کرامت کے ذکر میں ایک حکایت بیان کی گئی ہے۔ "چوں اسدخان کمر خود بر ظلم بہ بست و مخلوق از ہر چہار طرف از جور او فریاد بر آوردند۔ حضرت صاحب او را فرمودند کہ اے اسدخان در حاجی تو مارا این قدر فائدہ است کہ بانگِ نماز می شنوم، ظلم مکن، و خلقِ خدا را مرنجان والا اینک فوج سکھاں را در ینجا می بینم۔ کہ درینجا دیرہ کردہ اند و اشارہ بسمت شمال تونسہ کردند۔ عبدالشکور صاحب می گفتند کہ بعد از چند ایام ما بچشم خود دیدیم کہ جائیکہ حضرت صاحب اشارت دست کردہ بودند ہمانجا فوج سکھاں آمدہ دیرہ کردہ بودند[1]

اسدخان نے جب ظلم پر کمر باندھ لی اور ہر طرف سے لوگ اس کے ظلم سے تنگ آگئے اور فریاد کی۔ خواجہ صاحب نے کہا اے اسدخان! تیری حکومت میں ہمیں صرف اس قدر فائدہ ہے کہ اذان کی آواز سن لیتے ہیں۔ ظلم سے باز آجا و خدا کی مخلوق کو رنج نہ پہنچاؤ، ورنہ صورتِ حال یہ ہے کہ میں سکھوں کی فوج کو یہاں پر دیکھ رہا ہوں اور اس نے قیام کر رکھا ہے اس وقت آپ نے تونسہ کے شمال میں اشارہ کیا۔ عبدالشکور صاحب کا بیان ہے کہ چند دنوں کے بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جس مقام کا آپ نے اشارہ کیا تھا، سکھوں کی فوج اسی جگہ پر آئی اور قیام کیا۔

غلام رسول صاحب مہر نے صوفی عنایت شاہ کی ایک بد دعا کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ اہل اللہ کی یہ شان نہیں کہ کسی فرد کے ناحق اقدام کی بناء پر ایسی بد دعا دیں کہ وہ اہل ملک کے نقصان و ضرر پر منتج ہو . . . . مندرجہ بالا دعا کا نتیجہ اس کے سوا کیا نکلا، کہ کلہوڑوں کی آگ بجھ گئی اور تالپوروں کے اقبال کا چراغ روشن ہوا . . . . . اور ایک اجنبی قوم سندھ پر مسلط ہو گئی[2]۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا یعنی مسلمانوں کی ریاست ختم ہوئی اور کافروں (سکھوں) کا راج قائم ہو گیا۔ الغرض ان چند حکایتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سنگھڑ کی مسلم بلوچ ریاست کے غیر مسلم سکھ حکومت نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہو گا

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۲۶ - [2] تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ ج ۶ ص ۲۹۶ -

نہ اٹھا اسد سا پھر جانباز بنی نوتک میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص[1]

نواب محمد اسد خان کی اولاد اور جانشین ۔ نواب محمد اسد خان کے پانچ لڑکے تھے سردار محمد عظیم خان، سردار ذوالفقار خان، سردار علی گوہر خان، سردار محمد رضا خان اور سردار علی اکبر خان۔ اسد خان کی گرفتاری کے بعد محمد عظیم خان خیرپور (سندھ) کے میر علی مراد خان کے پاس چلا گیا تھا۔ اس سے جاگیر بھی حاصل کی تھی مگر ہنگامہ ملتان کے بعد وہ سندھ کو چھوڑ کر منگروٹھہ (سنگھڑ) میں واپس آگیا۔ اور باقی چار بھائی بابا کے پاس بہاولپور میں رہ گئے تھے۔ سردار محمد عظیم خان نے غالباً جلد ہی ذات اور دستار سرداری حاجی محمد خان بن سردار لعل خان کو بندھوائی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں حاجی محمد مسو خان کا جب انتقال ہوا تو محمد مسو خان پسر سردار محمد عظیم خان کو قوم و قبیلے کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔

سردار علی گوہر خان اور محمد رضا خان ۔ نواب محمد اسد خان کے دوسرے لڑکے جیسا کہ کہا گیا ہے بہاول پور میں رہ گئے تھے اور وہاں پر مستقل سکونت رکھ لی سردار علی گوہر خان اور علی اکبر خان امیر بہاولپور کے پاس اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خان داؤد پوترہ اور نواب صادق محمد خان ثالث المتوفی ۱۸۶۱ء کے درمیان انتقال اقتدار کی غرض سے کچھ لڑائیاں ہوئیں جن میں سردار علی گوہر خان اور محمد رضا خان نے چار ہزار کے لشکر کی قیادت کی، اور چینی گوٹھ کی طرف پیشقدمی جاری رکھی۔ لیکن خفیہ طور سے وہ حاجی خان مذکور کے ساتھ تھے اور انہوں نے حاجی خان کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر وہ احمد پور شرقیہ میں داخل ہوا تو اس کے خلاف مدافعت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حاجی خان داؤد پوترہ جب خان پور کے معاملات طے کر کے چوہدری کی طرف بڑھا تو یہاں کے لوگوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا، اور احمد پور میں وہ داخل ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ حاجی خان کی اس کامیابی پر شہر میں چراغاں کیا گیا اور اُسے

[1] شاعر سے معذرت کے ساتھ جبکہ اصل شعر یوں ہے۔ نہ اٹھا پھر قیس سا جانباز بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص۔

فوجی روایات کے مطابق سلامی دی گئی اس موقع پر حاجی خان نے اپنے لئے فتح خان کا خطاب اختیار کیا۔[1]

حاجی خان موصوف نے جلد ہی وفات پائی اور اس کا بیٹا بہاول خان رابع جانشین ہوا ۱۸۶۵ء میں بہرام خان اور منددخان نے بہت سے داؤد پوتروں، کھوسوں اور مزاریوں سے مل کر بغاوت کردی۔ اور الہ آباد کے گرد و نواح میں لوٹ مار شروع کردی اور احمد پور شرقیہ پر حملہ کرنے کی تیاری کرلی، اس اثناء میں بہاول خان رابع وفات پا گیا اور اس کا لڑکا نواب صادق محمد خان رابع تخت نشین ہوا اس وقت باغی فوج چوہدی میں پہنچ چکی تھی۔ امیر بہاول پور نے اس بغاوت کو کچلنے کی خاطر سید چراغ شاہ کی ماتحتی میں ایک فوجی لشکر تیار کرکے بھیج دیا۔ اور اس کی کمک کو ایک اور لشکر روانہ کیا گیا۔ ابڑہ کے مقام پر سید صاحب اور باغی لشکر کے درمیان آٹھ گھنٹے تک لڑائی جاری رہی جس میں شاہ صاحب کو شکست ہوئی۔ اب نواب صاحب نے سردار علی گوہر خان کو چھ توپیں، ایک توپخانہ جو چار سو آدمیوں پر مشتمل تھا اور پیدل فوج دے کر باغیوں کے خلاف بھیج دیا ۱۳ اگست ۱۸۶۶ء کو فریقین میں جنی گوٹھ کے پاس معرکہ آرائی ہوئی۔ اگرچہ غنیم کی فوج کثیر تھی مگر میدان میں وہ نہ ٹھہر سکی اور فاش شکست کھائی اور علی گوہر خان کامیاب و کامران ہو کر واپس لوٹ آیا۔

الغرض سردار علی گوہر خان اور محمد رضا خان کی ان فوجی خدمات سے خوش ہو کر نواب صادق محمد خان رابع نے قلمدان وزارت ان کے سپرد کر دیئے۔ علی گوہر خان کو وزیر مال اور علی اکبر خان کو وزیر مالی دار بنا دیا گیا۔ سردار علی گوہر خان سے حاجی محمد مسو خان کی ہمشیرہ بیاہی ہوئی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو سردار محمد رضا خان کے لڑکے محمد خان سے بیاہی گئی تھی اس بی بی سے محمد خان کے چار لڑکے ہوئے جن میں سے سردار محمد رضا خان ثانی بہاولپور میں رہتا ہے۔ اور سردار علی اکبر خان کے بھی چار لڑکے تھے ان میں سے بڑا لڑکا احمد خان منگروٹھ میں واپس آگیا تھا جس نے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی اور اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی تھی، اس کے باقی تین بھائی احمد پور شرقیہ

[1] دیارت بہاول پور گزیٹیر ص ۸۴، ۹۴۔

میں رہ گئے۔ احمد خان کے بھائی یار محمد خان کی اولاد میں میری ملاقات منظور حسین خان سے ہوئی تھی۔ عمر رسیدہ اور جہاندیدہ ہونے کے باوجود وہ بول چال اور اخلاق سے گرا ہوا آدمی ہے جس سے ملاقات کر کے مجھے سخت ندامت ہوئی تھی۔ یہ ملاقات مئی ۱۹۸۲ء میں علی گوہر خان کے ڈیرہ پر احمد پور شرقیہ میں ہوئی تھی۔ بعض آدمیوں نے مجھے بتایا کہ احمد پور کے نتکانی خاندانوں میں عبدالغفور خان اول کا لڑکا حق نواز خان اور پوتا امیر عالم خان اچھے اور با اخلاق شخص ہیں۔ مقامی طور پر اثر و رسوخ بھی اچھا رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ منظور حسین خان کے بعد میرے ضمیر نے مجھے کسی دوسرے نتکانی فرد سے ملاقات کی اجازت نہیں دی اور میں پچھلے پاؤں ڈیرہ غازی خان کو واپس لوٹ آیا۔ مئی کا مہینہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ اور منظور حسین خان کا اخلاق سے گرا ہوا رویہ تادمِ تحریر میرے دل سے محو نہیں ہوا ہے۔ احمد خان کے دوسرے دو بھائی عبدالغفور خان اور یار محمد خان نواب بہاول پور کے وزیر حضوری تھے۔ سردار محمد رضا خان کی اولاد میں محمد مسو خان، علی اکبر خان اور محمد رضا خان بہاولپور میں رہتے ہیں اور اللہ بچایا خان اور دوست محمد خان احمد پور شرقیہ میں آباد ہیں۔ سردار اللہ بچایا خان کے متعلق نور احمد خان فریدی اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں۔ سردار ذوالفقار خان کی اولاد میں زاہد حسین خان احمد پور شرقیہ میں اور فضل احمد خان کوٹ ڈیجی علاقہ خیرپور میرس میں رہتا ہے۔

سردار ذوالفقار خان کا ایک پوتا غلام حسین خان ولد گل محمد خان تھا، جو لاولد فوت ہوا ہے۔ اس کے پاس مصور کی بنی ہوئی نواب محمد اسد خان کی ایک تصویر موجود تھی۔ اس تصویر میں نواب صاحب کا کھلا اور چوڑا چہرہ دکھایا گیا تھا۔ چہرے پر گھنی اور لمبی داڑھی تھی۔ زلفیں کندھوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں موٹی اور چہرہ ابھرا ہوا اور نمایاں تھا۔ جس سے ان کا رعب اور دبدبہ ٹپکتا تھا۔ بدن پر زرہ پہن رکھی تھی یہ تصویر غلام حسین خان نے اپنے باغ میں لگا رکھی تھی۔ بعض آدمی اس سے یہ تصویر مانگتے رہے مگر اس نے کسی کو نہ دی وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بالآخر اس سے

وہ تصویر چوری ہوگئی۔ مرحوم کا خیال تھا کہ جس نے اس سے تصویر کا زیادہ مطالبہ کیا تھا اس نے چرائی ہوگی۔ چنانچہ اسے وہ اپنی زندگی میں دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔ غلام حسین خان سے زیادہ افسوس مصنف کتاب ہذا کو ہے کہ عرصہ دراز تک اس تصویر کے کھوج میں لگا رہا۔ کہ اگر وہ کسی صورت مل جائے تو زیر نظر کتاب کے صفحہ اول پر لگا کر اسے جامع اور مکمل بنایا جا سکے اور کتاب کے انتساب کی غرض و غایت نہ صرف پوری ہو بلکہ اس میں یک گونہ اضافہ ہو مگر یہ کمی برابر محسوس کی جا رہی ہے۔

سردار محمد مسو خان یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حاجی محمد مسو خان کے بعد محمد مسو خان بن سردار محمد عظیم خان قوم و قبیلے کا سردار ہوا۔ وہ پولیس انسپکٹر کے عہدہ پر ملازم تھا۔ پراونشل درباری اور کرسی نشین بھی بنایا گیا تھا۔ اس نے ۱۸۷۰ء میں پولیس کی ملازمت اختیار کی تھی اور ۱۸۹۶ء میں وفات پائی اور تاحیات گورنمنٹ سے پنشن لیتا رہا۔

سردار محمد خان۔ سردار محمد مسو خان کے بعد اس کا بڑا لڑکا محمد خان اپنے قبیلے کا سردار مانا گیا تھا اور پراونشل درباری بنایا گیا اور کرسی نشین تھا۔ والد کی وفات کے بعد حق پنشن اسے منتقل ہوگیا تھا اور اپنی عمر کے آخری دور تک برابر پنشن لیتا رہا۔ مگر وہ اپنے آخری ایام زندگی میں دماغی توازن کھو بیٹھا تھا اور مکمل طور سے دیوانہ ہوگیا۔ اپنی موت تک وہ اسی حالت میں رہا اور ایک کمرہ میں بند زنجیروں سے جکڑا رہا۔ تا آنکہ ۱۹۳۰ء میں اس نے اسی حالت میں اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کر دی۔

سردار امام بخش خان۔ سردار محمد خان کا دوسرا بھائی امام بخش خان تھا وہ اپنے بھائی کے ایامِ دیوانگی میں نوتک قبیلے کا سردار تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ شخص بھی کرسی نشین ہوا اور پراونشل درباری رہا۔ وہ بلوچ لیوی میں صوبیدار کے عہدہ پر ملازم رہا۔ مگر یہ ملازمت چھوڑ دی اور زمیندارہ شغل اختیار کر لیا تھا۔ گورنمنٹ انگریزی نے حق پنشن سردار امام بخش خان کی طرف منتقل کر دیا تھا

اور وہ تاحیات، اسے لیتا رہا۔ سردار امام بخش خان کا لڑکا محمد مسو خان ہوا، وہ اچھا اور با اخلاق شخص بیان کیا جاتا ہے اور مور جھنگی میں رہتا تھا زمیندارہ کاروبار کرتا رہا گزشتہ سال اس کا انتقال ہوا ہے۔

سردار محمد خان کا تیسرا بھائی فیض اللہ خان جین حیات ہے مور جھنگی میں رہتا ہے زمیندارہ شغل رکھتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس نے صراط مستقیم کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر رکھی ہے اور وہ احمدی مرزائی ہے۔ اس کے لئے اس قدر لکھ دینا کافی ہے

ترسم کہ نہ رسی بہ کعبہ ای اعرابی
کیں راہ کہ توی روی بہ ترکستان است

سردار محمد عبد العظیم خان - محمد عبد العظیم خان، سردار محمد خان کا اکلوتا بیٹا تھا سردار محمد عبد العظیم خان کے حالات نہایت تلخ دور میں گزرے ہیں۔ باپ کی دیوانگی اور چچاؤں کی سرپرستی سے وہ خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ خود بھی ایک تلوّن مزاج رکھتا تھا کئی مسلک تبدیل کیئے اور زندگی کے ہر موڑ پر اسے مشکلات کا سامنا رہا ابتدا میں اسکے مزاج میں اباپن غالب رہا۔ جس کے باعث وہ شہر بدر اور گاہے ضلع بدر ہوتا رہا۔ گویا کہ یہ دور اس خاندان میں ادبار کا دور رہا۔ اور رفتہ رفتہ انحطاط پذیر رہا جو دور حاضر پر آکر منتج ہوا۔

سردار محمد عبد العظیم خان ذاتی طور پر ایک قابل شخص تھا علوم متداولہ پر اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کی تحریر اور خط و کتابت مغلوں کے فارسی دور کی یاد کو تازہ کر دیتی ہے علم تفسیر و حدیث پر اسے اچھی دسترس تھی یہ خدا داد لیاقت اور قابلیت اس کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ وہ ایام طفولیت میں ان چیزوں کو حاصل نہ کر سکا گویا کہ یہ خدا کی دین تھی" این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔"
سردار محمد عبد العظیم خان سے میری ملاقات چند بار رہی، مگر یہ ان کی زندگی کے آخری پہر تھے۔ وہ حُسنِ خلق کا پیکر مروّت اور مودّت کا مجسمہ تھا، سردار صاحب کے حسنِ اخلاق حلم اور بردباری کے قصّے زبان زدِ خلائق ہیں جن کا بیان یقیناً طولِ کلام ہوگا۔

سردار محمد عبدالعظیم خان کی شخصیت جہاں حسن و جمال کی تصویر تھی وہاں اس کے ملیح چہرہ سے ہیبت اور عظمت ٹپکتی تھی۔ چہرہ لمبوترا مگر کھلا تھا آنکھیں آہوئے ختن سے ملتی جلتی تھیں۔ جسم سڈول اور قد لمبا مگر مناسب حد تک تھا، چال میں متانت تھی ان کے پاس سے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے واقف کار ہیں۔ اس وقت کسی قسم کی اجنبیت اور بوریت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ علامہ اقبال سے انہیں بڑی عقیدت مندی تھی اور ان سے ہمنشینی کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ سردار محمد عبدالعظیم خان کی علامہ موصوف سے خط و کتابت بھی رہی۔ اور علامہ صاحب کے چند خطوط وہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔

سردار صاحب نے علامہ اقبال کے مشورہ سے اپنی آبائی لائبریری کی نادر کتب انجمن حمایت اسلام لاہور کے سپرد کر دی تھیں۔ یہ سب بجا مگر یہ شخص اپنے بزرگوں کے حالات سے بالکل نابلد تھا۔ اور یہی بے ذوقی آپ کی اولاد میں پائی جاتی ہے۔ آپ کو شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا اور طبیعت اس طرف مائل تھی۔ چنانچہ آپ کے مذاق سخن کا اندازہ اس نظم سے لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تیرے در کا ہوں بندہ تو میرا پروردگار
ہے تیرے در کی غلامی باعث صد افتخار
تجھ سا آقا مل نہیں سکتا مجھے دارین میں
مجھ سے بہتر تو تجھے مل سکتے ہیں لاکھوں ہزار
معاف کر میرے گناہ کل ہوں کبیر و یا صغیر
ہے گناہوں سے میری توبہ میری توبہ ہزار
معاف کر دی حضرت یوسف نے بھائیوں کی خطا
گو خطا وہ تھی نہ قابل مغفرت کے زینہار
جو صفت عفو خطا ظاہر مخلصین سے
وہ صفت پھر کیوں نہ ہو خالق سے خود ہی آشکار

معاف کر میری خطائیں جو تجھے معلوم ہیں
ہے تجھے زیبا خطا بخشی ہے تو غافر غفار
تو نہ بخشے گر گناہوں کو تو پھر بخشے گا کون ؟
ذات تیری کے سوا کوئی نہیں آمرزگار
ہے[1] اسدی در پہ حافر ناصیہ فرسا غلام
معاف کر اس کو کہ ہے فرط گناہ سے شرمسار

سردار محمد عبدالعظیم خان سے جب ایک خط کے ذریعے کہا گیا کہ وہ اپنے دادا نواب محمد اسد خان کی قبر کا نشان دوبارہ قائم کریں جو اس وقت رود کوہی کے پانی کا مٹ آجانے سے مٹ گیا ہے۔ تو آپ نے اس کے جواب میں لکھا۔

"کل من علیہا فان"

سردار صاحب موصوف نے عرصہ دو سال ہوئے وفات پائی ہے۔ لیکن اس کے لڑکوں میں اس وقت تک کسی کی دستار بندی نہیں کرائی گئی۔ ان کا بڑا لڑکا اللہ نواز خان ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔ اس سے خط و کتابت کر کے جب پوچھا گیا کہ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد خاندانی رسم و رواج کے مطابق دستار بندی کیوں نہیں ہوئے۔ تو جواب میں انہوں نے لکھا۔ "رہا دستار بندی کا معاملہ تو یہ اتنا اہم نہیں، وہ قبائلی نظام تو کب کا ختم ہو چکا ہے۔ جس میں اپنی قوم کی طرف سے اپنے سردار پیر اور سردار کی طرف سے قوم پر کچھ ذمہ داریاں عائد تھیں۔ اب یہ رسم محض رسم کی صورت میں موجود ہے جس کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے"[2]

سردار محمد عبدالعظیم خان کے چار فرزند ہیں سردار اللہ نواز خان، مشتاق حسین خان الطاف حسین خان اور عبدالحفیظ خان۔ اول الذکر لاہور میں آباد ہے۔ جبکہ باقی تین بھائی منٹگمری میں رہتے ہیں ثانی الذکر بلوچ لیوی سے دفعدار ریٹائر ہے الطاف حسین خان یونین کونسل مورچھنگی کا چیئرمین ہے اور سابق ڈسٹرکٹ کونسلر بھی ہے۔ جبکہ عبدالحفیظ خان ڈسٹرکٹ کونسل کا رکن ہے زیادہ تر شغل زمینداری رکھتے ہیں

[1] نواب محمد اسد خان کی اولاد اسدی مشہور ہے [2] مکتوب موصوف محررہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۲ء

یہاں پر صرف یہ اشعار لکھ دینا ہی مناسب ہے۔

آں عزمِ بلند آور   آں سوزِ جگر آور
لہ شمشیرِ پدر خواہی   بازوئے پدر آور

حاجی محمد مسو خان ۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ نواب لعل خان بن نواب محمد مسو خان نتکانی کے دو لڑکے محمد خان اور حاجی محمد مسو خان تھے لیکن موضع کیچی تیانی تحصیل جام پور کے ریکارڈ محکمہ مال بندوبست قانونی ۱۸۷۲ء میں ایک تیسرے لڑکے فتح محمد خان کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کی اولاد کا بہرحال پتہ نہیں چل سکا ہے اور سردار امام بخش خان جن کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے۔ اس کے ملازمت سے مستعفی ہو جانے کے بعد غلام رسول خان قرائی نے لکھا کہ اب اس خاندان میں کوئی اور نامی شخص نام لیوا نہیں رہا اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ قبیلہ نوتک میں اب کوئی مسلمہ سردار نہیں ہے۔ تاہم بیان یہ ہے کہ محمد مسو خان اسد خان کا چچا زاد بھائی سنگھڑ تحصیل میں ایک با اثر شخص تھا اس نے اپنے خرچ پر مسو واہ کھدوایا تھا جو بعد میں گورنمنٹ نے خرید کر لیا۔ ۱۸۸۲ء میں لاولد فوت ہوا تھا۔ اس قبیلہ کی جمعیت اپنی اپنی شاخ پر مشتمل مقدمین پر قائم ہے ان مقدمین میں اس وقت سردار خان تنگوانی اور امام بخش خان ملغانی با اثر اور قابل ذکر مقدم ہیں۔

The Nutkanis are an important tribe and are organised into sections under Mukaddams, but they have now no chief. Haji Mohammad Massu Khan, Cousin of Asad Khan, was a man of influence in the Sangarh Tehsil, where he excavated The Massuwah canal at his own expenses, subsequently selling it to Government on finding himself unable to manage it

لہ ۔ یہاں پر پدر سے مراد اسد خان کی ذات ہے (نتکانی) ۲ہ ۔ تاریخ بلوچاں ص ۴۸ ۔

successfully. He died childless in A.D. 1882.

The more important Mukaddams of the Nutkanis tribe are Sardar Khan, Tangwani of Hairo, and Imam Bakhsh Khan, Maghlani, of Sokar. (ڈسٹرکٹ گزیٹیر ڈیرہ غازیخان ص ۶۶ ۔)

الغرض جب "صاحب لوگ" یہاں پر آئے اور ڈیرہ جات کو فتح کر لیا اور ہڑند کا قلعہ فتح کرنا باقی تھا اور ارادہ کیا کہ ہڑند کو بھی فتح کر لیا جائے مگر دوسری طرف ملتان کے حالات مخدوش تھے۔ چنانچہ مسٹر ایڈورڈس نے ہڑند کی فتح سے قبل ملتان کے محاذ پر پہنچنا ضروری سمجھا اور حاجی محمد مسو خان کے بڑے بھائی سردار محمد خان کو ہڑند کے سکھ قلعدار سے مذاکرات کیلئے ایلچی بنا کر بھیجا۔ محمد خان اس وقت سکھوں کی فوج میں ملازم تھا۔ سکھوں کو غلط فہمی ہوئی کہ محمد خان انگریزوں سے مل گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ ہڑند میں جاکر قلعدار سے ملا تو اس نے آپ کو مروا ڈالا۔ سردار محمد خان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اور وہ لاولد ہو کر مرا تھا۔

نواب محمد اسد خان کے بعد بہرحال حاجی محمد مسو خان کو قوم و قبیلے کی سربراہی کا شرف حاصل ہوا تھا اور اس پر پوری قوم متحد و متفق تھی۔ حاجی مسو خان اول سرکار انگریزی کا ملازم ہوا تھا۔ اور تحصیلدار رہا۔ وہ انگریزوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی مقام لیہ پر انگریزوں کے ساتھ تھا اور ملتان کے ہنگامہ میں بھی انہیں کا ساتھ دیا تھا۔ تحصیلداری کا عہدہ چھوڑ کر بعد میں اس نے زمیندارہ شغل اختیار کر لیا۔ اس کی زمینداری ضلع بھر میں موجود چلی آئی۔ جو چند سال قبل اس کے وارثان نے فروخت کر دی ہے۔ حاجی مسو خان کا شمار ضلع کے بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا اور ضلع پر اس کا بڑا اثر و رسوخ رہا۔ وہ نہایت سخی، مہمان نواز، حق گو اور دیندار سردار تھا پختہ عزم اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ اس نے ۱۸۶۱ء میں مسو واہ نام کا ایک نالہ کھدوایا تھا۔ جو ترپن ہزار روپے کی لاگت سے کھودا گیا تھا۔ جسے بعد میں وقت کی گورنمنٹ نے خرید لیا حاجی صاحب کو پچیس ۲۵ ہزار روپے نقد اور باقی رقم کے بدلے مالی اور مو رجنگی کی رکھو کہ معافی کر

طور پر دی گئیں۔

۱۸۷۰ء میں آپ نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا ۱۸۸۲ء میں آپ نے دربار کوٹ مٹھن میں ایک نفیس اور خوبصورت مسجد تعمیر کرائی اور وضو کرنے کی غرض سے پختہ تالاب بنوا دیا تھا۔ جو وہاں پر بدستور موجود اور باقی ہیں مسجد کے دروازہ پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

محمد مسو خان حاجی حرم — بنا کرد این مسجد از صدق دم

الٰہی برآور مرادات او — مضاعف بکن جملہ حسنات او

خرد گفت تاریخ ختمش نویس

زہی مسجدی فرخ دلبس نفیس

یوں بھی آپ کو مسجدیں بنوانے کا شوق تھا۔ آپ نے ایک مسجد دائرہ دین پناہ (غربی) کے مزار پر بنوائی تھی۔ یہ مسجد بھی اپنے فن تعمیر کا آپ نمونہ تھی اور اس پر بھی آپ کے نام کا کتبہ درج بتایا جاتا ہے۔ ایک اور مسجد آپ نے منگروٹھ غربی میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد آپ کے نیدو کھیت) جٹ والہ پر واقع ہے۔ یہ مسجد بھی خوبصورت اور عظیم مسجد تھی۔ آپ کے بعد یہ مسجد ویران ہو گئی اور بوسیدہ ہو کر اس کا ملبہ ڈھیر ہو گیا۔ شیخ غلام مصطفیٰ اور حاجی غلام حسن شیخ حیبانی نے مل کر دوبارہ تعمیر کرا دی تھی۔ جو تا ہنوز آباد ہے اس مسجد کی دوبارہ تعمیر ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں ہوئی۔ مسجد کا زیادہ تر سامان اسی قدیم دور کا ہے۔ جس پر نقاشی اور نفاست کا اعلیٰ پایہ کا کام کیا گیا ہے اور اسے دیکھ کر رشک پیدا ہوتا ہے اب یہ مسجد شیخنیں والی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ نواب محمد مسو خان نے کھوسہ سردار برخوردار خان کو اس کی کسی فوجی خدمت کے عوض میں علاقہ ملی مہوئی کی جاگیر دے دی تھی اور اپنی پوتی کا رشتہ بھی اس کے لڑکے کوڑا خان سے کر دیا تھا۔ لیکن نواب محمد مسو خان کے بیٹے لعل خان نے کھوسہ قبیلہ کو یہاں سے بیدخل کر کے سنگھڑ سے خارج کر دیا تھا۔ اور اس جاگیر پر خود قابض ہو گیا۔ اب اس کے لڑکے حاجی محمد مسو خان نے وہ جاگیر کھوسوں کو بلا کر انہیں واپس کر دی اور یہاں پر دوبارہ آباد کیا۔ یہ قبیلہ بدستور علاقہ ملی مہوئی میں آباد چلا آتا ہے۔

بہر کیف حاجی محمد مسو خان نے ۱۸۸۲ء میں وفات پائی اور احاطہ دربار کوٹ مٹھن میں دفن ہوئے غالباً یہ آپ کی وصیت تھی۔ آپ کی قبر کا تعویذ سفید سنگ مرمر کا ہے اور مسجد کے صحن کے جنوبی جانب احاطہ سے باہر درخت جال (پیلو) کے نیچے آپ کی قبر ہے اور اس پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

"وفات حاجی محمد مسو خان تنکانی مرحوم و مغفور رئیس ڈیرہ غازیخان۔ بتاریخ چاردہم ماہ ذوالحج ۱۲۹۹ھ۔"

حاجی محمد مسو خان کے متعلق لالہ حکم چند کے یہ تاثرات ہیں۔ کہ حاجی محمد مسو خان تنکانی ذی رتبہ کرسی نشین ہے۔ یہ شخص بڑا دانا، متدین، راست گو، منصف مزاج اور نیک چلن مشہور ہے۔[1]

حاجی محمد مسو خان ۱۸۷۶ء میں سنڈیمن صاحب کے ساتھ ریاست قلات کے امن مشن پر گیا تھا۔ آپ کا نام گورنر جنرل ہند کے دربار میں درج تھا اور آپ ڈویژنل درباری اور کرسی نشین تھے۔ آپ کو سرکار انگریزی کی طرف سے پنشن بھی ملتی تھی۔

الغرض حاجی محمد مسو خان کا کوئی لڑکا نہیں تھا صرف ایک لڑکی تھی جو نواب محمد اسد خان کے لڑکے غالباً علی اکبر خان سے بیاہی گئی تھی اور حاجی صاحب نے اپنی جملہ جائیداد کا وارث ایک وصیت نامہ لکھ کر علی اکبر خان کو بنا دیا تھا۔ چند سال ہوئے کہ علی اکبر خان کے ورثاء نے اس تمام جائیداد کا کھوج لگا کر اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب غالباً ضلع ڈیرہ غازیخان میں حاجی محمد مسو خان کی کسی قسم کی جائیداد باقی نہیں رہی ہے۔

---

[1] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۸۵۔

نتکانی خانوادے

یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ میر عالی نوتک خان کے پندرہ لڑکے تھے اور ہر لڑکے کے نام سے ایک ایک علیحدہ خاندان وجود میں آگیا - اور ہر ایک لڑکے کے نام سے مشہور ہوا اب تک صرف ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے - جو ان خاندانوں میں صاحب اختیار و اقتدار رہے ہیں اب اس قبیلہ کی ہر شاخ اور پھلی کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے - تاہم یہاں پر بھی ان خاندانوں کا ذکر پہلے کیا جا رہا ہے - جنہیں کچھ زیادہ تاریخی اور سیاسی حیثیت حاصل رہی ہے - اور کسی چھوٹے یا بڑے لڑکے کی اولاد ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جا رہا ہے -

ملغانی - ملغانی خاندان کا تعلق میر عالی نوتک خان کے بڑے لڑکے سے ہے اور یہ اسی کی نسبت سے ملغانی کہلاتا ہے - اور اس خاندان کا مرکزی قصبہ سوکڑ ہے - قصبہ سوکڑ کے متعلق لالہ ہتو رام لکھتے ہیں کہ مسمی ملغ خان پسر نوتک خان مورث کلاں قوم نتکانی بروز تین سو برس کے اس موضع کو آباد کیا[۱]۔ چونکہ یہ علاقہ خشک اور بے آب و گیاہ تھا اور یہاں کی فصل پکنے سے قبل ہی سوکھ جاتی تھی - ایسی فصل جو وقت سے پہلے سوکھ جائے اور اس کے پکنے کی نوبت نہ آئے ہماری زبان میں اسے سوک اور "سوکڑا" کہتے ہیں چنانچہ اس آبادی اور موضع کا نام اسی وجہ سے سوکڑ مشہور ہو گیا -

نوتک قبیلہ جب اندرِ پہاڑ محاذ سنگھڑ میں رہتا تھا تو ملغانی خاندان درہ چٹ پانی کے راستے سے پہاڑ سے باہر نکل کر یہاں آکر آباد ہوا تھا - خود ملغ خان اندر پہاڑ فوت ہو کر تھلہ توخ میں دفن ہوا جہاں پر اس کی غیر معمولی لمبی قبر موجود ہے اور اس قبیلہ کے بعض لوگ بھی اندر پہاڑ آباد ہیں اس خاندان کی بڑی شاخیں چار ہیں - لعلوانی، دادوانی، پیردوانی - اور شیرانی -

سردار امام بخش خان - سردار امام بخش خان، ملغانی کی شاخ پیردوانی سے ہے - حاجی محمد مسو خان کی وفات کے بعد قبیلہ نوتک کی سرداری کے بارہ میں اختلاف

رائے پیدا ہو گیا تھا - اس قبیلہ کی ایک اور شاخ تنگوانی کا سربراہ سردار خان تھا وہ چاہتا تھا کہ نوتک قوم کی سیادت و قیادت اسے حاصل ہو - جبکہ امام بخش خان ملغانی کا دعویٰ تھا کہ نوتک قبیلہ میں وہ سب سے بڑے اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس منصب کا وہ مستحق ہے چنانچہ اس قسم کا چکر چلا اور طرفین سے زور آزمائی ہوئی جس کے نتیجہ میں قوم پارہ پارہ ہو گئی اور کوئی بھی اس کا مسلمہ سردار نہ ہو سکا[۲]۔ الغرض سردار امام بخش خان کو یک گونہ سیاسی پوزیشن پہلے حاصل تھی کہ وہ اس قبیلے کا سردار اور ایک با اثر مقدم مانا جاتا تھا اور پھر وہ ذیلدار بنا دیا گیا - سردار امام بخش خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جرأت و ہمت کا پیکر اور نڈر قسم کا سردار تھا - وہ اچھا اثر و رسوخ رکھتا تھا، مشکل کے وقت وہ نوتک قبیلہ کی ہر شاخ کی مدد کیلئے ہر وقت تیار رہتا تھا - قیصرانی سردار نے کورو کے موضع میں کسی رود کوہی نالہ پر قبضہ کرنا چاہا تو سردار امام بخش خان نے اس کی ہر طرح سے مزاحمت کی، اور قیصرانی سردار کو رود سنگھڑ پر قبضہ کرنے سے زبردستی روک دیا تھا - تاہم قیصرانی سردار کا کورو کی تین رودکوہیوں میں سے ایک پر برابر قبضہ قائم رہا - جو بدستور ان کے قبضہ میں چلی آتی ہے -

اسی ملغانی خاندان کے ایک شخص سردار خان نے ہنگامہ ملتان میں انگریزوں کی طرف سے حصہ لیا تھا اور سکھوں کے خلاف لڑا تھا -

سردار محمد اسلم خان - سردار محمد اسلم خان کے سر میں سرداری کا سودا اپنے باپ سے وراثت کی صورت میں سمایا ہوا تھا اور وہ جب تک زندہ رہا اسی ہجوم اور چکر میں رہا کہ ہندو، مسلم، بلوچ اور غیر بلوچ سب اسے اپنا سردار تسلیم کریں - اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر کوئی بھی سردار نہیں بنے - یہی نتیجہ اس کی پوری زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے اگرچہ اسے باپ کی جگہ ذیلدار اور قوم و قبیلے کا مقدم بنایا گیا تھا - میں اسلم خان کے بیٹے سردار محمد اجمل خان سے ملا اور اس کے باپ کے حالات معلوم کیے - چونکہ وہ دوسروں کی نسبت باپ کے متعلق بہتر جان سکتے ہیں - میں نے انہیں کے بیانات پر اکتفا کیا ہے چنانچہ وہی بیان انہوں نے ہفت روزہ بلال ڈیرہ غازیخان میں چھپوا دیئے تھے -

ہیں نے " شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ " کو ترجیح دی اور سردار محمد اجمل خان کے اس مقالہ سے اِستفادہ کیا۔ اور اِقتباس لئے جو قوسین میں موقع بہ موقع درج ہیں۔

اس مقالہ میں بنیادی طور پر بو بات کہی گئی ہے وہ ہندوؤں کے خلاف سردار محمد اسلم خان کا مقاطعہ ہے۔ جس نے بعد میں ایک بہت بڑی شورش، ہنگامہ اور بدامنی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کے باعث سردار صاحب کو اول ضلع بدر اور پھر ملک چھوڑ کر دیس نکالا ہونا پڑا۔ جو لوگ اِن اصل واقعات سے خواہ عمداً یا لاشعوری طور سے چشم پوشی کرتے ہیں یا حقائق پر ان کی نظر نہیں پڑتی وہ سردار محمد اسلم خان کو دیوان مولراج کا حریت پسند سردار سمجھتے ہیں۔ اور ڈیرہ غازیخان سے انگریزوں کے خلاف بیسویں صدی عیسوی کا حریت پسند اور دوسری جنگ آزادی کا بانی اور ہیرو قرار دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ ایک طرف تو اسلم خان نے ہندوؤں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا اور ان کا مقاطعہ کر دیا یہ بات صرف سوکڑ کے ہندو محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ضلع بھر کے ہندوؤں نے اسے محسوس کیا ہوگا۔ اور اگر اِسے وسیع پیمانہ پر دیکھا جائے تو نہ صرف پنجاب کے ہندوؤں نے ایک سازش تصور کی ہوگی بلکہ پورا برصغیر اس سے متأثر ہوا ہوگا۔

بہرحال سردار صاحب نے دوسری طرف ضلع بھر کے نہ صرف تمنداروں کو بلکہ بلوچوں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ تمنداروں کے خلاف انہوں نے اخبارات اور رسائل میں مضامین دیئے اور ایڈیٹوریل لکھے تھے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک شخص انگریز صاحب لوگ کے خلاف تحریک آزادی چلانا چاہتا ہے وہ ایک مقامی قوم ہندو سے قطع تعلق کر کے اسے اپنا مخالف بنا لیتا ہے۔ پھر ان بولیشی لوگوں کے خلاف ہو جاتا ہے جن کے ہاتھ میں ضلع بھر کی سیاست اور عوام کی قیادت ہے۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو کیا وہ شخص بدیسیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کر سکتا ہے؟

الغرض سردار محمد اسلم خان ۱۸۷۵ء میں قصبہ سوکڑ میں پیدا ہوا۔ آپ کے

خاندان کا تعلق بلغ خان کے پسر دوم پیر بخش خان سے تھا۔ جس کی اولاد پیروانی کہلاتی ہے۔ سردار محمد اسلم خان نے باپ کی وفات کے بعد مسلمانوں بالخصوص بلوچوں اور زمینداروں کی اِصلاح اور ترقی کیلئے عملی قدم اٹھایا" اور ہندو مہاجنوں کے قرضوں سے بچانے کیلئے مسلمانوں کیلئے قصبہ سوکڑ میں انجمن امداد باہمی اور زمیندارہ بنک قائم کیئے"۔

ہندوؤں کے خلاف عدم تعاون اور سوشل بائیکاٹ کی تحریک چلائی گئی۔ کہ کوئی مسلمان ان سے سودا سلف خرید نہ کرے۔ ان کے مال مویشی اجرت پر خواہ بلا معاوضہ نہ چرایا کرے اور ان کی مزارعت اور ہر قسم کی دوسری نوکری کرنا چھوڑ دے۔ اس تحریک کو کامیاب کرنے کی غرض سے قصبہ سوکڑ میں مسلمانوں کی دکانیں کھولی گئیں ہندو مہاجنوں نے جب اپنا اِس طرح ناطقہ بند ہوتے دیکھا تو انہوں نے ضلعی انتظامیہ سے مداخلت کی اپیل کی، جس کے لئے اس وقت ڈپٹی کمشنر لوئیس صاحب سوکڑ میں آئے۔ سردار محمد اسلم خان اور دوسرے زمینداروں سے ملاقات کی اور حالات کا جائزہ لیا، اس موقع پر سردار صاحب نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ، قانون مسلمانوں کو ان کے کاروبار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا"۔ چونکہ انگریز ڈپٹی کمشنر دانا اور شریف انسان تھا اس نے عقلمندی اور سیاستدانی ریاست سے دوسرا پہلو اختیار کیا پھر کسر نفسی سے۔ . . . کام لیتے ہوئے فرمایا کہ سردار صاحب ہندوؤں پر نہیں ان کے مال مویشی پر رحم کریں اور ترس کھائیں۔

سردار اجمل خان نے بیان کیا جب اس (ڈپٹی کمشنر) نے اخلاقی بلندی اور تواضع کا ثبوت دیا تو اسلم خان نے کہا ہم آپ کی شرافت اور بلند اخلاقی کی قدر کرتے ہوئے بائیکاٹ ترک کرتے ہیں اور رواداری کا ثبوت دیتے ہیں لیکن آپ ان (ہندوؤں) کو سمجھائیں کہ وہ اپنی اخلاقی پستی ترک کر کے نیازمندانہ طرز عمل اور نیک روش اختیار کریں (سردار صاحب کا یہ جملہ بھی ملاحظہ ہو) چنانچہ ہندوؤں نے صاحب بہادر کے سامنے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اسلم خان کو اپنا سردار تسلیم

۷۳۔ انگریز ڈپٹی کمشنر کی شرافت اور اخلاقی بلندی۔ ملاحظہ ہو پھر یہ تحریک کس کے خلاف تھی؟

کریں گے اور مسلمانوں کا احترام کریں گے۔

اس کے بعد اسلم خان امرتسر چلا گیا اور وہاں سے ایک ہفت روزہ اخبار "المعین" جاری کیا جس میں ملک کے سیاسی، اصلاحی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے سردار اجمل خان کے بیان کے مطابق اس اخبار کے ایڈیٹوریل زیادہ تر اجتماعی ہوتے تھے جن میں ضلع ڈیرہ غازیخان کے تمنداروں اور جاگیرداروں کو مسلمانوں اور بالخصوص بلوچوں کی پسماندگی، جہالت اور علم سے بے بہرہ رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا" اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ میر بہرام خان تمندار مزاری کے خلاف نظمیں اور مضامین ہوتے تھے نمونہ ملاحظہ ہو۔

داڑ گونی مقدّر سے بلوچی قوم میں
کاٹ دینے کے جو قابل تھے وہ سر پیدا ہوئے[1]

اسی دوران سردار محمد اسلم خان نے "میر دیہات" نام کا ایک کتابچہ لکھا جس میں دیہات سدھار سے متعلق مضامین اور توہم پرستی کے اصلاحی پہلو بیان کئے گئے تھے۔ انہیں دنوں میر بہرام خان مزاری تمنداروں کا وفد لے کر ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے ملا اور اسلم خان کے خلاف شکایت کی اس وقت یہاں کا ڈپٹی کمشنر "سمتھ" تھا۔ اس نے اسلم خان کے خلاف اپنی رپورٹ وفد کے حوالے کر دی، اور وہ وفد گورنر پنجاب کے پاس پہنچا اور رپورٹ پیش کی گورنر نے پہلے ہفت روزہ "المعین" بند کیا پھر اسلم خان کو میانوالی میں ضلع بدر کر دیا اور دو سال تک سردار اسلم خان عیسیٰ خیل میں رہا، چنانچہ موقع پا کر وہاں سے فرار ہوا اور وزیرستان کے آزاد قبائلی علاقہ میں چلا گیا۔ عیسیٰ خیل کا نواب قادر داد خان بھی اسلم خان کے ساتھ ہو گیا تھا۔

اجمل خان کے بیان کے مطابق سردار اسلم خان نے علاقہ غیر میں جاکر حریت پسندوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ جو برصغیر کی سرحدی چوکیوں پر چھاپے مارا کرتی تھی جن سے تنگ آکر انگریزی گورنمنٹ نے اپنی فضائیہ کو حرکت دی اور ان حریت پسند فوجی ٹھکانوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعے بم پھینکے جاتے اس سے بھی حالات قابو میں نہ آئے، تو ہندوستان

[1] میر بہرام خان کو گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب ملا ہوا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔

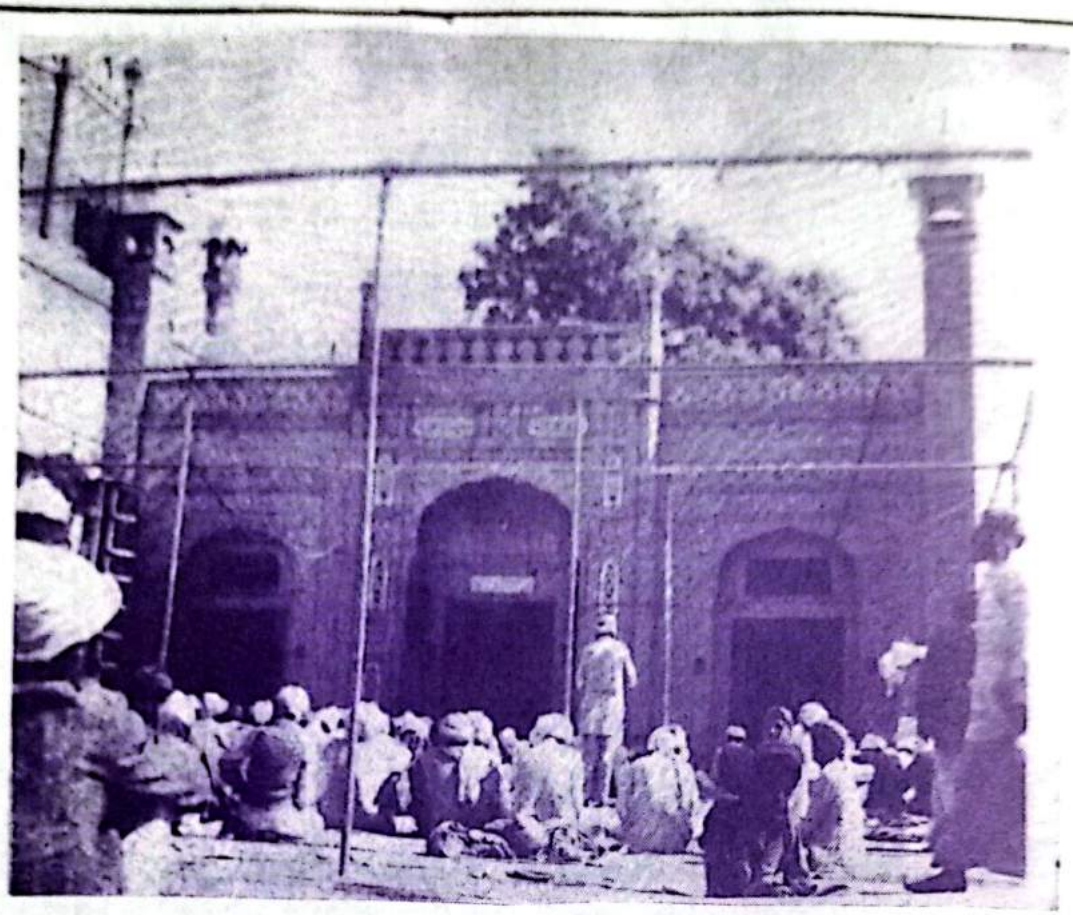

مسجد حاجی محمد مسو خاں نشکانی واقع کوٹ مٹھن

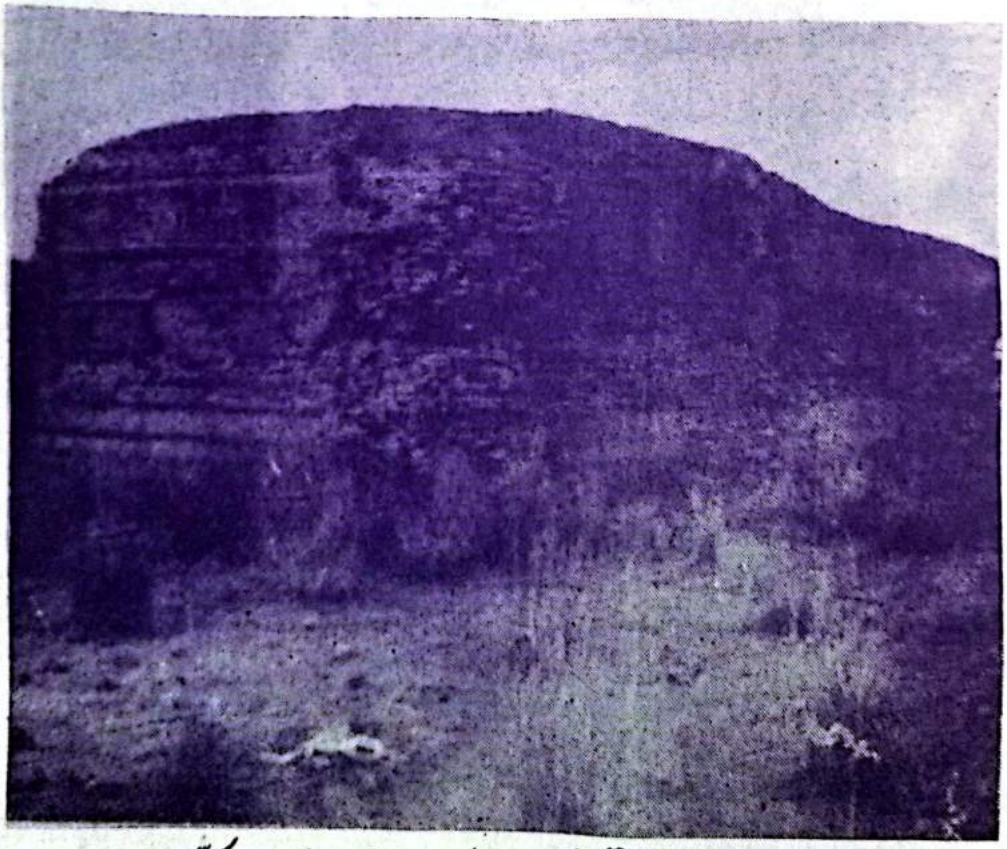

مقبرہ میر باز خاں واقع قصبہ نوتک ضلع بھکر

کی حکومت نے افغانستان کی حکومت سے احتجاج کیا اس وقت امیر کابل حبیب اللہ خان تھا اور اسے لکھا کہ وہ ان جھڑپوں کو بند کرائے۔ چنانچہ انہوں نے سردار محمد اسلم خان کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے اپنا مشیر خاص بنا دیا اور سرحدی جھڑپیں بند کرا دیں۔

کچھ عرصہ کے بعد حبیب اللہ خان ملک کے ہنگامہ میں قتل ہو گیا اور امان اللہ خان کو امیر کابل بنا دیا گیا۔ امان اللہ خان نے افغانستان کو انگریزوں کے چنگل سے نکالا اور ۱۹۱۹ء میں اسے آزاد کرا لیا۔ اسلم خان اب امان اللہ خان کا مشیر بن گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد امان اللہ خان کے خلاف بغاوت ہوئی اور وہ جان بچا کر روم کو چلا گیا۔ اب اس کی جگہ حبیب اللہ خان مشہور "بچہ سقہ" برسر اقتدار آ گیا۔ احمل خان کے بیان کے مطابق بچہ سقہ ایک ڈاکو تھا۔ اور آداب جہانداری و جہانبانی سے بالکل نابلد تھا۔ اس نے ظلم و ستم کو رواج دیا۔ جس کے باعث وہاں کے لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ اور اسلم خان نے مسجدوں اور بازاروں میں بچہ سقہ کے خلاف علی الاعلان صدائے احتجاج بلند کی اور عوام کو غیرت دلا کر اس کے خلاف خروج پر آمادہ کر دیا جس کے نتیجہ میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے بچہ سقہ نے سردار محمد اسلم خان کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ ان حالات میں ایک سابق جرنیل نادر خان جو کہ اس وقت فرانس میں حکومت کابل کی طرف سے سفیر تھا، وطن میں واپس آ گیا اور یہاں کے قبائلیوں اور عوام کی مدد سے بچہ سقہ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور خود نادر شاہ کے نام سے امیر کابل ہوا چونکہ اس ساری سازش میں اسلم خان شریک رہا اور نادر خان سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اس لئے اسلم خان کی قدر و منزلت پہلے سے زیادہ ہو گئی اور اس کی سالانہ تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا۔

سردار محمد احمل خان کا کہنا ہے کہ نادر شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد جب ہمارے پاس سردار محمد اسلم خان کا گرامی نامہ آیا تو اس میں جنرل محمد نادر خان کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ "جنرل محمد نادر خان نے فرشتہ رحمت بن کر بچہ سقہ ایسے ظالم اور ڈاکو سے کابل بلکہ تمام افغانستان کو نجات دلائی

الغرض سردار محمد اسلم خان نے ۱۹۳۱ء میں بعارضہ بخار کابل میں وفات پائی اور وہیں پر دفن ہوا۔ اسلم خان کی دو بیویاں تھیں ایک اپنے خاندان بلوچین اور دوسری افغانستان کے سلیمان خیل سے تھی۔ دوسری بیوی سے اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی جن میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی حین حیات ہیں۔ اسلم خان کی وفات کے بعد یہ لوگ وطن کو واپس لوٹ آئے تھے۔ اسلم خان کے لڑکے اصغر خان کی شادی اپنے چچا سردار محمد اعظم خان کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔ جس کے بطن سے ایک لڑکا خلیل حسین خان پیدا ہوا۔ اور اصغر خان نے ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا تھا اور سردار اسلم خان کی پہلی بیوی سے محمد افضل خان اور محمد اجمل خان ہیں۔ اول الذکر غالباً حج بیت اللہ کے موقع پر مکہ معظمہ میں فوت ہو گیا ہے اور ثانی الذکر حین حیات ہے اور قبیلے کا سردار اور سربراہ مانا جاتا ہے۔

سردار محمد اعظم خان۔ اپنے بھائی محمد اسلم خان کے بعد سردار محمد اعظم خان کو اپنی قوم و قبیلے کا سربراہ تسلیم کیا گیا وہ ذیلدار بھی رہا اور نظام ذیلداری اس پر منتج ہوا تھا۔ وہ ایک کم گو اور منکسر المزاج دردلش صفت انسان اور صوفی منش سردار تھا تسبیح و تہلیل اس کا وظیفہ تھا سردار محمد اعظم خان ایک بار صوبائی اسمبلی کا رکن بھی منتخب ہوا تھا۔ اسمبلی ہال میں بھی تسبیح و مصلیٰ اور اللہ اللہ اس سے نہیں چھوٹ سکے۔

سردار محمد اکرم خان۔ سردار محمد اعظم خان کے چار لڑکے ہوئے جن میں بڑا لڑکا محمد اکرم خان ہے اس کا ایک لڑکا محمد عارف خان جو ایڈوکیٹ تھا سکوٹر سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا اب اس کا چھوٹا لڑکا محمد اطہر خان ایڈوکیٹ ہے جبکہ دوسرا پسر محمد اشرف خان مرکز کونسل تھانہ تونسہ اور یونین کونسل سوکڑ کا چیئرمین ہے۔ محمد عارف خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک غربا نواز اور غریب پرور شخص تھا علاقہ بھر میں اس کا بڑا اثر تھا وہ ایک مخلص اور دوست نواز آدمی تھا سیاسی اور سماجی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتا تھا لوگوں کے چھوٹے موٹے جھگڑے خود چکا لیتا تھا علاقائی ترقی کا بڑا خواہش مند تھا اور اس غرض سے ہر وقت کوشاں اور غلطاں و پیچاں رہتا تھا

چنانچہ اس کی یاد میں منظور بلوچ کے یہ منظوم تاثرات ملاحظہ ہوں۔

مکیں ہے خلد میں سردار عارف — سراپا مشفق و غمخوار عارف
پریشان مضطرب غمگین سوکڑ — ارے تونسہ بھی ہے خونبار عارف
پکارے شدت غم سے ہمیشہ — تجھے تہمینہ[1] لاچار عارف
مجھے ماتم کناں لگتے ہیں سائے — بجز تیرے در و دیوار عارف

یہی منظور کی بس آرزو ہے
پسند آئیں میرے اشعار عارف

سردار محمد اکرم خان ایک نوجوان قائد تسلیم کیا جاتا ہے وہ سیاسی اور سماجی اور علاقائی کاموں میں دلچسپی رکھتا ہے موجودہ دور کے تقاضوں نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا ہے وہ مرکز کونسل کا چیئرمین رہ چکا ہے اور اب ضلعی کونسلر ہے، اس کی شہرت بھی اچھی ہے، وہ لوگوں کے ذاتی اور نجی معاملات بھی نمٹاتا رہتا ہے۔ اور حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے ہمارے خیال میں محمد اکرم خان قوم نوتک کی ایک ابھرتی ہوئی شخصیت ہے۔

لالہ ہتو رام نے ۱۸۷۲ء میں موجود ان مقدمین کے نام گنائے ہیں پہلی دودانی میں تادر بخش خان، پیردانی میں امام بخش خان و فتح محمد خان، شیرانی میں محمد بخش خان اور پہلی لعلوانی میں خان محمد خان اور اللہ یار خان، چنانچہ تادر بخش خان کی اولاد میں اب محمد اقبال ولد غلام حسن خان نمبردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دوست محمد خان دودانی نواب محمد اسد خان کے مصاحبین میں سے تھا دونوں ایک دوسرے سے پل بھر جدا نہیں ہوتے تھے۔ جس روز دوست محمد خان اسد خان کی کچہری میں حاضر نہ ہوتا تو کچہری برخاست ہوتی اسد خان اپنے دوست کے پاس سوکڑ پہنچ جاتا تھا، مگر جب دوست محمد خان سے آنکھ پھری تو منگروٹھہ میں بلا کر اسے مروا ڈالا۔

بہرکیف پہلی پیردانی میں سردار امام بخش خان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے جبکہ اسی شاخ کے دوسرے شخص فتح محمد خان کی اولاد میں اب فتح محمد خان پسر صاحب خان نمبردار ہے۔

[1] تہمینہ محمد عارف خان کی اکلوتی بیٹی کا نام ہے۔

اور محمد بخش خان شمرانی کی اولاد میں علی محمد خان ولد نور محمد خان نمبردار ہے اِسی شاخ میں سردار دوست محمد خان ایک اچھے اثر و نفوذ کا مالک ایک شخص ہو گزرا ہے، جو کسی ذاتی رنجش کے باعث سوکڑ کے بازار میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا اکلوتا لڑکا نصیر محمد خان ہے اور اللہ یار خان لعلوانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ لاولد فوت ہوا تھا اور خان محمد خان لعلوانی کی اولاد قصبہ لعلو میں آباد ہے اور دہ خانن والے مشہور ہیں۔ خان محمد خان کے پڑپوتوں میں اس وقت بڑا خان محمد خان ہے اور زمیندارہ کاروبار کرتا ہے۔ اللہ یار خان موصوف لعل خان کے لڑکے شاہ علی کی اولاد سے تھا اب اس پھلی کا ڈیرہ نورنگ خان پسر فضل خان ہے۔ زمیندارہ کاروبار کرتا ہے، مزاج سادہ رکھتا ہے دیکھنے میں ایک دہقان معلوم ہوتا ہے۔ طبیعت اس کی سنجیدہ ہے اور بول چال میں وہ ایک کتاب ناطق ہے۔ جسے ہم "مرقع معلومات" کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی خاندان کا ایک شخص امیر محمد خان یا دوست علی خان کسی وجہ سے سوکڑ کو چھوڑ کر قصبہ بنڈی میں چلا آیا تھا اور یہاں پر آکر اس نے اپنی مستقل سکونت رکھ لی، قصبہ بنڈی میں ملغانی خاندان کا یہ ایک واحد کنبہ ہے جو اس وقت سے بدستور آباد چلا آتا ہے۔ یہ خاندان بہرحال مقامی لحاظ سے زمیندار اور معزز چلا آتا ہے علاقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس خاندان کا موجودہ سربراہ سردار نور محمد خان ولد علی محمد خان ہے جبکہ اس کے دوسرے دو بھائیوں میں خان محمد خان موجود ہے۔ اور فتح محمد خان اپنا ایک اکلوتا بیٹا محمد یار خان چھوڑ کر وفات پا چکا ہے اور ایک چچا زاد بھائی محمود خان حین حیات ہے۔

عطا محمد خان - بعض تنکانی خاندان نواب محمد اسد خان کے دور میں کڑی شموزئی علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان کو ترک سکونت کر گئے تھے۔ جن میں لس خان پسر بلغ خان کی اولاد بھی تھی۔ ان تارکین وطن میں تاج محمد خان و احمد خان، میر احمد خان اور جانن خان کے نام خصوصیت سے بیان کئے گئے ہیں۔ عطا محمد خان پسر اللہ داد خان کا تعلق انھیں خاندانوں میں سے ہے۔ وہ اس وقت اپنی یونین کونسل کا رئیس اور نمبردار ہے۔ نمبرداری اس کے خاندان میں شروع ہی سے چلی آتی ہے۔ اس کا باپ اللہ داد خان بھی یونین کونسل کا ممبر رہ چکا ہے اور دادا غلام لیسین خان

سفید پوش اور علاقہ کے شرفاء میں سے تھا۔

جاوید بلوچ - جاوید بلوچ کا تعلق جانن خان لعلوانی کی اولاد سے ہے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ اور سلجھا ہوا نوجوان ہے۔ پولیٹیکل سائنس کی ایم۔ اے ہے۔ سیاسی اور سماجی کاموں میں اسے خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ گذشتہ انتخابات میں حلقہ تونسہ کی سیٹ پر الیکشن میں اس نے حصہ لیا تھا۔ وہ میر محی الدین بلوچ سابق مرکزی وزیر مواصلات کا پرسنل سیکریٹری بھی رہ چکا ہے۔ اور ایک ہونہار نوجوان ہے۔

جاوید بلوچ کا ایک چچا زاد بھائی محمد سلم بلوچ ہے۔ ریٹائرڈ گورنمنٹ ملازم ہے فاضل اور قابل شخص ہے۔ جواں ہمت اور بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔

غرضیکہ تاج محمد خان کی اولاد میں اس وقت گل محمد خان ولد غلام محمد خان، فتح محمد خان ولد امام بخش خان اور عطا محمد خان ولد نور محمد خان قابل ذکر شخص ہیں۔

تنگوانی - میر علی نوتک خان کے تیرھویں لڑکے تنگو خان کی اولاد تنگوانی کہلاتی ہے اس خاندان کے مورثان نے اندر پہاڑ سے نکل کر قصبات ہردو "ہیرو" اور مہندرہ کو آباد کیا اور اپنی یہاں پر سکونت رکھ لی تھی پہلے دور میں اس خاندان میں ملٹھ خان اور باقر خان مشہور آدمی ہوئے ہیں۔

سردار نور محمد خان - یہ ایک عام روایت ہے کہ سردار نور محمد خان تنگوانی نواب محمد اسد خان کا معتمد اور کاردار تھا کھڑک سنگھ نے جب سنگھڑ پر حملہ کیا اور اسد خان اندر پہاڑ بھاگ گیا تو اس نے کچھ عرصہ کے بعد نور محمد خان کو اپنے پاس بلا کر کچھ رقم دی اور لاہور دربار میں اسے اپنا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ سنگھڑ کی حکومت کا پروانہ دوبارہ حاصل کرے سردار نور محمد خان نے دیر لگائی اور واپس نہ آیا اسد خان اس وقت ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نواب شیر محمد خان سدوزی کے پاس چلا گیا مگر وہاں سے گرفتار ہوا اور سکھوں کی قید میں آگیا - چنانچہ وہ رقم سردار نور محمد خان نے نہ تو سکھوں تک پہنچائی اور نہ ہی اسد خان کو واپس کی اسی طرح اس نے سنگھڑ میں ایک وسیع قطعہ اراضی پر اپنا حق ملکیت جتایا اور اس پر قابض ہوگیا تھا ہمارے نزدیک پہلی بات میں کچھ صداقت ہے تو ہے - مگر دوسری بات الزام تراشی کے سوا کچھ نہیں ہے -

بہرحال سردار نور محمد خان نہ صرف اقتصادی اور مالی حالت میں ایک مضبوط آدمی تھا بلکہ جسم و جان میں بھی وہ ایک جسیم اور کڑیل جوان بتایا جاتا ہے - جس قدر وہ تنومند اور مضبوط جسامت کا شخص تھا - اسی قدر وہ بہادر اور دلیر تھا اس کی بہادری اور جوانمردی کے بہت سے قصے مشہور ہیں - جنہیں طول کلام کے باعث نظر انداز کیا جاتا ہے - ہندو لوگ تو اس سے اس قدر خوف کھاتے تھے جیسے شیر کو دیکھ کر گیدڑ - سردار نور محمد خان اپنی انہیں صفات کے باعث گردونواح کے علاقوں میں مشہور تھا - اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہ اپنے قبیلے کا مقدم اور بہرحال مسلمہ سردار تھا -

سردار خان - یہ سردار خان، سردار نور محمد خان کا لڑکا ہے اور وہی شخص ہے جس نے حاجی محمد مسو خان کے بعد سردار امام بخش خان ملغانی سے سیادت اور سیاست کے میدان میں پنجہ آزمائی کی تھی اور دربار اور سرکار میں کوشش کی کہ اسے نوتک قوم قبیلے کا سربراہ اور سردار تسلیم کر لیا جائے مگر حکومت وقت کے قواعد و ضوابط اور تقاضے کچھ ایسے تھے کہ ان ہر دو میں سے کسی ایک کو بھی سردار

تسلیم نہ کیا جا سکا تاہم سردار خان کو اپنے علاقے اور قبیلہ میں بہت بڑا مقام حاصل تھا وہ اپنے قبیلے کا مقدم اور ذیلدار بنایا گیا تھا اور عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بااثر سردار مانا جاتا تھا -

سردار فیض محمد خان :- سردار خان کے پانچ لڑکے تھے ان میں بڑا فضل علی خان تھا سردار فضل علی خان کا اکلوتا بیٹا سردار فیض محمد خان ہے - وہ ایک شریف النفس اور صوم و صلوٰۃ کا پابند شخص ہے - اور اپنے قبیلے کا مسلمہ سردار ہے وہ نام و نمود کے کاموں سے دور رہتا ہے مگر جب علاقہ سنگھڑ کے تحفظ و حقوق کی تحریک چلی اور اس نام کی تنظیم قائم ہوئی تو سب سے پہلے آپ نے لبیک کہا تھا - آپ ہمیشہ حزب اقتدار کا ساتھ دیتے چلے آئے ہیں - ہمارے خیال میں سردار فیض محمد خان اپنی تعلیمی کمی کے باعث ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کے سیاسی سماجی اور علاقائی کاموں میں حصہ نہیں لیا ہے - مواضعات ہیرو اور نبڑی وغیرہ بنجر اور غیر آباد ہو کر رہ گئے ہیں - لیکن اس شخص نے اپنا ذاتی اثر و رسوخ کبھی استعمال نہیں کیا ہے - بہرحال سردار فیض محمد خان میں کچھ جرأت رندانہ ہوتی اور وہ موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا تو علاقہ سنگھڑ میں اس سے بہتر اور موزوں شخص دوسرا نہیں ہے -

سردار فیض محمد خان کی اہلیہ محترمہ ایک پارسا اور نیک بی بی بیان کی جاتی ہے اور سردار منظور احمد خان قیصرانی کی ہمشیرہ ہے - کہا جاتا ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ خاتون ہے - ہر وقت دھیان گیان میں مستغرق رہتی ہے اپنی بچیوں کو بھی قرآن مجید حفظ کرا دیا ہے ممکن ہے خود بھی وہ حافظہ ہو -

الغرض سردار خان کے دوسرے بیٹے فتح محمد خان کا لڑکا سردار خان ثانی ہوا ہے وہ ایک بااثر شخص تھا اور اچھی شہرت رکھتا تھا - مگر ذاتی رنجش کی بنا پر خود اس کے کاردار نے اس کے ذاتی پستول سے فائر کر کے قتل کر دیا اب اس کے لڑکوں میں ڈاکٹر احمد نواز خان ایک مقبول شخصیت ہے -

سردار خان کے بعد اس کے دوسرے اور تیسرے لڑکے محمود خان اور حامد خان ذیلدار ہوئے تھے پھر محمود خان کا لڑکا محمد یار خان اور بھائی دوست محمد خان ذیلدار بنا، جبکہ علاقہ بیٹ کی ذیلداری عبداللہ خان پسر حامد خان کے پاس رہی اور انہیں دونوں پر ذیلداری نظام کا بالآخر خاتمہ ہوگیا۔ اب محمد یار خان کا لڑکا احمد یار خان اور دوست محمد خان کا بڑا بیٹا فیض محمد خان ہیں اور عبداللہ خان لاولد فوت ہوا تھا۔ عبداللہ خان کے دوسرے بھائی اور ان کی اولادیں موجود ہیں۔

۔ اور پانچویں پسر محمد نواز خان کا لڑکا احمد نواز خان محکمہ مال میں نائب تحصیلدار ہے

لالہ ہتو رام نے اپنے دور کے تنگوانی مقدمین کے یہ نام گنائے ہیں نور محمد خان ولد غلام حسن خان سردار نور محمد خان کا ذکر ہو چکا ہے اور غلام حسن خان کی اولاد میں اب خان محمد خان ولد محمد خان اور محمد افضل خان ولد یار محمد خان موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہتو رام نے غلام حسین خان ولد خان محمد خان کو مقدم لکھا ہے۔ مگر غلطی سے اس کا نام غلام حسن لکھ دیا ہے جبکہ آگے بیان کیا جا رہا ہے کہ غلام حسن (غلام حسین) کا بھائی سرفراز خان ایک با اثر زمیندار تھا اور نمبردار بھی رہا اس کے بعد اس کا بیٹا یار محمد خان اور پوتا محمد افضل خان نمبردار ہوتے چلے آئے ہیں یونین کونسل ہیرو کا اس وقت چیئرمین خدا بخش خان بن حافظ محمد جمال خان تنگوانی ہے۔

ملکانی - میر عالی نوتک خان کے نویں پسر مانک خان کی اولاد ملکانی مشہور ہوگئی۔ مانک بمعنی یاقوت (موتی)، مستعمل ہوا ہے جیسا کہ شہنشاہ بابر کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

ے مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا بلیغہ بس بولغوسید دریانی ودوتی[۱]

مانک خان بھی اپنی برادری اور قوم و قبیلہ کے ہمراہ اندر پہاڑ سے نکل کر منگروٹھ میں آکر آباد ہوا تھا۔ یہاں پر اس نے وفات پائی اور قبرستان "عالیں والہ" میں دفن ہوا۔ مانک خان کے آٹھ لڑکے تھے جن میں بڑا میر سارنگ تھا۔ وہ منگروٹھ میں رہا۔ اور دوسرے لڑکے مختلف مقامات پر قطعات اراضی حاصل کر کے جا کر آباد ہوئے اور وہاں پر ملکانی نام کی آبادیاں قائم کر لیں۔ جیسا کہ سنگھڑ میں آبادی ملکانی جو اب رتیڑہ کے نام سے مشہور ہے اور علاقہ

۱۔

ڈیرہ غازیخان میں ملکانی کلاں، ملکانی خورد اور ملکانی قلندر والی نام کی آبادیاں قائم کیں۔

حافظ بڈھن خان - حافظ بڈھن خان نواب محمد اسد خان کے دور میں اس کے لڑکوں کا اتالیق تھا اور انتظامی معاملات میں بھی عمل دخل رکھتا تھا۔ چنانچہ بدو دیدھو آپ ہی کی نگرانی میں کھودی گئی اور جاری کی گئی تھی۔ اس نسبت سے بدھو مشہور ہوئی۔[۱] حافظ بڈھن قاری القرآن تھا، عالم باعمل اور صوفی باصفا تھا اس سے کشف و کرامات ظاہر ہوتی تھیں۔ جن کا ذکر ہماری خاندانی روایات میں ملتا ہے۔

احمد خان - سردار احمد خان، حافظ صاحب کا پوتا اور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا یہ شخص مصنف کا دادا ہے اور اپنے وقت کا با اثر سفید پوش زمیندار تھا سادگی مروت، مہمان نوازی اور حسن سلوک کی بہت سی مثالیں اس کے متعلق موجود ہیں۔ بہادری اور جوانمردی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ایک بیان کے مطابق سردار احمد خان کی پیدائش ۱۸۵۰ء کی ہے اور وفات ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی اس بیان میں آپ کے خدوخال اس طرح بیان کئے گئے ہیں اور لکھا ہے گندم رنگ بلند بینی، پیوستہ ابرو اوسط قد اور اوسط اندام۔ چنانچہ پیوستہ ابرو کی نسبت سے یہ شعر رقم ہوا۔

ے کیا کہوں اس ابروئے پیوستہ کے
طعمہ اک، مچھلیاں دو، کشمکش آپس میں ہے۔

غرضیکہ سردار احمد خان کو اس کے انتقال کے بعد عالیں والے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا، اس کی بیوی اور ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ دفن ہیں اور ان کے نام کا ایک کتبہ لگا دیا گیا ہے آپ کے تین لڑکے محمد خان، شیر محمد خان اور محمود خان تھے محمد خان عرف محمود خان کی اولاد دوربہ علاقہ لیہ میں آباد ہے۔ درانیوں میں رشتہ ناطہ کر کے اب وہ اپنے آپ کو درانی لکھتے اور کہلاتے ہیں۔ زندگی بہر حال خوشحال گزار رہے ہیں۔ شیر محمد خان کی اولاد ڈیرہ غازیخان میں ہے مگر زیادہ آسودہ حال نہیں ہے جبکہ محمود خان کے چار لڑکوں میں سے تیسرا بیٹا مصنف

۱۔ تاریخ ڈیرہ غازی خان ص ۵۵۳

کتاب ہذا ہے۔

ڈاڈا ریسیوؔ ۔ میر مانک خان کا دوسرا لڑکا میر منندو (امیر محمد) تھا وہ قصبہ ملکانی (رتیڑہ) میں آباد ہوا۔ اس کی اولاد میں ڈاڈا ریسیوؔ نامی ایک مشہور اور فقیر منش آدمی تھا۔ وہ صاحبِ کشف بزرگ تھا۔ اور جنگل میں رہ کر مجرد زندگی گزارتا اور ریت کے ٹیلے پر قیام کر رکھا تھا کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس ہرنوں کا ریوڑ تھا اسے وہ چراتا اور ان کے دودھ پر گزر بسر کرتا تھا۔

ایک روز کسی ستم ظریف کو ظرافت سوجھی اور اس ٹیلے کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا، ڈاڈا ریسیوؔ کا ریوڑ جب اس ٹیلے کے پاس پہنچا تو اس نے اسے "ہُو" کرکے ڈرا دیا ریوڑ ادھر ادھر منتشر ہو گیا ڈاڈا ریسیوؔ نے اس شخص سے کہا جس طرح تو نے میرے اس ریوڑ کو منتشر کر دیا ہے تم بھی "کانوں کان" (منتشر) رہو گے یعنی کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا بہرکیف ڈاڈے ریسیوؔ نے اسی ٹیلہ پر وفات پائی اور وہیں پر ہی دفن کیا گیا تھا۔ ریت کے اس ٹیلے پر تاحال اس کی قبر کا نشان بتایا جاتا ہے۔

غلام محمد خان اسی ڈاڈا ریسیو کے تین لڑکے تھے شادن خان، دسن خان اور بندو خان بندو خان کسی قیصرانی کے قتل میں ملوث ہوا اور ان کے انتقام کے خوف سے یہاں سے ترک سکونت کر کے قصبہ ملکانی کلاں علاقہ ڈیرہ غازیخان کو منتقل ہو گیا تھا۔ اسی واقعہ سے شادن خان اور دسن خان میں بھی اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ یہ دو بھائی بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ایک نے آبادی شادن خان اور دوسرے نے دسن خان بسائی۔ جبکہ قدیم آبادی ویران ہو کر مزروعہ رقبہ میں منتقل ہو گئی ہے یہ آبادی موجودہ تھانہ رتیڑہ کے بالمقابل سڑک کے شمالی کنارہ پر قائم تھی۔ بہرحال بندو خان نے ملکانی کلاں کے پاس جا کر ایک وسیع قطعہ اراضی حاصل کر لیا جو موضع پتی امام بخش کے نام سے مشہور ہے یہ موضع اس وقت دریا برد ہے اس کے مالک اور مکین منتشر ہو چکے ہیں اس وقت ان کا بزرگ اور وڈیرہ

نبی بخش خان ہے۔ اس نے اپنی عارضی سکونت ڈیرہ غازیخان میں منتقل کر لی ہے اور وہ اس انتظار میں ہے کہ پتی امام بخش خان دریائے سندھ کے پنجہ سے نکلے اور وہ اپنی موضع جا کر آباد کرے۔ غرضیکہ قصبہ ملکانی (رتیڑہ) میں اس وقت بزرگ اور نمبردار غلام محمد خان ہے، اس کا بھائی غلام حسن خان ایک سمجھدار اور سنجیدہ آدمی تھا مگر افسوس ہے کہ وہ احمدی مرزائی ہو گیا تھا کچھ عرصہ ہوا وہ فوت ہو گیا ہے۔ اس وقت یہاں کی یونین کونسل کا رکن افضل خان ہے۔ یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ مانک خان کے دوسرے اور تیسرے لڑکے میر منندو خان اور میر حسن خان نے ملکانی (رتیڑہ) کی آبادی جا کر قائم کی تھی اور موضع بستی شادن کے پاس ایک مسجد بھی تعمیر کرادی تھی جو قدیم دستور کے مطابق قبہ والی مسجد تھی اور اس پر جونے سے پیچ کیا گیا تھا چنانچہ یہ دونوں بھائی جب فوت ہوئے تو ان کا پختہ اور روغن دار ٹائل سے مقبرہ تعمیر کرا دیا گیا۔ جہاں پر یہ دونوں دفن ہیں اب مقبرہ تو باقی نہیں رہا اس کے آثار اور قبریں باقی موجود ہیں مگر ان کے اخلاف انہیں دو مسافر اور فقیر سمجھتے ہیں۔

سردار محمد عمر خان ۔ نواب محمد اسد خان کے دور میں جہاں دوسرے ملکانی خاندان سنگھڑ سے ترک سکونت کر کے قریب کے دوسرے علاقوں میں جا کر آباد ہوئے تھے ایسے ہی میر حسن کی اولاد سے بعض لوگ یہاں سے ڈیرہ اسماعیل خان میں منتقل ہو گئے ان میں سے بعض کوٹ تگہ اور بعض گرہ داد میں آباد ہیں۔ گرہ داد کے خاندان میں سردار محمد عمر خان اپنے قبیلے کا سربراہ اور وڈیرہ ہے وہ اسلام آباد میں ڈائریکٹر کروپس (CROPS) فصلات ہے۔ آدمی مخلص اور شریف بتایا جاتا ہے۔ بلوچیت سے اسے خاص دلچسپی ہے۔

محمد حسین خان ۔ میر مانک کے باقی لڑکوں میں نور محمد خان، کبیر خان اور بہادر خان ملکانی کلاں میں، تتار خان اور بکھر خان ملکانی خورد میں اور قلندر والی میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ جہاں پر ان کی اولادیں بدستور آباد ہیں اور زیادہ تر زمینداره اور کاشتکاری کرتے ہیں ملکانی کلاں کی آبادی دریا برد ہو چکی ہے اور وہاں کے اکثر باشندے دوسرے علاقوں میں منتشر ہو گئے ہیں۔ جو باقی رہ گئے ہیں انہوں

نے اوقاف کے ایک قطعہ اراضی پر دوبارہ آبادی قائم کرلی ہے مگر یہ ایک مختصر سی آبادی ہے تاہم حکومت وقت نے ان کی آبادکاری میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ بلکہ اوقاف والے انہیں اکثر دق کرتے رہتے ہیں۔ جو بہرحال حکومت کا یہ مناسب اقدام نہیں ہے۔ اس آبادی میں اس وقت ڈاکٹر محمد اسلم خان کا اچھا اثر و رسوخ ہے۔ وہ یونین کونسل مہتم کا چیئرمین ہے نوجوان اور سنجیدہ شخص ہے یوں اس خاندان کا بزرگ اور وڈیرہ محمد حسین خان ہے۔ لیکن اس نے بھی اس وقت ڈیرہ غازیخان میں اپنی عارضی سکونت اختیار کرلی ہے۔ آدمی نہایت سنجیدہ، بلنسار خوش اخلاق اور منکسرالمزاج ہے صوم وصلوٰۃ کا پابند اور نیک سیرت انسان ہے سیاسی، سماجی، اور علاقائی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی رکھتا ہے مقامی طور پر اثر و رسوخ اور تعلقات بھی خاصے اچھے ہیں لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ظرافت اور ذہانت میں بھی اچھی درک رکھتا ہے۔ موضع ملکانی کے دریا برد ہوجانے سے اس کی اقتصادی حالت پر بہرحال معتدبہ اثر پڑا ہے۔ جو ہر لحاظ سے حکومتِ وقت کی توجہ کا محتاج ہے۔

ملکانی خورد میں اول محمد خان ولد خدا بخش خان کی اِقتصادی اور سماجی حالت اچھی رہی ہے۔ مگر اس کی اولاد کی اب وہ حالت باقی نہیں رہی ہے۔ محمد خان کا بڑا لڑکا حافظ اللہ ڈتہ ہے اس خاندان میں اس وقت غلام حسن خان ولد غلام حیدر خان کی اِقتصادی حالت اچھی بیان کی جاتی ہے۔ جبکہ الٰہی بخش ولد امام بخش خان اچھے اخلاق اور خوبیوں کا شخص ہے۔ خاندانی روایات سے بہرحال وہ بہرہ ور ہے۔ اس خاندان کا ایک بزرگ محمد خان بن فتح محمد خان موضع جراح تحصیل تونسہ سے منفرد ہوکر ملکانی خورد کو چلا گیا اور جا کر آباد ہوا تھا اس ملکانی خورد (چاہ لبتی والا) کے پاس چاہ کھکھل والا پر ایک دوسرا ملکانی خاندان آباد ہے۔ فیض محمد پسر شیر محمد خان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ فیض محمد نوجوان اور غیر سنجیدہ شخص ہے۔ اخلاقی اقدار سے بالکل نابلد ہے۔ اس کا

باپ یہاں کا زمیندار اور وڈیرہ ہے۔ اور ملکانی قلندر والی کے خاندان کا سربراہ اور بزرگ غلام سرور خان ولد اللہ بخش خان بیان کیا جاتا ہے۔ متوسط مالی اور اِقتصادی حالت رکھتا ہے۔

کرٹانی - کرٹانی خاندان میر عالی نوتک خان کے تیسرے لڑکے کی اولاد سے ہے۔ زیادہ تر حکومت اس خاندان میں چلی آئی ہے نواب محمد اسد خان اور اس کے اسلاف کا تعلق اسی خانوادہ سے تھا۔ کارٹ خان کی وفات اندر پہاڑ ہوئی تھی اس کی قبر دوہ سنگھڑ پر برسرراہ غیر معمولی طور پر لمبی موجود ہے۔ یہ قبر ستر قدم لمبی ہے لوگ اِسے ایک اصحاب کی قبر سمجھ کر اس سے دعائیں مانگتے ہیں۔ اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ چونکہ نوتک قبیلہ سید عبدالوہاب مشہور دین پناہ کا مرید خاص تھا اس لئے اس قبیلہ کے بزرگ شاہ صاحب موصوف کے اصحاب کہلاتے تھے اور بعض لوگوں نے انہیں اصحابِ رسولؐ سمجھ کر پیر و فقیر بنالیا تھا۔ جس طرح سخی سرور صاحب کے اصحاب مشہور ہیں۔

سردار کارٹ خان کی اولاد میں میر آدم خان سے نواب محمد اسد خان تک کے مفصل حالات پہلے گزر چکے ہیں اب اس خاندان میں اس کی دوسری شاخ کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

جام خان - جب تک اِس خاندان میں حکومت نہیں آئی تھی اس کے اپنے مقدم کا رول زندگی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ جام خان اپنے وقت میں کرٹانی خاندان کا مقدم اور سربراہ تھا۔ جام خان سردار کارٹ خان کا پوتا تھا۔ جام خان نے آبپاشی اور زمینوں کی سیرابی کیلئے ایک نالہ کھدوایا جو اس کے نام سے "جام واہ" مشہور ہے اور موضع پکھان کو سیراب کرتا ہے اور کالے پانی کا واہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اسی جام خان کی اولاد میں ایک خاندان مقامی طور پر "جام" مشہور ہے۔

تاج محمد خان - جام خان کا پوتا اور شادی خان کا لڑکا تاج محمد خان وقت کے سردار میر آدم خان کے دور سے معتمد اور منصبدار چلا آرہا تھا۔ سرکاری زمینات کی دیکھ بھال اور ان کی سیرابی کے وسائل اور انتظام اس کے سپرد تھا۔ وہ

CS CamScanner

نالہ ہائے رودکوہی کی احداثی کراتا اور رود سنگھڑ میں سدّات بندھوا کر زمینات سیراب کراتا تھا، ساتھ ہی مالیہ کی وصولی اور بعض سفارتی معاملات اس کی ذمہ داری میں تھے۔ چنانچہ نواب لعل خان کے دور میں بھی تاج محمد خان ان ذمہ داریوں سے منسلک تھا۔ ایک روز جب وہ خواجہ سلیمان کے پاس موجود تھا، خواجہ صاحب نے اس سے کہا کہ لعل خان تجھے گرفتار کرنا چاہتا ہے تیرا کیا خیال ہے! اگر تیری منشا ہو تو میں تجھے اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ سنگھڑ کی حدود سے باہر بھجوا دوں۔ تاج محمد خان نے جواب دیا کہ لعل خان تو مجھے عہدہ وزارت دینے والا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھے گرفتار کرائے گا اگر آپ کا خیال درست ہے تو اپنے بیوی بچوں اور اقربا کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔

غرضیکہ جلد ہی تونسہ کے قلعدار نے تاج محمد خان کو گرفتار کر لیا اور قلعہ تونسہ میں محبوس کر دیا، خواجہ صاحب کے بعض درباری اور شہر کے علماء اس قلعدار کے پاس پہنچے اور تاج محمد خان کی رہائی کی سفارش کی، مگر وہ نہ مانا، تاج محمد خان کی والدہ مائی مراد خاتون نے خواجہ صاحب سے آکر بیان کیا کہ قلعدار تونسہ نے میرے بیٹے کو چوبیس ہزار روپے اجارہ کے عوض میں گرفتار کیا ہے۔ جبکہ سنگھڑ کی اس قدر پیداوار نہیں ہے اب اس نے کہا کہ تاج محمد خان اعلیٰ اور عمدہ نسل کی ایک گھوڑی لا کر دے اور ایک سو روپے نقد ادا کرے تو اسے میں راتوں رات چھوڑ دوں گا۔ لیکن یہ بات تاج محمد خان نے قبول نہ کی اور قلعہ دار تونسہ نے اسے ناظم ڈیرہ غازیخان کے پاس بھیج دیا ہے۔ ان دنوں ڈیرہ غازیخان کا ناظم جمعہ خان تھا یہی وفد اس کے پاس پہنچا اور نواب محمد رضا خان کے ذریعے جمعہ خان سے تاج محمد خان کی رہائی کے لئے کہا۔ جمعہ خان نے کہا کہ تاج محمد خان سے چوبیس ہزار روپے لینا ضروری ہیں لیکن آپ لوگوں کی وجہ سے میں چار ہزار روپے معاف کر سکتا ہوں اور بیس ہزار روپے تاج محمد خان لا کر دے۔ خواجہ صاحب نے محمد رضا خان قلعدار تونسہ کو جمعہ خان کے پاس دوبارہ بھیجا اور کہا کہ وہ کل رقم معاف کر دے۔ اس موقع پر اس نے مزید دو

۱ ۔ شادی خان کی اولاد شادانی مشہور ہے۔

ہزار روپے معاف کر دیئے، مگر یہ فیصلہ بھی قابل قبول نہ ہو سکا اور خواجہ صاحب واپس لوٹ آئے اس واقعہ کے متعلق ملفوظات کے الفاظ یہ ہیں۔

تاج خان نامی بلوچ کہ از خویشاوندان و اہلکاران آبا و اجداد لعل خان بود۔ از خوف گرفتاری خویش گریختہ در جوار حضرت صاحب آمدہ نشست۔ روزے آں قبلہ میاں جمال دستی را فرمودند۔ کہ تاج را بگو! کہ لعل ترا گرفتار خواہد کرد، و نجات از قید او امر محال است۔ بیا ترا ہمراہ آدمیان خویش شباشب از حد سنگھڑ بیرون کردہ روانہ نمائیم۔ بعرض رسانید کہ لعل خان مرا وزارت می دہد چرا ماخذ می کند اگر فرمودند حضرت باصواب و بحسب عاقبت اندیشی منت درست۔ ولاجواب ست امّا اینقدر عیال و اطفال خود را کدام جائے بردہ بنشانم راست۔۔۔۔۔

دریں اثنا وروزی قلعہ دار تونسہ شریف باطلاع و صلاح لعل خان شباشب تاج خان را گرفتار کردہ در قلعہ تونسہ شریف۔۔۔۔ روز بشنیدن این خبر جملگی بندگان درگاہ و تمامی علماء بر دروازہ قلعہ۔۔۔۔ مادرش مراد خاتون نام رفت مادرش گفت کہ چارۂ مایان ہیچ نیست۔ مبالغ اجارہ از سنگھڑ پیدا نمی شود و قلعہ دار تونسہ بعوض بست و چہار ہزار روپیہ تاجہ را گرفتار ساختہ است۔ و سوائے گرفتن مصادرہ این نباید گزاشت۔ پس قلعہ دار بخدمت حضرت وکیل خود فرستاد کہ اگر یک اسپ مادیہ خوب و عمدہ و یکصد روپیہ تاج خان مرا بدہد۔ شباشب این را اخلاص کردہ روانہ نمایم چونکہ نور خان گور مانی این سخن از طرف حضرت صاحب تاجہ را گفت آں بیوقوف قبول نکرد۔۔۔

آخر قلعہ دار تاجہ را ہمراہ سواراں کردہ در ڈیرہ غازیخان فرستاد۔۔۔۔ حضرت صاحب روانہ شدند، در آنجا رفتہ در ڈیرہ خود بر مکان محمد رضا خان نمودند۔ وعلی الصّباح در قلعہ تشریف بردند۔ و بطریق وکالت محمد رضا خان را نجانہ نواب عطا کہ بانی جور و جفا بود، فرستادند، نواب عطا گفت کہ از تاجہ بست و چہار ہزار روپیہ گرفتن مناسب است۔ امّا بسبب تشریف آوری

میاں صاحب چہار ہزار روپیہ برائے لنگی آں جناب می گزارم ۔ بست ہزار روپیہ تا جہ بدہد۔ ہرگاہ کہ محمد رضا خان جواب نواب بحضور رسانید فرمودند کہ او را بگویند کہ حیتی دلال نیستم کہ برائی سود کنانیدن آمدہ ام ۔ من محض برائی حوائج کنانیدن تمام مصادرہ آمدہ ام ۔ چو رضا محمد خان باز نزد نواب مذکور رفتہ فرمود وحضرت را بیان کرد آں خرس خراسانی گفت دو ہزار نیز دیگر بخشیدم و از ھشردہ ہزار روپیہ واللہ یک خرمہرہ نگزارم حضرت صاحب از شنیدن این پیغام آن بدنام ہماں وقت روانہ سمتِ سنگھڑ شدند۔[1]

تاج محمد خان کی اولاد میں اس وقت محمد خان نائب تحصیلدار اور حاجی سردار خان پٹواری رہ چکے ہیں ۔ اور اچھی شہرت کے شخص ہیں ۔

میر باز خان ۔ میر باز خان اِسی شدانی پھلی سے تھا اور شادی خان کا پوتا تھا وہ ایک جنگجو اور بہادر شخص تھا اور دشمن پر باز کی طرح جھپٹتا تھا اور اسے پلک جھپکتے ہی اچک لیتا تھا ۔ چنانچہ نواب محمد اسد خان کے دور میں اس نے بھکر کی لڑائی میں اپنی بہادری کے خوب جوہر دکھائے تھے اس کی اس بہادری اور جرأت سے بھکر فتح ہوا تھا ۔ یہ لڑائی بھکر کے جسکانی سردار سے لڑی گئی تھی ۔ خود میر باز خان بھی اسی لڑائی میں مارا گیا نواب صاحب کو جب بھکر کی فتح کی خوشخبری سنائی گی تو انہوں نے جواب میں کہا قلعہ کیا فتح ہوا میں نے تو باز مروایا ہے اور قلعہ حاصل کیا ہے چنانچہ یہ لڑائی موضع نوتک (ضلع بھکر) میں ہوئی تھی اِسی نسبت سے اس آبادی اور موضع کا نام نوتک پڑا تھا اور میر باز کا وہاں پر ایک عالیشان مقبرہ بنایا گیا جہاں پر وہ دفن ہے یہ مقبرہ تاریخی یادگار کیلئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اب وہ بوسیدہ ہو چکا ہے قبہ اور بعض دیواریں گر چکی ہیں اُس مقبرہ کے ساتھ دائیں طرف ایک مسجد کے آثار ملتے ہیں اور ان دونوں عمارتوں کے سامنے ایک کوٹلی کی یادگار پائی جاتی ہے یہ مقبرہ نوتک اسٹیشن سے آبادی کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر واقع ہے میں نے موضع نوتک کا ریکارڈ دیکھا ہے

[1] مناقب المحبوبین ص ۲۲۰ ، ۲۲۱ ۔

اس میں وہاں پر آباد چھینہ قوم کا بیان درج ہے کہ ان کے آنے سے قبل یہ علاقہ بنجر اور غیر آباد پڑا تھا حاکم وقت نے جس کا نام انہیں یاد نہیں رہا ہے۔ ندرانہ کے طور پر دیا اور وہ لوگ اسے آباد کر کے سکونت پذیر ہو گئے۔ میں ایک محمد نواز نائب دفتر قانونگو کا شکریہ گزار ہوں جس نے نقل کروا کر یہ ریکارڈ لا کر دکھایا اور جانے سے تواضع کی تھی ۔ بہرحال اسی موقع پر غالباً وقت کے جسکانی سردار نے نواب محمد اسد خان کو اپنی لڑکی کا رشتہ دے کر صلح و صفائی کر لی تھی۔ میر باز خان کے بعد اس کا پوتا عمر حیات خان شدانی پھلی کا مقدم ہوا تھا پھر اسی خاندان میں نظام نمبردار آیا جو تا حال جاری ہے اور اب عمر حیات خان کا بڑا پوتا جند وڈہ خان نمبردار ہے ۔

محمد سرفراز خان ۔ اسی شدانی پھلی کی ایک اور شاخ میں محمد سرفراز خان ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھا ہوا اور تجربہ کار ایڈووکیٹ ہے ، قابلیت اور لیاقت اور پیشہ ورمہارت میں وہ اپنی برادری میں منفرد شخصیت ہے ۔ دیوانی مقدمات میں دسترس کا بادشاہ مشہور ہے پختہ دل و دماغ رکھتا ہے اور پختہ عمر کو پہنچ چکا ہے اپنے خاندان میں بزرگ مانا جاتا ہے سنجیدہ اور کم گو شخص ہے بلا مقصد لب کشائی نہیں کرتا ہے میر و شکار کا رسیا ابتدا ہی سے چلا آتا ہے ۔ سیاسی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے اپنے حلقۂ ارادت میں مقبول ہے

خان محمد خان ۔ سردار جام خان کا دوسرا بھائی گاگن خان تھا ۔ گاگن خان کے پوتے گاہنہ خان نے منکیرہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی اس مسجد پر قبہ تھا اور چونے سے پختہ کیا گیا تھا اس نسبت سے وہ پکی مسجد مشہور ہو گئی یہ مسجد قدیم دور کے فن تعمیر کا بے مثال نمونہ تھی اور گاہنہ خان کے بھائی حمزہ خان نے آبنوشی کی غرض سے ایک کھوہ (چاہ) احداث کرایا تھا جو عرف عام میں بچاہدی کھوہ یا "چاہ حمزہ والا" کے نام پر مشہور ہوا ۔ گاہنہ خان کا پوتا محمد ابراہیم خان ایک لائق اور فاضل شخص تھا ۔ علوم متداولہ پر اسے درک اور دسترس حاصل تھی ۔ فنِ کتابت اور اِنشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن حکیم کے نسخے اور دیگر مکتوبات اس کے اس فن کی غمازی کرتے ہیں ۔ حاجی جمال محمد خان کے پاس موجود ہیں میں نے قرآن حکیم کا ایک نسخہ دیکھا تھا جو

محمد ابراہیم خان کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ اس کی اولاد میں تاہنوز موجود اور محفوظ ہے۔

الغرض محمد ابراہیم خان کا پوتا خان محمد خان تھا۔ لالہ ہتیورام نے لکھا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کا مقدم اور وڈیرہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنے قبیلے میں ایک با اثر شخص تھا اور اپنے علاقہ میں مقبول تھا، لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔

حاجی خدا بخش خان ۔ خان محمد خان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سردار خان اپنے قبیلے کا مقدم اور نمبردار بنایا گیا تھا یہ پہلا شخص ہے جہاں سے نمبرداری اس خاندان میں چلی اور بدستور قائم ہے۔ سردار خان کے بعد اس کا بیٹا کوڑا خان اور پوتا حاجی خدا بخش خان نمبردار ہوتے چلے آئے ہیں حاجی خدا بخش خان سے قبل اس خاندان کی اقتصادی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ حاجی خدا بخش خان نے زمیندارہ اور کھیتی باڑی کی طرف اپنی پوری صلاحیتیں جھونک دیں۔ بعض مقبوضات کو وسعت دی اور بعض خرید کر لیئے شاملات دیہہ کو زیر قبضہ اور کاشت لانے میں وہ بہرحال ایک اچھا زمیندار بن گیا۔ اس نے تونسہ منگروٹھ روڈ پر مسافروں کی سہولت کے لئے ایک چاہ بھی احداث کرایا اور مسجد بھی بنوائی تھی یہ دونوں چیزیں موقع پر موجود ہیں۔

اسی طرح خدا بخش خان نے شہر منگروٹھ شرقی کی بگی مسجد کی از سرِ نو دوبارہ تعمیر کرائی اور اسے وسیع کر دیا ساتھ ہی ایک چاہ بھی کھدوائی تھی۔ یہ بھی بدستور قائم ہیں ان دونوں چیزوں کی تعمیر میں کرٹانی قبیلے کے ہر خاندان نے مالی اور افرادی امداد مہیا کی تھی۔ خدا بخش خان کی ایک بیوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سخی خاتون ہے۔ وثاق (ڈیرہ) پر آنے والے ہر مسافر کو روٹی اور رہائش کی سہولت مل جاتی ہے یہ سلسلہ حاجی خدا بخش خان کی زندگی سے برابر قائم ہے۔

حاجی محمد اقبال خان ۔ حاجی خدا بخش خان کا اکلوتا بیٹا حاجی محمد اقبال خان ہے نہایت شریف، مخلص، ملنسار، منکسر المزاج اور نیک سیرت شخص ہے

ہر شخص سے خلوص اور خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔ وسیع مطالعہ رکھتا ہے اور بلا کا ذہین ہے زمیندارہ کاروبار کرتا ہے نمبردار ہے اور اچھا اثر و نفوذ رکھتا ہے۔ حاجی خدا بخش خان کا ایک بھائی سردار خان تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ شریف اور غریب نواز تھا۔ ایک بار ڈسٹرکٹ بورڈ (ڈسٹرکٹ کونسل) کا کونسلر بھی رہا علاقہ کی ترقی میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ سردار خان کے دو لڑکے ہیں منظور حسین خان اور حاجی محمد علی خان منظور حسین خان ایک مرنجان و مرنج مزاج رکھتا تھا غربا اور مساکین کا ہمدرد اور سادہ لوح انسان ہے کئی بار یونین کونسل کا رکن بھی رہ چکا ہے اب اسے انتہا ئے خیز نظام سے دلچسپی نہیں رہی ہے زمیندارہ مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا لڑکا ظہور احمد خان اس وقت یونین کونسل منگروٹھ کا رکن ہے۔

حسنانی : حسن خان، میر عالی نوتک خان کا دوسرا پسر تھا اس کی اولاد حسنانی مشہور ہوئی - حسن خان نے اندر پہاڑ سے نکل کر اول درہ مہوئی پر قیام کیا تھا جہاں پر اس کے کوٹ اور آبادی کے نشان اب تک باقی ہیں - اس وقت اس علاقہ میں مکول قوم آباد تھی - حسن خان شاہصاحب دین پناہ کا مرید تھا اور اس کا اصحاب مشہور ہوا ایک روایت میں ہے کہ (حسن خان) اندر پہاڑ سے اس طرف آنکلا اور شاہ دین پناہ کا جو اس زمانہ میں مشہور، فقیر (درویش) صاحب کرامت مشہور تھا، مرید ہوا اور درّہ بئیں (رود) مہوئی پر اس نے قیام کیا - درّہ مہوئی پر حسن خان نے جس مقام پر قیام کیا اور آبادی قائم کی وہ درّہ مہوئی سے تقریباً ایک میل مشرق کو راستہ کے شمالی جانب تھی -

سردار حسن خان اور مکول اقوام کے درمیان لڑائیاں ہوئیں جن میں بالآخر حسن خان کو کامیابی حاصل ہوئی اور اقوام مکول شکست کھا جانے کے بعد دریا پار علاقہ مظفر گڑھ کو منتقل ہوگئیں - اس کے جو خاندان باقی رہ گئے وہ اب تک موجود پائے جاتے ہیں - سابق آبادی مکول کے پاس حسنانیوں نے اپنی ایک علیحدہ آبادی قائم کی جو مکول کلاں کے نام سے مشہور ہے -

اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ حسن خان کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی - مگر قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی لڑائی کے دوران مارا گیا تھا - میدان جنگ میں جس طرح اس کی لاش پڑی ملی اسی جگہ اور اسی سمت اسے شہید سمجھ کر دفن کر دیا گیا - چونکہ حسن خان اصحاب مشہور تھا اس لئے اس قبرستان کا نام بھی اصحاب والا قبرستان مشہور ہوگیا تھا جو تا حال موجود ہے حسن خان کی قبر معمول سے زیادہ لمبی اور شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت میں رکھی گئی ہے جبکہ دیگر قبور شمالاً جنوباً ہیں - یہ قبرستان ایک برساتی نالہ کے کنارہ پر قائم ہے اس لئے اس نالہ کا نام بھی چُر صحاب والی ہے اور اس برساتی نالہ میں ایک کنواں کھودا گیا ہے - وہ چاہ "صحاب والہ" کہلاتا ہے چونکہ اس چاہ کا پانی صاف اور میٹھا ہے - اس

کے اس میٹھے پانی کو نواب صاحب کی کرامت سے منسوب کیا جاتا ہے - اس علاقہ میں کھوسے بلوچ آباد ہیں - یہاں پر میری رہنمائی امام بخش خان کھوسہ نے کی تھی جس کا میں بہرحال شکر گزار ہوں۔ درہ مہوئی کے اندر موضع جورہ میں حسنانی قبیلے کے ہر خاندان کی ملکیت ہے حسنانیوں کا بیان ہے کہ اس موضع میں جو حسنانی شریک ملکیت نہیں ہے وہ حسنانی اور بلوچ نہیں ہے -

سردار محمد عمر خان ۔ خواجہ محمد سلیمانؒ پہلے پہل جب تونسہ میں آئے اور اپنی سکونت اختیار کی سردار محمد عمر خان حسنانی پہلا شخص ہے جس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مرید ہوا تھا۔ اور خواجہ صاحب کو اپنے ساتھ مکول لے آیا اور وہاں پر آباد ہونیکی پیشکش کی - اور آپ کی رہائش مکتب اور مسجد وغیرہ کے لئے جگہ دی۔ ساتھ ہی آپ کی گزر معاش اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے ایک وسیع قطعۂ زمین اور چند چاہات دیئے - اور "سوہیلی" نام ایک اسپ مادیہ سواری کیلئے نذر کی مگر خواجہ صاحب نے مکول کی نسبت تونسہ ہی کو پسند کیا تاہم "سوہیلی" کا نذرانہ اپنے پاس رکھ لیا تھا گویا کہ آپ کی سواری میں سب سے پہلی گھوڑی سردار محمد عمر خان کا عطیہ "سوہیلی" نامی گھوڑی تھی لیکن آخر عمر میں سردار محمد عمر خان نے خواجہ صاحب سے سلسلہ بیعت توڑ لیا اور پیری مریدی کے اس جُوا کو اپنے گلے سے نکال دیا تھا - اس بات کا خواجہ صاحب کو بڑا رنج ہوا اور عمر خان کے متعلق کہا کہ اب وہ مُرتد ہو گیا ہے جیسا کہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے -

عمر خان نام بلوچی بود، سکنہ قریہ مکول کہ از تونسہ شریف پنج کروہ سمت جنوب است مردی زمیندار و متداول بود- میاں صالح محمد کہ یکی از یارانِ مجاز حضرت صاحب بود- می گفت کہ ایں عمر خان بعد ازاں کہ حضرت صاحب در تونسہ شریف آمدہ سکونت ورزیدند- اول کسے کہ از اطراف تونسہ مرید حضرت صاحب شد، ایں بود و اول کسے کہ حضرت را برائے سواری اسپ مادیہ داد، ایں بود، یعنی قبل ازاں پیادہ سفری فرمودند- ازاں روز یکہ نامبردہ اسپ مادیہ را نذر کرد برائی سواری می شدند، کہ نام آں اسپ سوہیلی بود- و وقتیکہ او بیعت از حضرت کرد- ار سر صدق برائی نشستگاہ حضرت صاحب در شہر مکول سعی بلیغ نمودہ، تعمیر مکانات حرم سرائی و مسجد و حجرہ با فقراء بذمہ خودی کرد- و چند عدد چاہات و قطعہ ہائے زمین در بارۂ مصرف لنگر بندرا شرف می گزرانید- اما حضرت صاحب سوائی یک اسپ مادیہ مذکور دیگر شئ از وے قبول نہ فرمودند- و بہ دعائی خیر او را خوشنود فرمودند- و اکثر اوقات از مکول بہ زیارت حضرت آمدہ حضرت الخدمت میماند- از تقدیر الٰہی در آخر عمر از انجا کہ جاہل بود مردم جہلا از ارادتِ حضرت صاحب او مرتد ساختند" ہے

الزئی ایک بیان کے مطابق سردار حسن خان کے چھ لڑکے تھے۔ درہ خان ، دُرمحمد، پیر داد خان ، خمیہ خان ، سید خان ، میر وڈہ خان اور پلیہ خان - محمد عمر خان سردار خان کے بڑے لڑکے دُرّہ خان کی اولاد سے تھا اور درہ خان زنانی) کا لڑکا تھا -

سردار خان - سردار محمد عمر خان کے دو لڑکے عثمان خان اور شاہر دخان تھے عثمان خان کا ایک پوتا سردار خان تھا- وہ اپنے قبیلے کا بزرگ اور سربراہ تھا نمبرداری اور ذیلداری کے مناصب اس کے پاس تھے اور وہ ایک طاقتور اور با اثر سردار تھا - قوم اس کے اشارۂ ابرو پر قربان ہونے پر تُل جاتی تھی- علاقہ میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی اور اس کا دلی طور سے احترام کیا جاتا تھا -

سردار خان کے بعد اس کا لڑکا نسل احمد خان ذیلدار ہوا اور نمبرداری بھی اس کے پاس رہی - جب تک وہ ذیلدار رہا اس کا اچھا اثر تھا ، اس کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اور قوم میں ہر خاندان کا ایک علیحدہ وڈیرہ بن گیا اب تک یہی حال ہے - اور کوئی کسی کو بزرگ اور بڑا ماننے کو تیار نہیں ہے سردار خان کے دو لڑکے ہیں بڑا لڑکا گلشیر خان اور چھوٹا محمد شفیع خان ہے

عطاءاللہ خان ۔ سردار عمر خان کے دوسرے لڑکے شاہرد خان کی اولاد نسبتاً ممیّز اور ممتاز چلی آتی ہے۔ شاہرد خان کا ایک لڑکا سفید پوش اور ایک معتبر شخص تھا۔ اور سردار خان ذیلدار کا دست راست تھا۔ اور کوڑا خان کا لڑکا شاہرد خان ثانی ایک فاضل آدمی تھا۔ عربی اور فارسی پر اسے مکمل درک تھا۔ شاہرد خان ثانی کا دوسرا لڑکا محمد حیات خان تھا۔ سفید پوش اور معتبر شخص تھا۔ سفید پوشی کا یہ اعزاز اسی پر آکر ختم ہوا۔ اب اس کا لڑکا عطاءاللہ خان ہے نوعمر اور تعلیم یافتہ شخص ہے خوش وضع قطع رکھتا ہے گزشتہ دور سے وہ اپنی یونین کونسل کا چیئرمین چلا آتا ہے۔ اپنے حلقہ ارادت میں بہرحال مقبول ہے اس لحاظ سے اسے اپنے قبیلے میں یک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ سیاسی اور سماجی کاموں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ لوگ اس کے متعلق ملے جلے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ نمبرداری دوست محمد خان پسر شاہرد خان کی اولاد میں چلی آتی ہے اب اس کا پوتا احمد یار خان نمبردار ہے۔ حسنانی قبیلہ میں سرداد نوبت خان اور محمد خان بھی اچھے اثرورسوخ کے شخص ہوگزرے ہیں۔ علاقہ کے بڑے زمینداروں اور بااثر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی اولاد میں اب نواب خان ولد نور محمد خان عرف جت خان اور حبیب اللہ خان ولد حافظ اللہ بخش خان قابل ذکر شخصیتیں ہیں

دتانی ۔ دتہ خان (اللہ ڈتہ خان) میرعالی نوتک خان کا چوتھا پسر تھا اسکی اولاد دتانی مشہور ہوئی۔ دتہ خان نے بھی غالباً اندر پہاڑ وفات پائی تھی اور کارٹ خان کے پاس درہ سنگھڑ پر دفن ہوا تھا دوسری غیرمعمولی لمبی قبر اسی کی معلوم ہوتی ہے۔ دتہ خان کی اولاد میں سے بعض لوگ نواب محمد اسد خان کے وقت یہاں سے منگل علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان کو نقل مکانی کر گئے تھے ایک بیان کے مطابق لعل خان ولد سوحیل خان دتانی نے یہاں سے ہجرت کی تھی اور وہ قصبہ مندرانی سے وہاں گیا تھا۔ اب اس کی اولاد میں حاجی عبدالرشید اپنے خاندان کا بزرگ اور سربراہ ہے۔

قاضی نور محمد خان ۔ منگروٹھ کے دتانی خاندان میں عہدہٗ قضاۃ عمر خان نامی ایک شخص کو ملا تھا۔ تب سے اس خاندان میں ایک کینہ قاضی مشہور چلا آتا ہے۔ خواجہ محمد سلیمان کے دور میں اسی خاندان کا ایک شخص قاضی نور محمد تھا اور آپ کے خاص مریدوں میں سے تھا۔ ملفوظات کی کتاب میں کہا گیا ہے کہ قاضی نور محمد اپنی حاملہ بیوی کو لے کر ایک روز خواجہ صاحب کے پاس آیا اور استدعا کی کہ اس وقت میری سب لڑکیاں ہیں اور کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اب اگر شکم مادر میں لڑکی ہے تو اسے لڑکا بنا دیں۔ چنانچہ جب وضع حمل ہوا تو حضرت صاحب کے طفیل لڑکا ہی پیدا ہوا تھا، لیکن جب وہ دو سال کا ہوا تو اس کے چہرہ پر چیچک نکل آئی اور اس کے اثر سے وہ نابینا ہوگیا۔ اب وہ اپنے اس لڑکے کو لے کر خواجہ صاحب کے پاس پہنچ گیا ایک روپیہ نذر کیا اور کہا کہ میں نے اندھا لڑکا طلب نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اسے بینائی دلائی جائے۔ شد آنچہ شد، بہرحال اصل عبارت کے الفاظ یہ ہیں

نقلست قاضی نور محمد سکنہ منگنوٹہ (منگروٹھ) پیش فقیری گفت، کہ مرا دو دختران شدہ بودند پسری نشدہ ..... پسر بسیار ..... حاملہ بود زنِ خود را مع ہر دو دختران خود بخدمت حضرت صاحب آوردم، عرض کردم کہ غریب این ..... موجود اند، نیز این عورتِ من حاملہ است امید پسری دارم و توقع زندگی نیست۔ توجہ فرمائید، تا حق تعالیٰ مرا فرزند نرینہ عنایت کند اینک عورتِ من نزدِ شما حاملہ نشستہ است۔ اگر در شکم این دختر باشد ہم پسر کردہ دہند۔ کہ حق تعالیٰ اولیاء را این چنین قدرت دادہ است۔ فرمودند برو، حق تعالیٰ ترا فرزند نرینہ خواہد داد۔ باز گفتم جناب من این اقرار پختہ باین کردہ ام، برخیزم، فرمودند بلے! برخیز با تو اقرار پختہ کردہ ام حق تعالیٰ

ترا پسر خواہد داد بعد از چند روز بہ طفیل حضرت صاحب حق تعالیٰ مرا پسری داد چو دو سالہ شد اور را بیماریِ چیچک شدہ بود و چشم دے درد میکرد، و خوفِ کور شدن چشم بود۔ آں پسرک را ہمراہ خود تونسہ شریف بخدمت حضرت آوردم، دیک روپیہ نقد بدستِ وی دادہ نذر کردم، و عرض کردم کہ غریب نواز من پسرک از شما کور چشم نہ طلبیدہ بودم۔ اینک پسرِ شما حاضر است یا چشم بہ نمایند وا لا پسر خود بگیرید۔ کہ من ایں را ازیں جا بغیرِ بہ شدن نخواہم بُرد،،[1]

قاضی عطاءاللہ۔ غرضیکہ قاضی نور محمد خان کے متعلق ہتھو رام نے لکھا ہے کہ وہ اپنے وقت میں قبیلہ دتانی کا مقدم اور وڈیرہ تھا چنانچہ یہ نمبرداری بدستورِ اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔ اور عہدۂ قضاۃ بھی چلا آیا جو اس کے پڑپوتے قاضی عطاءاللہ پر آکر منتج ہُوا قاضی عطاءاللہ اس وقت نمبردار ہے۔ اور جے وی مدرس ہے۔ اپنے پردادا کی روش پر قائم ہے اور خواجگان تونسہ کا حاشیہ نشین اور مختیارِ عام ہے۔ اس کے رویہ سے اس کے قبیلے کے لوگ ناخوش رہتے ہیں جبکہ یونین کونسل منگروٹھہ کا کونسلر قاضی محمد بشیر ولد قاضی منظور احمد ہے۔ وہ ایک شریف نوجوان ہے۔ قومی اور سماجی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ چنانچہ اس نے جھوک قاضی والی پر ہیندرہ ہزار روپے کی لاگت سے ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی ہے جو اس کے سنجیدہ اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاس ہے۔

[1]۔ مناقب المحبوبین ص ۲۵۲۔

قاضی نورمحمد ثانی۔ اس قاضی نور محمد کے باپ کا نام قاضی صدیق محمد تھا۔ یہ شخص بڑا فاضل اور متقن تھا۔ دانا اور عقلمند مشہور تھا۔ اول خواجگان تونسہ اور آخر سردار منظور احمد خان قیصرانی کا معتمد اور مشیر رہا۔ خوش خوراک، خوش لباس اور تنومند آدمی تھا۔ گفتار میں سنجیدگی اور رفتار میں متانت پائی جاتی تھی۔ اپنے دور میں وہ ایک اچھا مقام رکھتا تھا۔ برادری اور قرب وجوار کے لوگوں میں بہرحال قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور یوں اس کا اثر و رسوخ بھی اچھا تھا۔ زندگی اس کی زیادہ تر علاقہ سے باہر رہ کر گزری اور وہ اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑ کر مرا تھا۔ قاضی غلام حیدر خان اور قاضی عطا محمد خان، اول الذکر وفات پا چکا ہے اس کے تین لڑکے ہیں قاضی محمد شریف، قاضی محمد اشرف اور قاضی محمد انور۔

قاضی عطا محمد خان حین حیات ہے۔ اچھا اور سلجھا ہُوا آدمی ہے۔ ذہن پختہ اور دِل مضبوط رکھتا ہے۔ آزادی پسند اس کی طبیعت واقع ہوئی ہے۔ دنیا کے بکھیڑوں سے زیادہ تر دامن بچا کر رہتا ہے۔ حساس طبیعت اور فعّال مزاج کا مالک ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ مقدمہ بازی اور برادری کے جھگڑوں میں رہ کر زندگی گزاری ہے نہ انہوں نے اپنے مستقبل پر نگاہ ڈالی تھی اور نہ ہی اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کبھی سوچا تھا۔

شاہرو خان دتانی۔ منگروٹھہ غربی میں دتانی خاندان میں شاہرو خان ایک مشہور اور معروف شخص گزرا ہے۔ وہ ایک اچھا زمیندار اور با اثر آدمی تھا۔ معاشرہ میں اسے اچھا مقام حاصل تھا، اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب اس کا لڑکا نور محمد خان ہے۔ اچھا شخص ہے اور زمیندارہ کاروبار کرتا ہے۔ اِسی خانوادے کا قابلِ ذکر شخص درویش محمد خان ہے۔ اچھا اثر و رسوخ رکھتا ہے ہر کسی سے حُسنِ سلوک سے پیش آتا ہے، کم گو اور دانا شخص ہے۔ فوجی پنشنر ہے۔ شریف اور سنجیدہ اِنسان ہے۔ ایسے ہی بستی دتانی کا حافظ محمود

خان ایک قابل ذکر شخص ہے وہ نابینا ہے، عابد اور زاہد آدمی ہے۔ زمیندارہ کاروبار کرتا ہے۔ اور اچھا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔

مٹھوانی۔ میرعالی نوتک خان کے پانچویں لڑکے مٹھوخان کی اولاد مٹھوانی کہلاتی ہے۔ قرائن اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مٹھوخان نے بھی اندر پہاڑ رہ کر وفات پائی تھی اور آپ کی قبر بھی غیر معمولی لمبی بنائی گئی اور وہ کارٹ خان کے ساتھ درہ سنگھڑ پر دفن ہے۔

اس خاندان کے بعض لوگ اندر پہاڑ رہ گئے تھے جن کی اولادیں ابتک وہاں پر آباد ہیں اور اس وقت وہ بزداروں کا جزو بدن بن گئے ہیں اور کچھ لوگ اسد خان کے عہد میں قصبہ تنکانی کو ترک سکونت کر گئے تھے اور وہاں پر آباد ہیں۔

خان محمد خان۔ لالہ ہتو رام نے اپنے دور میں خان محمد خان کو مٹھوانی قبیلہ کا مقدم لکھا ہے اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک با اثر اور قابل شخص تھا۔ وہ نواب محمد جمال خان لغاری کے پاس رہا اور اس کا مشیر خاص اور معتمد تھا۔ پڑھا لکھا اور فاضل آدمی تھا۔ فہم و فراست اور ذہن و ذکاء میں وہ طاق تھا اس کی قابلیت اور لیاقت کے باعث نواب صاحب موصوف اپنے پاس سے پل بھر جدا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اب اس کی اولاد میں عطا محمد خان ہے۔ روشن خیال نوجوان ہے عقل و خرد میں ابھی ناپختہ ہے۔ اور یاروں کے جھانسہ میں جلدی آجاتا ہے۔ اس وقت تک اس کی زندگی ایک تلخ قسم کے دور سے گزر رہی ہے۔

حاجی عطا اللہ خان۔ حاجی عطا اللہ خان کے بیان کے مطابق ان کا ایک بزرگ غلام محمد خان قصبہ تنکانی سے منگروٹھ کو واپس منتقل ہو آیا تھا۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ غلام محمد خان کا باپ محمد خان ایک لکھا پڑھا آدمی تھا اور اسے توبۃ النصوح کا قصہ زبانی یاد تھا اور رات کو وتاق پر بیٹھ کر وہ یہ قصہ بیان کرتا تھا، اس باعث سے اس کا نام نصوحہ پڑ گیا۔ چنانچہ اس کی نسبت سے یہ خاندان نصوحہ کہلاتا ہے۔ حاجی عطا اللہ خان اچھا زمیندار اور با اثر شخص ہے زکوٰۃ کمیٹی کا چیئرمین رہ چکا ہے۔ علم دین پر بھی اسے اچھا عبور ہے۔ عربی او، ٹی مدرس رہ چکا ہے اس لئے عربی، فارسی سے بخوبی واقف ہے۔ یوں بھی وہ ایک شریف النفس اور نیک آدمی ہے۔ مخلص اور ملنسار ہے۔ کم گو ہے کسی مقصد کے بغیر لب نہیں کھولتا ہے شر و فساد سے بہرحال دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دل و دماغ پختہ اور راسخ العقیدہ شخص ہے۔ اپنے قبیلے کا بزرگ اور سربراہ مانا جاتا ہے۔

سیف اللہ خان۔ سیف اللہ خان، عطا اللہ خان کا بھتیجا اور فیض اللہ خان کا لڑکا ہے وہ ایک جواں سال اور جواں ہمت شخص ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایڈووکیٹ ہے۔ شریف اور مخلص آدمی ہے۔ مرنجان و مرنج مزاج رکھتا ہے وہ منگروٹھ یونین کونسل کا چیئرمین بھی رہ چکا ہے۔ بنیادی جمہوری نظام کے نفاذ سے ابتک اس جیسا فرض شناس چیئرمین منگروٹھ یونین کونسل کو نہیں ملا ہے۔ اس کے دور میں منگروٹھ میں بجلی کی سپلائی ہوئی، واٹر سپلائی نظام جاری ہوا اور اس کے تحت اہم راستوں میں پائپ لائن بچھائی گئی اور وسعت بھر گھر گھر پانی پہنچایا گیا، دیہی ہیلتھ سنٹر کی منظوری ہوئی اور اس کی عمارت تعمیر کی گئی۔ جو اب مکمل ہو چکی ہے۔

تونسہ منگروٹھ روڈ کی منظوری بھی سیف اللہ خان کے دور میں دی گئی تھی۔ اور اس کے پہلے مرحلے کا کام بھی انہیں دنوں میں شروع کر دیا گیا تھا۔ اب وہ تیسرے مرحلہ میں داخل ہے اور ہر پانچ فرلانگ کے فاصلہ پر مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ امید رکھنا چاہیئے کہ کتاب کی اشاعت یہ کام بہرحال مکمل ہو چکا ہوگا۔ منگروٹھ بدرو پر دو مقامات پر پختہ پل اسی دور میں بنائے گئے۔ ایک پل عام گزرگاہ پر اور دوسرا مڈل سکول میں بچوں کے آنے جانے کیلئے تعمیر ہوا ہے۔

سیف اللہ خان نے اپنے دور میں ایک مضبوط بلکہ تخریبی ذہن رکھنے والی حزب اختلاف کے باوجود اپنے تدبر اور بردباری کا بے مثال مظاہرہ کیا اور ہر قسم کی

رکاوٹ کو دور کیا، تعصب سے اجتناب اختیار کیا اور ہر قسم کی انتقامی کارروائی سے درگزر کرتا رہا۔ اور نہ ہی کسی قومی کام کو اپنے وقار کا مسئلہ بنایا۔ یہ وہ صفات ہیں جنہوں نے اسے ہر وقت کامیابی سے ہمکنار کیا اور اسی کا دور ہمارے لئے بہرحال یادگار رہے گا۔ جس کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے۔

سنجرانی ۔ سنجر خان، نوتک خان کا چھٹا لڑکا تھا اس کی اولاد سنجرانی کہلاتی ہے سنجر خان نے اندر پہاڑ سے نکل کر رود سنگھڑ کے دائیں کنارہ پر آبادی قائم کی اور اس کا نام سنجرانی رکھا بعد میں یہ قصبہ بوہڑ پسر مانجی کے نام پر بوہڑ مشہور ہوگیا تھا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

عبداللہ بلوچ ۔ سنجر خان کے غالباً پانچ لڑکے تھے اور بڑا لڑکا ساکھہ خان (اسحاق خان) تھا۔ ساکھہ خان کی پشت میں عبداللہ خان مشہور عبداللہ بلوچ بن سردار خان ہوا۔ ہتو رام نے اسے اپنے وقت میں سنجرانی قبیلے کا مقدم لکھا ہے یہ شخص اچھے اثر و رسوخ کا مالک تھا اور ایک طاقتور سردار سمجھا جاتا تھا۔ عبداللہ بلوچ نواب محمد اسد خان کے دور میں کاردار بھی رہا۔ اس زمانہ میں فوجی اور دیگر شاہی ضروریات کے لئے مختلف جگہوں سے آٹا پس کر آتا تھا دینی علاقہ کے کاردار اپنے اپنے علاقہ میں مختلف گھرانوں میں اناج تقسیم کر دیتے اور عورتیں آٹا پیس دیتی تھیں ایک موقع پر قصبہ سنجر سے آٹا پس کر نہ آیا اسد خان نے اس کی وجہ پوچھی تو عبداللہ بلوچ نے کہلا بھیجا کہ اس دفعہ میرے بچے آٹا پکا کر کھا گئے ہیں۔ اسد خان نے عبداللہ بلوچ کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ وہ اپنے لڑکے رحیم یار خان کو بھی ساتھ لیتے گیا۔ جب وہ نواب صاحب کے پیش ہوئے

تو عبداللہ بلوچ نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ بچہ کھا گیا ہے۔ اسد خان نے رحیم یار پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور محبت بھری آنکھوں سے دیکھا چونکہ وہ بچہ ایک ابھرتا ہوا حسین و جمیل اور وجیہہ جوان تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جاؤ تم پر یہ آٹا معاف ہے۔ تاہم اس روز سے عبداللہ بلوچ کے گھر آٹا پسوائی کی ڈیوٹی اٹھا لی گئی۔

فتح محمد خان ۔ عبداللہ بلوچ کی اولاد میں تین پشت تک برابر اپنے قبیلے کے مقدم ہوتے چلے آئے تھے۔ اس کا لڑکا محمد یار خان اور پوتا فتح محمد خان کے بعد یہ سلسلہ نمبرداری میں بدل گیا چنانچہ سردار خان اور فتح محمد خان ثانی نمبردار تھے فتح محمد خان ایک مخلص اور مہمان نواز شخص تھا۔ اس کے مہمان ہونے کا ایک موقع مجھے بھی میسر آیا تھا۔ سادہ اور دیہاتی رواج کے مطابق اس کا کھانا تھا جو ضداری اور تصنع سے بالکل پاک تھا۔ اس کھانے سے خلوص بہرحال نمایاں تھا۔ جس کی مہک اور تروتازگی میرے دل و دماغ کو برابر معطر کیئے ہوئے ہے۔

فتح محمد خان ایک شریف اور قابل قدر شخص تھا غالباً وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ کس طرح لنگڑا ہوا تھا۔ الغرض اب اس کا لڑکا درویش محمد خان ہے۔ وہ باپ کا جانشین ہے امید ہے وہ باپ کا صحیح جانشین بن کر رہے گا اور اس کا خلف الرشید سمجھا جائے گا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ نمبردار ہے اور ہونہار نوجوان ہے۔

سلطان محمود خان ۔ سلطان محمود خان ولد غلام حیدر خان اس وقت ایک اور

قابلِ ذکر شخص ہے اس کا تعلق بھی عبداللہ بلوچ کے خاندان سے بتایا جاتا ہے بچپن میں اِس کے والدین نے غالباً اکلوتا بیٹا ہونیکی وجہ سے یا کسی ردِ بیاری کی صورت میں سلطان محمود کی ناک میں بالا پہنا تھا۔ جس کی نسبت سے وہ ناتھو (نتھو) مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ اب تک اسے اس نام سے بولتے ہیں۔ یہ شخص تنومند اور مضبوط ڈیل ڈول والا ہے۔ مگر دِل اس کا کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کا اظہار بعض مواقع پر کیا ہے۔ یوں اس آدمی کا علاقہ میں اچھا اثر ہے۔ ابتداء سے اپنی یونین کونسل کا رکن منتخب ہوتا چلا آتا ہے۔ علاقائی مسائل کے حل اور سیرابی زمین میں خاصی دلچسپی لیتا ہے خصوصاً رود سنگھڑ کی سیلات بندھوانے اور لوگوں کو اس کام میں دلچسپی لینے میں توجہ لاتا رہتا ہے۔ بہر پہلو یہ شخص قابل قدر ہے۔ قصبہ سنجر کے سنجرانی روزِ اوّل سے جواں مرد اور جواں ہمت مشہور چلے آتے ہیں۔ جہاں کانٹے ہوں وہاں پر پھول بھی بہرحال ہوتے ہیں قصبہ سنجر میں قدیم الایام سے چار عربی درس جاری ہیں جن میں سے ایک نے اب زیادہ ترقی اور شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان درس نے بیسیوں قاری اور حفاظ پیدا کئے ہیں بھارت میں پانی پت کے قاری اور ہمارے ہاں سنجر (بوہڑ) کے قاری ہر لحاظ سے مشہور ہیں۔

اللہ ڈتہ خان ۔ سنجر خان کے ایک پسر محمید خان نے برادری سے کسی وجہ سے قطع تعلق کر لیا تھا اور وہ یہاں سے ترک سکونت کر کے علاقہ ڈیرہ غازیخان میں چلا گیا اور وہاں ایک وسیع قطعہ زمین حاصل کر کے اس میں محمید نام کی ایک آبادی قائم کر لی جواب تک آباد ہے۔ چونکہ اس آبادی سے متصل ایک اور آبادی نوتک خان لغاری نے بنالی تھی اس لئے یہ دونوں آبادیاں نوتک محمید کے نام سے مشہور ہو کر رہ گیئں۔ اگرچہ نوتک نام کی آبادی ایک عرصہ دراز سے کسی وجہ سے کھنڈر کی صورت اختیار کر چکی ہے اور محمید بدستور آباد ہے تاہم یہ آبادی اب نوتک محمید کہلاتی ہے۔

الغرض مولوی محمد شمیم کا بیان ہے کہ سابق دور میں نوتک محمید کے سنجرانیوں کو بڑا عروج رہا ہے۔ اور یہ لوگ بڑے دبدبہ اور شان وشوکت سے رہتے تھے۔ ان کے وسیع قطعہ ہائے اراضیات تھے اور وہ صاحب ثروت اور دولتمند رئیس تھے۔ دور دور تک ان کا اثر ورسوخ ہوتا تھا۔ قصبہ نوتک ایک مقامی بزرگ سید فتح شاہ کی بددعا سے تباہ ہوا تھا اور یہاں کے سنجرانی خاندان اِدھر اُدھر اپنی چھوٹی چھوٹی آبادیاں بناکر منتشر ہو گئے ہیں۔ خود قصبہ محمید کے قبرستان میں ان لوگوں کی سطوتِ رفتہ کے باقی نشان پختہ قبروں کے آثار کی صورت میں رہ گئے ہیں۔ جو ایک دور میں یقیناً وہ عالیشان مقابر اور عمارات تھیں۔

میری ملاقات اللہ ڈتہ خان سے ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بڑھاپے اور عسرت کی زندگی گزار رہا تھا اور اسّی سال سے زائد عمر کا تھا۔ مگر ایک مضبوط جثہ اور تنومند تھا۔ نوتک محمید سے مغرب میں چاہ درکھان والہ پر بیٹھا تھا اس کے گرد چند در چند آدمی بیٹھے تھے علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کیا آپ نے کھانا کھانا ہے؟ چونکہ میں اس بستی سے ایک ایسے شخص کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا، جس نے کھانے کا پوچھا تو تھا۔ مگر دو گھنٹے بٹھا کر اور اپنی چرب زبانی سے اپنی زندگی کے قصے سنا کر اللہ ڈتہ خان کے چاہ تک پہنچا دیا تھا اور اس طویل سمع خراشی کے بعد بھی کھانے کا دوبارہ نام نہیں لیا تھا۔ اس لئے اللہ ڈتہ خان کے جواب میں، مَیں نے جواب دیا کیا یہاں پر کسی اجنبی سے کھانا پوچھنے کا رواج ہے؟ میرے منہ سے ابھی یہ جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اس مجمع سے ایک شخص اٹھ کر چلا گیا جس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ اب میں نے کہا نہیں آپ سے صرف چند منٹ بات کرنی ہے۔ پھر مَیں ڈیرہ غازیخان چلا جاؤں گا اور کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس مجمع سے آواز آئی کہ اب جوان چلا گیا ہے اور وہ روٹی لے کر ہی آئے گا۔ چنانچہ ہمارے بیٹھے بیٹھے وہ شخص کھانا لے کر آیا اور ہم نے کھالیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اس کی بلوچیّت پر بہرحال رشک آیا۔ کھانا لانے والوں میں سے اس کا لڑکا قادر بخش خان تھا۔

غرضیکہ اللہ ڈتہ خان کے حسن سلوک اور مہمان نوازی سے میں بڑا متأثر ہوا اور اسے داد دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا ہوں۔ یہ کوئی پُرتکلّف اور مُرغّن کھانا نہیں تھا مگر خلوص اور محبّت

سے بھرپور ضرور تھا۔ اللہ دتہ خان کے تین لڑکے ہیں۔ غلام محمد خان، قادر بخش خان اور غلام حسین خان اب انہوں نے ذاتی محنت اور جفاکشی سے زمین کا ایک اچھا خاصا قطعہ حاصل کر لیا ہے۔ اس میں محنت کر کے وہ اپنا رزق حلال کماتے اور کھاتے ہیں۔ عزت و وقار بھی ان میں واپس پلٹ آیا ہے اور اپنے اسلاف کے وہ جائز جانشین ثابت ہوئے ہیں۔ باپ کی طرح سادہ، خوش خلق، ملنسار اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں، اور اپنے قبیلے سے انہیں بڑا پیار ہے۔ غلام حسین خان فوت ہو چکا ہے اس کا اکلوتا لڑکا در محمد خان ہے۔

مندرانی - موندر خان پسر میر عالی نوتک خان کی اولاد مندرانی کہلاتی ہے۔ موندر خان اس کا ساتواں لڑکا تھا۔ موندر خان کی اولادیں سے بعض ہڑند میں رہ گئے تھے جن کی اولادیں ابتک وہاں پر آباد ہیں۔ اس وقت ان کا وڈیرہ امام بخش خان ہے۔ یہ دو گھرانے ہیں ایک گھرانہ میر عالی نوتک خان کے مقبرہ پر جھاڑو بہارو کرتا ہے اور چراغ جلاتا ہے دوسرے لوگ اس کی منتیں مانتے اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

سردار موندر خان کی وفات بھی اندر درہ سنگھڑ ہونا معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ قبر بھی درہ سنگھڑ پر کاوڑ خان کے پاس رکھی ہے اور اسی کی طرح غیر معمولی لمبی قبر ہے۔ یہ اعزاز ان لوگوں کو دراصل اس لئے حاصل تھا کہ وہ سید عبدالوہاب مشہور دین پناہ کے خاص الخاص مرید اور عقیدت مند تھے اور شاہ صاحب موصوف کے "صحاب" کہلاتے تھے۔ موندر خان کی اولاد نے رود سنگھڑ کے جنوبی کنارہ پر اپنی آبادی قائم کی۔ اور اسے مندرانی کا نام دے دیا۔ جو اول روز سے برابر آباد ہے۔ ان بھائیوں میں سے بعض نے وہاں مچھر کی کثرت کی شکایت کی اور وہ منگروٹھ میں چلے آئے۔ اس وقت مندرانی میں رہنے والوں نے ان کا مذاق اڑایا اور انہیں مچھرانی کا نام دیا چنانچہ یہ خاندان منگروٹھ میں رہ کر مچھرانی کہلاتے ہیں۔

غلام محمد خان - آج سے پانچ چھ پشت قبل مندرانی قبیلے کا مقدم اور سربراہ غلام محمد خان تھا وہ بڑا بااثر زمیندار اور قابل شخص تھا۔ اپنے قبیلے اور برادری میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور مقبول آدمی تھا۔ غلام محمد خان اور اس کے گھرانے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک علم و فضل کا گھرانہ ہے شروع ہی سے ان میں حفاظ اور عالم پیدا ہوتے

رہے ہیں۔ دولت اور ثروت کے لحاظ سے بھی یہ ایک متموّل گھرانہ سمجھا جاتا رہا ہے اس خاندان میں حافظ گل محمد خان اور اس کا دادا وغیرہ بھی دانا اور فاضل آدمی بیان کئے جاتے ہیں۔ حافظ گل محمد خان کا اکلوتا بیٹا محمد بشیر خان ہے نہایت شریف، متین اور سنجیدہ شخص ہے۔ خندہ پیشانی اور خلوص سے پیش آتا ہے۔ گویا اس خاندان میں وہ ایک قابل قدر شخصیت ہے۔ زمیندارہ مشاغل میں مستغرق رہتا ہے۔

امام بخش خان - امام بخش خان کا والد احمد حسین خان ایک فاضل اور اچھا انشاپرداز شخص تھا وہ زیادہ تر بزدار تمندار کے پاس رہا اور اس کا معتمد اور مختیار عام تھا۔ جرگہ کے ہر قسم کے مقدمات کی کارروائیاں اور فیصلہ جات اسی کے قلم فیض رقم سے تحریر ہوتے تھے اس باعث سے وہ منشی احمد حسین مشہور ہو گیا تھا۔ آدمی بہر حال قابل اور دانا تھا اس کے دو لڑکے محمد یار خان اور امام بخش خان ہیں۔

محمد یار خان باپ کی طرح ایک ذہین اور فطین آدمی ہے محکمہ تعلیم میں ملازم بھی رہا ہے۔ ہومیوپیتھی میں مہارت اور تجربہ رکھتا ہے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر محمد یار خان مشہور ہو گیا ہے۔ محمد یار خان ایک جہاندیدہ اور گرم و سرد چشیدہ شخص ہے۔ اب اس نے اپنی سکونت ڈیرہ غازیخان میں رکھ لی ہے۔ خوشحال اور آسودہ حال زندگی گزار رہا ہے۔ منگروٹھ میں اب اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خان کو کسی قدر سربراہی کا منصب حاصل ہے ریٹائرڈ مدرس ہے۔ کم گو اور آزادی پسند آدمی ہے کسی سے میل ملاپ اور تعلقات کم رکھتا ہے۔ اور زمیندارہ کاروبار سے شغف رکھتا ہے۔

امام بخش خان کا ایک چچازاد بھائی حامد خان ہے۔ جوانی اس نے اپنی شاہانہ ٹھاٹھ سے گزاری ہے زندگی اس کی ہمیشہ سیر و شکار میں گزری ہے اب وہ بڑھاپے کے لمحات اور تلخ لمحات گزار رہا ہے۔ اس کی اولاد نرینہ نہیں ہے اسی فکر نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے یوں وہ بلند نظر اور بلند ہمت آدمی ہے۔ حامد خان کا میں اس لئے بھی مرہون احسان ہوں کہ اس کو منگروٹھ

کے قدیم آثار سے پتھر کا ایک پیالہ اور ایک دیا (چراغ) ملا تھا۔ مجھے اس کتاب میں ان کے فوٹو لگانے کیلئے نذرانہ کے طور پر دیدیئے ہیں اور وہ ایک تاریخی سرمایہ کی حیثیت سے میرے پاس محفوظ ہیں۔

چولانی - چولانی خاندان پیر عالی نوتک خان کے چودھویں پسر چوٹل خان کی اولاد سے ہے۔ اور اس کی نسبت سے چولانی مشہور ہوا ہے۔ چوٹل خان جب اندر پہاڑ تھا تو اس نے اپنی سکونت مقام ہرن بوڑ کے پاس ایک کچی (وادی) میں رکھی تھی۔ جو اس کے نام سے بدستور کچی چوٹل خان کہلاتی ہے اور جب وہ ڈرہ سنگھڑ سے باہر آیا تو قصبہ چولانی سے دو میل جنوب مغرب میں اپنی آبادی بنائی جو جھوک چوٹل خان کے نام سے مشہور تھی۔ چنانچہ خود بھی اسی مقام پر وفات پائی تھی۔ چونکہ وہ دین پناہ صاحب کے خاص مریدوں میں تھا اس لئے اس کا اصحاب کہلاتا تھا۔ اور اب اس کی قبر کو لوگ ایک پیر صحاب کی قبر کہتے ہیں۔ یہ قبر بھی غیر معمولی صورت میں لمبی ہے۔ جھوک چوٹل خان ریاست سنگھڑ کی جنوب مشرقی سرحد پر تھی اور بیرونی حملوں کی زد میں تھی اس لئے بعد میں چولانی قبیلہ وہاں سے ترک سکونت کر کے موجودہ مقام پر چلا گیا اور چولانی نام کا قصبہ آباد کر لیا۔

علی محمد خان رائے بہادر ہتو رام کے دور ۱۸۷۲ء میں چولانی قبیلے کا مقدم اور سربراہ علی محمد خان تھا۔ علی محمد خان اپنے وقت کا ایک اچھا زمیندار اور با اثر آدمی تھا۔ لوگ اس کی قدر کرتے تھے اور چھوٹے موٹے جھگڑے اس کے پاس لے جاتے تھے جو وہ فیصلہ کر دیتا کسی کو چوں چرا کرنے کی مجال نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور لوگوں میں مقبول تھا۔

علی محمد خان کے بعد اس کا لڑکا غلام حیدر خان قوم و قبیلے کا سربراہ بنایا گیا۔ اور وہ بھی مقدم رہا۔ اپنے علاقہ میں بہرحال وہ مقبول تھا اور وہ اچھا اثر رکھتا تھا اس کے دو لڑکے سردار خان اور گلزار خان ہوئے۔ سردار خان کے وقت نمبرداری نظام قائم ہو چکا تھا اب وہ نمبردار بنایا گیا اور قبیلے کا سربراہ اور وڈیرہ

تسلیم کر لیا گیا تھا۔ پھر یہ نمبرداری اس کے بھائی گلزار خان کو منتقل ہو گئی مگر یہ منصب اس کے پاس بھی باقی نہ رہ سکا اور اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح علی محمد خان کے خاندان میں اب کوئی قابل ذکر آدمی نہیں ہے۔

حمزہ خان - حمزہ خان اگرچہ علی محمد خان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس خاندان کی ایک دوسری شاخ سے ہے۔ چنانچہ گلزار خان سے نمبرداری حمزہ خان کے سپرد ہوئی تھی۔ اور وہ اس وقت زندہ ہے۔ اور نمبردار ہے اپنے حلقۂ ارادت میں ایک مقبول آدمی ہے زمیندارہ کاروبار کرتا ہے افسوس ہے کہ مجھے اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ حمزہ خان کے دو لڑکے بیان کئے گئے ہیں۔ غلام حسن خان اور غلام رسول خان غلام رسول خان اس وقت یونین کونسل مکول کلاں کا وائس چیرمین ہے۔ اس بات سے بہرحال یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اچھا اور با اثر آدمی ہے۔

یوں قبیلہ چولانی کے جن اشخاص سے اتفاق ہوا ہے وہ نہایت بے مروت اور کرخت مزاج کے تھے ان میں خلوص نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ مہمانداری کے آداب سے بالکل نابلد ہیں۔ اجڈ اور جاہل قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اپنے معاملات میں بہرحال ہوشیار پائے جاتے ہیں۔ کھیتی باڑی کا مشغلہ رکھتے ہیں۔ اور اچھے زمیندار ہیں مگر گزران نہایت سادہ اور دہقانوں کی رکھتے ہیں۔

قصبہ چولانی کی مسجد کی طرز تعمیر اور قدامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد اول دن سے اپنی آبادی میں قائم ہے ملتانی ٹائل سے تعمیر ہوئی تھی اب اس پر سیمنٹ سے پلستر کر دیا گیا ہے۔ جس میں اس کی تاریخی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے اس مسجد کا پیش امام محمد حیات خان ہے اور بکھوانی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ عالم نما جاہل شخص ہے مگر اسے اپنی دستار فضیلت پر بڑا ناز ہے دوسروں کو وہ ان پڑھ اور جاہل سمجھتا ہے۔ اس کا قصور بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جن لوگوں

ہیں وہ رہتا ہے وہ اسی قماش اور فطرت کے لوگ ہیں اس کا نظریہ ہے" ہم چوں ما دیگرے نیست"

چوٹل خان کی قبر کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک اصحاب رسول کی قبر ہے اور اس کا ذکر ترمذی شریف میں آیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

غرضیکہ قصبہ چولانی سے بستی پیر کو آتے ہوئے راستہ کے بائیں جانب کالو والہ چاہ آتا ہے وہاں پر ایک نفیس اور اعلیٰ مسجد بنی ہوئی ہے اس مسجد پر قبہ ہے اس مسجد کو حاجی کالو خان چولانی نے ذاتی خرچ پر بنوایا تھا۔ اس مسجد پر استعمال ہونے والی ٹائل اور قصبہ چولانی کی مسجد پر استعمال ہونے والی ٹائل ایک ہی محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ مسجد بوسیدہ ہو رہی ہے اس کی اولاد میں اس کا خرچ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ حکومت وقت کسی مناسب فنڈ سے ان کی مالی امداد کرے اور وہ اس تاریخی مسجد کی مرمت کرا سکیں۔

بلوانی۔ بلوانی خاندان میرعالی نوتک خان کے آٹھویں لڑکے بلاول خان کی اولاد سے ہے اور اسی نسبت سے بلوانی مشہور ہوا ہے۔ بلاول خان نے کوٹ قیصرانی کے بالمقابل رود کنواں کے دائیں کنارہ پر ایک آبادی قائم کی جو جھوک بلوانی کے نام سے مشہور ہے۔ بلوانی خاندان منتشر حالت میں پایا جاتا ہے۔ جن میں دھوا کے پاس جھوک بلوانی اور ڈیرہ اسماعیل خان میں یہ لوگ پائے جاتے ہیں اور بعض بیٹ خادم والی میں چاہ بلوانی والا پر رہتے ہیں۔

بلاول خان ثانی۔ لالہ ہتورام نے اپنے دور میں اس خاندان کے مقدم کا نام بلاول خان لکھا ہے جو اپنے مختلف مواضعات میں اس کا زمیندارہ تھا۔ گنڈھ بلوانی والی ابتک مشہور چلی آتی ہے۔ جس سے اس کے ایک وسیع قطعۂ اراضی کی سیرابی ہوتی تھی۔

تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کی اولاد میں بلاول خان ثالث تھا اور درہ سنگھڑ میں اکثر آیا کرتا تھا اور اپنی

زمینات کا محصول وغیرہ لے جاتا رہا ہے۔ پھر اس نے یہاں کے رقبہ جات فروخت اور بیع کر دیئے تھے اس روز کے بعد اس کی اولاد وغیرہ کا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے کچھ مقبوضات ابھی تک علاقہ سنگھڑ میں موجود ہیں ایک اطلاع کے مطابق بلاول خان ثانی اور ثالث کا خاندان منگل کے قریب آباد ہے۔

سردار خان۔ سردار خان بلوانی اس وقت جھوک بلوانی واقع علاقہ سنگھڑ میں رہتا ہے۔ بڑی عمر کا آدمی ہے تجربہ کار اور مکار قسم کا شخص ہے میل ملاپ میں بے مروت اور گفتگو میں سخت رو کھا ہے۔ مہمان کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر سیاہی آجاتی ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ مہمان کو دھوپ میں ٹھہرا کر اور دو ٹوک جواب دے کر رخصت کر دیا جائے۔ مگر جو شخص ایک دشوار گزار اور کٹھن راستہ طے کر کے اس کے پاس پہنچا ہو۔ وہ بیٹھ کر کم سے کم دل و دماغ کو آرام تو پہنچائے گا۔ اس وقت بھی یہ شخص در پر آئے ہوئے مہمان سے روٹی پانی کے متعلق نہیں پوچھتا تا آنکہ چلتے وقت مہمان سے پینے کو خود پانی نہ مانگ لے۔ سردار خان کی اس تدریجی اور بداخلاقی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہرکیف سردار خان ولد محمد خان عمر اور عقل و خرد میں جھوک بلوانی کے بلوانی خاندان میں بڑا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بڑائی اس کا نام نہیں ہے۔ بزرگی بعقل است نہ بسال یہ کسی بزرگ کا قول ہے۔ مگر یہ شخص ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے بزرگ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور دیگر بلوانی بھی دوران سفر مجھے ملے تھے ان میں سے ایک سردار خان کا بھائی تھا۔ یہ سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے معلوم ہوتے ہیں۔ نوتک قبیلہ میں یہ دوسرا خاندان ہے جس نے اپنے جہل بسیط کا مظاہرہ کیا ہے۔

بکھوانی۔ نوتک خان کے دسویں پسر بکھو خان کی اولاد بکھوانی کہلاتی ہے۔ بکھوانی خاندان کے بہت ہی کم لوگ اس وقت پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر ان کی آبادی منگروٹھڑ میں ہے۔ جبکہ ایک آدمی مولوی محمد حیات خان چولانی (قصبہ) میں رہتا ہے۔ اور چند گھرانے قصبہ ننکانی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کاشتکاری کرتے ہیں زمیندارہ بھی زیادہ معلوم نہیں ہو سکا ہے اور نہ ہی کوئی تعلیم یافتہ آدمی پایا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ کسی دور

میں سنگھڑ سے کسی دوسرے علاقہ کو نقل مکانی کر گئے ہوں اور وہاں پر کسی مقامی قبیلے کا جزو بدن بن کر رہ گئے ہوں۔ بہرحال اس خاندان کے حالات نہ پا کر مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف ہے۔

حاجی لعل خان ۔ حاجی لعل خان کو میں ابتدا ہی سے میں جانتا ہوں۔ ابتدا میں وہ ایک مفلس اور غریب آدمی تھا۔ اس کے اسلاف کی زمینات ہندوؤں کے پاس رہن تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے ایک آرڈیننس کے تحت وہ بلا معاوضہ واگزار ہو گئی تھیں۔ تب سے اس نے شہری زندگی چھوڑ دی اور اپنے رقبہ جات پر جھوک بنالی جہاں پر وہ بیٹے اور پوتوں کے ساتھ آباد ہے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ بھی اس نے خشکی کے راستہ سے پیدل چل کر ادا کیا تھا۔ اب وہ عمر کے آخری ایام سے گزر رہا ہے۔ آدمی بہرحال صوم و صلوٰۃ کا پابند اور شریف ہے قبیلہ میں بزرگ مانا جاتا ہے۔

رحمانی ۔ رحموں خان کی اولاد رحمانی مشہور ہے۔ یہ شخص میر عالی نوتک خان کا گیارہواں پسر تھا۔ اس کا اصل نام سلیم خان تھا مگر نامعلوم وجہ سے یہ رحموں خان مشہور ہو گیا رحموں خان نے درّہ رود سنگھڑ کے شمال میں واقع لہڑیوں (چھوٹے رودکوہی نالوں) پر قبضہ کیا اور ان کے پاس کورو نام کی آبادی قائم کی جہاں پر اس کی اولاد بدستور آباد اور قابض چلی آتی ہے۔ اس قبیلہ کی ایک معتدبہ آبادی منگروٹھہ میں بھی موجود ہے۔
رحموں خان دامن کوہ میں کسی مقامی آبادی کے لوگوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اس کی قبر وہاں پر موجود ہے اور وہ قبرستان گنج شہدا یا شہیدوں والا قبرستان کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ اس قبیلہ کے بعض لوگ نواب محمد اسد خان کے عہد میں یہاں سے قصبہ تکانی اور دیگر علاقوں میں چلے گئے تھے۔ جہاں یہ بدستور آباد ہیں اور رحمانی نام کی جھوک ہائے قائم کر رکھی ہیں۔

غلام محمد خان ۱۸۲۰ء کے دوران غلام محمد خان اپنے قبیلہ رحمانی کا مقدّم تھا یہ بات لالہ ہتورام نے لکھی ہے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ غلام محمد خان آبادی کورو کا باشندہ تھا اپنے وقت کا بااثر زمیندار تھا علاقہ میں مقبول تھا لوگ

اس کی عزّت اور قدر کرتے تھے برادری کے معمولی جھگڑے قضیئے چکا لیتا تھا آدمی دانا اور پختہ کار تھا۔ اب اس کی اولاد میں احمد خان ولد غلام محمد خان موجود ہے۔ ایک حلقۂ احباب رکھتا ہے اس کی اقتصادی حالت متوسّط ہے زمیندارہ کام کرتا ہے۔ یونین کونسل منگروٹھہ کا رکن ہے۔ جھوک کورو کے رحمانی خاندان میں اس وقت احمد خان پسر گامن خان کو وڈیرہ اور سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے۔
قصبہ چولانی کے چولانی، جھوک بلوانی کے بلوانی اور جھوک کورو کے رحمانی ایک سے ایک اجڈ اور بے مروّت قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ جہل مرکب ان کا خمیر ہے کسی سفید پوش (صاف لباس) آدمی کو دیکھ کر گھروں اور کھیتوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ اس اجنبی کی خبر گیری کرنے اور پانی و روٹی کا پوچھنے کے لئے کسی میں اخلاقی جرأت باقی نہیں رہتی ہے۔

حاجی اللہ بخش خان ۔ رحمانی خاندان کا ایک حصّہ مقامی طور سے ہنی مشہور ہے لیکن اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے حاجی اللہ بخش خان کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ حاجی صاحب کی صحبت مجھے کئی بار حاصل کی تھی وہ ایک پختہ دل و دماغ کا مالک اور راسخ العقیدہ شخص تھا۔ غالباً حج بیت اللہ کا فریضہ بھی اس نے خشکی کے راستے پیدل سفر کر کے ادا کیا تھا۔ وہ متشرّع اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا ہمیشہ نیکی اور راستی کی باتیں (نصیحتیں) کرتا تھا۔ بُرے اور غلط کار لوگوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ زمیندار اور اچھے اثر و رسوخ کا آدمی تھا۔ خوشحال اور آسودہ حال تھا۔

لہڑی داد والی ۔ رود کورو تین لہڑیوں پر مشتمل ہے جن میں ککوالی، فقر والی اور داد والی لہڑیاں شامل ہیں۔ ابتدا میں ہر لہڑی کے منہ (درّہ) پر میٹھے پانی کا ایک ایک چشمہ تھا اور کورو کے لوگ وہاں سے پانی بھر کر لاتے اور ضروریات پوری کرتے تھے اور مال مویشی تو خود وہاں جا کر پانی پیتے تھے۔
۱۸۲۸ء میں مٹھا خان قیصرانی سردار نے قلعہ منگروٹھہ پر قبضہ کیا اور

انگریز افسر ایڈورڈز سے سرخروئی حاصل کی تھی اس کے ساتھ ہی مٹھہ خان کے ذہن میں آیا کہ رود سنگھڑ پر بھی قبضہ کرلیا جائے اور کم سے کم اس سے حقوق آبپاشی لے کر کوٹ قیصرانی کو سیراب کیا جائے۔ چنانچہ اس نے یہ منصوبہ تیار کیا چونکہ نتکانی قبائل اس وقت اول سکھوں کے ظالمانہ نظام کے ستائے ہوئے تھے اور پھر انگریز صاحب لوگ آگئے جو اُن کے لئے آزمائش کا بہرحال دوسرا دور تھا۔ سردار مٹھہ خان نے وقت سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ قوم مر نہیں چکی ہے بلکہ سوئی ہوئی ہے اس کی اس آہٹ سے یہ قوم جاگ اٹھی اس وقت وہ لہڑی داد والی حاصل کرچکا تھا۔ اب نتکانیوں نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چنانچہ اس نے لہڑی داد والی پر ایک گنڈہ (سد) باندھا تاکہ زمینوں کو سیراب کرسکے مگر زمین پر مٹی کا مٹ آجانے سے لہڑی داد والی کا چشمہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ باقی دو لہڑوں میں میٹھے پانی کے یہ چشمے بدستور جاری ہیں۔

سرور شاہ کا پھیرا۔ جھوک کورو کے لوگوں کا بیان ہے کہ ایک موقع پر سخی سرور صاحب پھرتے پھراتے اپنی ککی گھوڑی پر سوار اس طرف آنکلے اور لہڑی ککوالی کے منہ پر پہنچے تھے۔ یہاں پر ایک بڑھیا اپنی جھونپڑی میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ نماز عصر کا وقت تھا شاہ صاحب نے بڑھیا سے وضو کے لئے پانی مانگا اتفاق سے بڑھیا کے پاس پانی نہیں تھا۔ اس کا ایک لڑکا پانی لینے کی غرض سے اندر پہاڑ گیا ہوا تھا۔ بڑھیا نے سخی سرور صاحب سے کہا کہ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں میرا لڑکا پانی لے کر ابھی واپس آتا ہے۔ سخی سرور صاحب نے کہا پانی تو یہاں پر ہی موجود ہے آپ دور سے کہاں جاکر لاتے ہیں۔ یہ کہا اور اپنی ککی گھوڑی کو ایڑ لگائی چنانچہ ککی کے جہاں جہاں قدم پڑتے گئے پانی کے سوتے وہاں سے پھوٹتے چلے گئے۔ پلک جھپکتے ہی وہاں پر میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری ہوگیا۔ جو بدستور جاری ہے۔ چنانچہ اس روز سے اس لہڑی کا نام ککی گھوڑی کی نسبت سے ککوالی مشہور ہوگیا۔ اس سے پہلے یہ لہڑی رحموں والی لہڑی کہلاتی تھی۔

میرووانی - میرووانی میر عالی نوتک خان کے بارہویں پسر میرو خان کی اولاد سے ہیں اور اس کی نسبت سے میرووانی یا میرووال کہلاتے ہیں۔ مقامی طور پر ایک خاندان بھٹی مشہور ہوگیا ہے جسکی وجہ آگے بیان کی جاتی ہے۔ سردار میرو خان اور تنگو خان نے قصبات بنڈی، ہیرو اور مہندرہ آکر آباد کیئے تھے۔ سردار میرو خان کی اولاد میں میر احمد خان اور اس کی اولاد کا ذکر اس سے قبل ہوچکا ہے جو سردار ملغ خان اور اس کے لڑکے لعل خان کے بعد حکمران ہوئے تھے۔ سردار میر احمد خان اور اس کے لڑکے اللہ یار خان کے بعد ان کی اولاد کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔

قصبہ بنڈی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تیسرے مقام پر آباد ہے اس سے قبل وہ دریا برد ہوتا رہا ہے اصل لفظ بنڈہ تھا جو غلط العام ہوکر بنڈی بن گیا ہے۔ پرانے قصبہ بنڈی کے پاس سردار میرو خان کی قبر موجود بتائی جاتی ہے ہمارے خیال میں یہ میرو خان ثانی کی قبر ہے لوگ اسے ڈاڈا (دادا) میرو کہتے ہیں اس کی قبر پر جاکر اپنے بچوں کی جھنڈ اترواتے ہیں خیرات کرتے ہیں اور نذر و نیاز مانتے ہیں۔

نور محمد خان - رائے بہادر ہتو رام نے اپنے وقت کے میرووانی قبیلہ کے مقدم نور محمد خان اور غلام محمد خان لکھے ہیں ان دونوں مقدمین کا تعلق میرووانی قبیلہ کے ایک ہی خاندان سے بتایا جاتا ہے یہ شخص بڑے پایۂ کا زمیندار اور اثرو رسوخ رکھتے تھے۔ اپنے علاقہ اور قبیلہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کے کئے گئے فیصلے بہرحال تسلیم کیے جاتے تھے اور ان پر انگشت اٹھانے کی کسی کو مجال نہ تھی۔ ان کے بعد ان کی اولاد میں برابر مقدم ہوتے رہے یہاں تک کہ نمبردارانہ نظام قائم ہوگیا اس وقت بھی ان ہی کی اولاد میں نمبردار اور قبیلہ کے وڈیرے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ سردار نور محمد خان کا بیٹا سردار خان اور پوتا علی محمد خان مقدم ہوئے اور علی محمد خان کا لڑکا نمبردار تھا۔

موضع نیڈی عرصہ تیس سال سے غیر آباد چلا آرہا ہے اور اس کے وسائل آبپاشی مسدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ موضع کی اس صورت حال کے جہاں پر علاقہ کے زمیندار ذمہ دار ہیں وہاں پر حکومت کی عدم توجہی اور اس کے کارندوں کی بے عملی بہرحال قابل مذمت ہے۔ الغرض میروانی قبیلہ میں اس وقت نمبرداری سسٹم مدت سے ختم ہو چکا ہے لوگ ترک سکونت کر کے شہروں میں جا کر آباد ہوئے ہیں ان میں بعض نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں اختیار کر رکھی ہیں اور گزر معاش کر رہے ہیں اس وقت یہاں کی شخصیات میں برخوردار خان اور محمد حسین خان قابل ذکر ہیں۔ اب یہ خاندان نور محمد خان کی نسبت سے نورانی کہلاتا ہے دوسرے مقدم غلام محمد خان کی اولاد میں اس کا لڑکا علی گوہر خان اور پوتا در محمد خان مقدم اور نمبردار ہو گزرے ہیں اس خاندان کے بزرگ اب حامد خان اور نیاز احمد خان مانے جاتے ہیں۔

محمد خان - میروانی قبیلہ کے ایک خاندان میں محمد خان ایک سخی اور نامور شخص ہوا ہے وہ اپنے حسن سلوک سخاوت، مروت اور شجاعت و شہامت میں یکتائے روزگار تھا وہ ایک با اثر زمیندار بھی تھا اور علاقہ کا بزرگ اور سربراہ بھی مانا جاتا تھا۔ اس کی سخاوت کی بیسیوں مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے گھر میں بھٹی دستور ہر وقت گرم رہتی تھی شاید کہ کوئی مہمان یا مسافر آجائے اور اس کے کھانے پکانے اور کھلانے میں زیادہ دیر ہو کہ وہ جلدی میں ہو اور بغیر کھانا کھائے وثاق سے اٹھ کر چلا جائے یہ بات سردار نور محمد خان کے وقار اور معمول کے خلاف تھی۔ اس بھٹی کے ہر وقت گرم رہنے کی وجہ سے نور محمد خان اور اس کا کنبہ بھٹی مشہور ہو گیا تھا۔ جو بدستور اس نام سے مشہور چلا آتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار اس کے پاس ایک فقیر (ملنگ) آکر ٹھہرا اور مہمان ہوا دوران گفتگو کسی بات پر وہ ناراض ہو گیا اور طیش میں آکر اپنے عصا (نیزہ) کی انی (نوک) زمین میں دے ماری اور نکال لی۔ اس طرح اس نے کئی بار کیا پھر نور محمد خان کے قدموں پر گر پڑا اور اپنی اس گستاخی کی معافی مانگی نور محمد خان سے وہ کہنے لگا سرکار! میں نے زمین میں جہاں بھی نیزہ مارا ہے آپ کی روٹی اس کے ساتھ لگ کر آئی ہے۔ آپ کی دی ہوئی روٹی تحت الثریٰ

تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ کو کوئی غیر مرئی طاقت نقصان پہنچائے تو پہنچائے ہم جیسے فقیروں کا کام نہیں ہے۔ غرضیکہ بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ محمد خان کا گھرانہ زیادہ خوش حال نہیں تھا خود محمد خان میں ایسی صفات حسنہ تھیں کہ اس کی اولاد کی اقتصادی حالت بہتر ہے۔ اس وقت قابل ذکر شخص سردار خان ہے وہ ایک سنجیدہ اور پختہ دل و دماغ رکھتا ہے، خاموش طبع اور متین شخص ہے۔ سادہ زندگی کو پسند کرتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقادر خان - ڈاکٹر عبدالقادر خان سے میں اپنے بچپن سے واقف ہوں۔ وہ آنکھوں سے نابینا ہے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی بینائی کب اور کیسے چلی گئی تھی۔ مگر بلا کا ذہین ہے وسیع تر مطالعہ رکھتا ہے علوم متداولہ پر اسے بدرجہ اتم عبور حاصل ہے۔ اس سے کسی بھی مسئلہ اور پہلو پر گفتگو کی جائے وہ دو جملوں میں اس کا مدلل اور مستند جواب دے گا کہ سننے والا سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ گفتگو سلجھی ہوئی اور صاف ستھری کرتا ہے صاف گو ہے اس کی گفتگو میں ابہام نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ علم طب، تاریخ جغرافیہ، منطق اور علم فلسفہ جیسے ادق علوم اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں۔ علم کلام اور علم ادبیات اس کے حرف حرف ٹپکتا ہے۔ ہومیوپیتھی کا وہ خود ڈاکٹر ہے۔ تحقیق اور ریسرچ اس کی سرشت میں داخل ہے وہ ایک اچھا کالم نگار ہے۔ اخبارات میں اس کے کالم جلی سرخیوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر خان نہ صرف قبیلہ میروانی اور موضع نیڈی کا بلکہ پوری نوتک قوم کا ایک گل سرسبد ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔

چنگوانی - چنگوانی قبیلہ میر عالی نوتک خان کے سب سے چھوٹے اور پندرہویں پسر چنگو خان کی اولاد ہے اور چنگو خان کی نسبت سے چنگوانی مشہور ہوا ہے چنگوانی زیادہ تر ڈیرہ غازیخان کی تحصیل میں آباد ہیں۔ اس قبیلے کا ایک مختصر سا حصہ سنگھڑ کے موضع چولانی میں رہتا ہے مگر وہ اپنے اصل مورث سے ناواقفیت کی بنا پر چولانی مشہور چلا آتا ہے۔ اب انہیں یہ بات جتا دی گئی ہے کہ ان

کا اصل مورث چنگوخان اور قبیلہ چنگوانی ہے۔ بعض چنگوانی سندھ میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص سومر خان نے بتایا کہ وہ چنگوانی ہیں مگر سندھ میں رہ کر وہ اپنے آپ کو لغاریوں سے منسوب کرتے ہیں۔ جس کی ایک اہم وجہ انہوں نے بتائی تھی جو بہرحال اُنہیں کی ذات تک باقی ہے۔

رائے بہادر ہتو رام نے نوتک قبیلے کا جو شجرۂ نسب دیا ہے وہ نہ صرف نامکمل ہے بلکہ بعض بڑی بڑی غلطیاں ہیں چنانچہ اس نے اپنے دیئے گئے شجرہ میں چوٹل خان کا نام نہیں لکھا ہے۔ اور چنگوخان کا نام درج ہے لیکن جب اس نے ہر خاندان کی پھلیاں گنائی ہیں تو اس میں چنگوخان کے ذیل میں پھلی چولانی لکھ دی ہے۔ اور چنگوانی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ممکن ہے اسے اطلاع یہی ملی ہو۔ بہرحال جو بھی وجہ تھی اس نے قصبہ چولانی کے چنگوانی خاندان کو غلط فہمی میں ڈال دیا اور یہ غلطی ایک سو سال سے برابر چلی آئی ہے۔ دوسری طرف ڈیرہ غازیخان کے چنگوانی قبیلے اس مخمصے میں پڑ گئے ہیں کہ وہ کون ہیں؟ اور کس بلوچ قبیلے سے ان کا تعلق ہے۔ چونکہ انھیں اپنا مورث نہیں مل سکا تھا۔ اور وہ سیاسی طور سے تمن لغاری میں آباد تھے انہوں نے اپنے آپ کو لغاری کہلانا شروع کر دیا۔ صدیوں کی یہ غلطی ان کے بوڑھوں کے دماغوں سے اب تک نہیں گئی تھی۔ نہ تو وہ لغاریوں سے اپنا سلسلہ ملا کر پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے ایک علیحدہ قبیلہ ہونے میں ان کا دماغ تسلیم کرتا ہے۔ خصوصاً مولوی نور محمد خان کے دل پر تو لغاری ہونا پتھر کی لکیر بن چکا ہے۔ اور ایک مدرس (ریٹائرڈ) کو کم از کم کسی قسم کی بے تکی بات پر ہرگز نہیں اڑنا چاہیئے تھا۔ یہ صرف ان کی صدیوں غلامی کا نتیجہ ہے۔ اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ در محمد خان ولد حاجی فیض محمد خان چنگوانی کا کہنا ہے کہ اس کا چچا خان محمد خان اپنے آپ کو لغاری نہیں کہلاتا تھا۔ اور یہی بیان دیگر صحیح الذہن رکھنے والے چنگوانی بلوچوں کا ہے اور یہ بات بھی بڑے وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے بزرگ اُبھے (شمال) سے علاقہ گڑانگ سے آئے تھے

اور چنگوخان کی اولاد سے تھے چنگوانی کہلاتے تھے بہرحال تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

ملنگوخان۔ اگرچہ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ہے۔ کہ چنگوخان کے کتنے لڑکے تھے تاہم اس کے تین لڑکے ملنگوخان، میر آدم خان اور خانن خان مسلم ہیں۔ یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ سنگھڑ کی حدود شمال میں فتح خان اور گڑانگ تک تھیں۔ عین ممکن ہے کہ چنگوخان اور اس کی اولاد ابتدا میں گڑانگ پر جا کر قابض ہوئی ہو اور کچھ عرصہ کے بعد اس کے یہ تین لڑکے وہاں سے واپس لوٹ آئے ہوں۔ ان میں سے ایک ملنگوخان قصبہ چولانی میں رہ پڑا ہو اور دوسرے دو بھائی ڈیرہ غازیخان میں جا کر آباد ہوئے ہوں۔ موضع چولانی کے بیانات محکمہ مال بندوبست ۱۸۷۲ء سے تو واضح ہوتا ہے کہ چنگوخان خود اپنے دوسرے دو بھائیوں دتہ خان اور چوٹل خان کے ساتھ چولانی میں چلا آیا تھا۔ موضع چولانی میں چونکہ مرکزی کردار چوٹل خان کا تھا۔ اس لئے اس آبادی کا نام چولانی رکھا گیا۔ اس لحاظ سے چنگوخان کی وفات بھی چولانی میں ہوئی ہو گی۔ باپ کی وفات کے بعد سردار چنگوخان کے دو لڑکے میر آدم خان اور خانن خان چولانی کو چھوڑ کر وقت کے غازیخان کے پاس چلے آئے اور ملازم ہو گئے تھے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ملنگو خان اپنے چچا چوٹل خان اور اس کی اولاد کے ساتھ چولانی میں رہ گیا تھا۔ ممکن ہے اس کی شادی بھی اپنے اس چچا کی لڑکی سے ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ زیادہ جمعیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے ان میں رہ کر اس کی اور چنگوانی کی نسبت چولانی مشہور ہو گئی اور امتداد زمانہ سے ہر شخص اس کی اصلیت کو بھول گیا۔ ویسے بھی ملنگوخان کی اولاد میں ایک بڑا سلسلہ ایک ایک لڑکے کی پیدائش سے ظاہر کیا گیا ہے اور یہ اقلیت اکثریت میں دب کر اس کا جزو بدن بن گئی تھی۔ اب اس خاندان میں اللہ بخش خان اور احمد بخش خان قابل ذکر شخصیات ہیں میری ملاقات حمید اللہ خان عرف حامد خان سے ہوئی تھی۔

میر آدم خان - میر آدم خان اور خانن خان گڑانگ سے ڈیرہ غازیخان کو چلے آئے تھے اور غازی خان میرانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے بیان کے مطابق وہ جمعداری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اور فوجی خدمات انجام دیں ان کی ان خدمات سے متأثر ہو کر غازی خان نے انھیں پائیگاہ اور چوٹی زیرین میں جاگیر دی۔ یہ بات عام مشہور ہے کہ لغاری سردار کے آنے سے قبل جنگوانی قبیلہ کا وہاں پر بڑا زور رہا ہے۔ قصبہ پائیگاہ ایک کوٹ نما آبادی تھی جس کے گرد فصیل تھی اس شہر پناہ کے آثار ابھی تک کہیں کہیں موجود ہیں۔

سردار فضل احمد خان - قصبہ پائیگاہ کا اس وقت سربراہ اور وڈیرہ فضل احمد خان جنگوانی ہے۔ وہ سابق دور سے برابر اپنی یونین کونسل کا چیئرمین منتخب ہوتا آ رہا ہے۔ اثر و رسوخ اور اقتصادی و مالی پوزیشن اچھی رکھتا ہے۔ اخلاق اور میل ملاپ بھی اچھا رکھتا ہے۔ سیاسی، سماجی اور علاقائی کاموں میں گہری دلچسپی اور گہرا لگاؤ رکھتا ہے عوام میں بہرحال مقبول شخص ہے۔ فضل احمد خان کا چچا حاجی فیض محمد خان بڑے اچھے اخلاق کا مالک تھا اس کا علاقہ میں بڑا اثر تھا۔ اور عوام میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ نیک اور خوش خلق شخص تھا۔ اب اس کا لڑکا دل محمد خان ان خوبیوں کا مالک ہے۔ بستی ماڑی اور کیھڑے والا کے جنگوانی خاندانوں میں غلام محمد خان اور حاجی پیر بخش خان اقتصادی اور مالی پوزیشن اچھی رکھتے ہیں۔ اور اپنے اپنے طور پر وہ سربراہ قبیلہ مانے جاتے ہیں۔ نہایت سادہ لوح اور سادہ گزران رکھتے ہیں۔ غلام محمد خان کا بیان ہے کہ ان کا بزرگ جو گڑانگ سے آیا تھا شیر خان تھا اس نے یہاں آ کر ماڑی تعمیر کرائی تھی اور اپنی رہائش رکھی تھی۔ یہی ماڑی بعد میں موجودہ آبادی کی شکل اختیار کر گئی اور نام اس کا برابر ماڑی چلا آتا ہے۔

حاجی پیر بخش خان - حاجی پیر بخش خان کا بزرگ گہنور خان علاقہ چوٹی سے

چلا آیا تھا۔ سردار شیر خان کے لڑکے دوست محمد خان نے اپنی لڑکی کا رشتہ دے کر اسے داماد بنا لیا تھا۔ ساتھ ہی گزر معاش کے لئے ایک قطعہ زمین دے دیا تھا۔ اس وقت حاجی پیر بخش خان کا ایک بھتیجا سرفراز خان یونین کونسل کا رکن ہے۔ مگر حال یہ کہ مجھے دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور روایتی حال لینے کا اسے خیال بھی نہ رہا بلکہ اس کا پہلا سوال تھا کہ کتنا بقایا ہے؟ اس کے منہ سے یہ کلمہ سن کر اس کی ذہانت پر میں ششدر رہ گیا، اور دل میں کہا کہ زمانہ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ ایسے لوگ ہمارے منتخب نمائندے ہیں اور سرداری نظام کا بدل ثابت ہو رہے ہیں۔ دراصل وہ مجھے بنک کا ملازم سمجھا اور سوچا کہ یہ شخص وصولی پر آیا ہوا ہے۔

عبدالاحد خان - پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ سردار خانن خان کو چوٹی میں جاگیر ملی تھی اور لغاریوں سے قبل اس خاندان کی سیاسی اور اقتصادی حالت بہتر اور نمایاں تھی۔ گہنور خان جنگوانی سردار نے نواں شہر کے پاس موجود ایک کوٹ (قلعہ) بنوایا تھا جو گہنور کوٹ کے نام سے مشہور تھا۔ اور اس کے آثار موقع پر موجود بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ خاندان گہنور کوٹی جنگوانی مشہور ہے۔ سردار گہنور خان کا لڑکا لشکر خان تھا جو کسی وجہ سے یہاں سے ترک سکونت کر کے بیٹ واڑیولہ علاقہ علی پور میں جا بیٹھا تھا۔ جہاں پر اس کی اولاد بدستور آباد چلی آ رہی ہے۔ اور زمیندارہ کا روبار کرتے ہیں۔

گہنور کوٹی جنگوانی خاندان کے بعد محمد خان جنگوانی کے خاندان میں سرداری منتقل ہو گئی اور محمد خان کا پوتا حبیب اللہ خان سربراہ ذیلدار رہا اور نمبرداری محمد خان کے بڑے لڑکے احمد خان کی اولاد میں چلی آ رہی ہے۔ عبدالاحد خان کا بھتیجا منظور احمد خان اب یونین کونسل چوٹی کا ممبر ہے اور اچھے اثر رسوخ کا آدمی بتایا جاتا ہے۔ زمیندارہ کاروبار میں مصروف رہتا ہے۔

مشتاق احمد خان - حبیب اللہ خان جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ وہ سربراہ ذیلدار رہ چکا ہے۔ مشتاق احمد خان اس کا پوتا اور خالقداد خان کا لڑکا ہے۔ خالقداد خان

CamScanner

پولیسی ملازم رہ چکا تھا ان سے میری ایک بار ملاقات ہوئی تھی - ان کے اندازِ گفتگو سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ پولیس سے ریٹائر ہوا ہے - مشتاق احمد خان اعلیٰ التعلیم یافتہ اور ایڈووکیٹ ہے آدمی خاموش طبع اور کم گو ہے - بغیر کسی مقصد کے بات بہت کم کرتا ہے - وہ اکثر سنجیدہ اور متانت سے رہتا ہے - نوجوان ہے مگر اچھا اثر و رسوخ رکھتا ہے - شخصیت اس کی بہرحال پروقار ہے - سیاسی اور سماجی کاموں میں گہری دلچسپی لیتا ہے - ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی مثل اس پر یقیناً صادق آتی ہے -

خالد عبداللہ خان - خالد عبداللہ خان سے بھی میری ایک خاصہ عرصہ سے جان پہچان ہے - یہ شخص بھی نوجوان ہے - اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ اصلاحیتوں کا مالک ہے - اور ایڈووکیٹ ہے اس کے والد صاحب بھی ایک باکردار اور قومی آدمی بتائے جاتے ہیں - وہ مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے اور پاکستان کی تعمیر و تخلیق میں ان کا بڑا حصہ بیان کیا جاتا ہے -

بہرحال خالد عبداللہ خان ایک بیدار مغز اور انقلابی شخص معلوم ہوتا ہے مزاج میں انانیت اور تلوّن پایا جاتا ہے - سیاسی اور سماجی کاموں میں بھرپور حصّہ لیتا ہے - اگرچہ پروقار شخصیت ہے جذباتیت زیادہ ہے - کل کے کام کو آج کرنا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی پارٹیاں بدل لی ہیں - مہمان نوازی اور حسنِ سلوک بہرحال اس کا طرۂ امتیاز ہیں -

کرم خان - لالہ ہتو رام نے ۱۸۷۲ء کے دور میں چنگوانی قبیلے کے مقدّم کا نام کرم خان لکھا ہے - کرم خان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کرم خان کلہاڑا مشہور تھا، دوسرے معنی میں وہ طاقتور اور جابر سردار تھا اس کا اثر بھی اچھا اور سوچ بھی دور رس تھی - اس کے فیصلے شاہی فیصلے ہوتے تھے - ممکن ہے کہ اس وقت کسی لغاری سردار کی سرپرستی بھی اسے حاصل رہی ہو یوں وہ ایک اچھا زمیندار اور علاقہ دار بیان کیا جاتا ہے اب اس کے خاندان سے یہ اعزازات عبدالاحد خان اور اس کے خاندان میں منتقل ہو چکے ہیں - دراصل یہ خاندان بھی اس خاندان کی ایک دوسری شاخ ہے غرضیکہ کرم خان کی اولاد موجود ہے مگر زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہے -

قلاتی - قلاتی خاندان جو کہ علاقہ مہوئی اور بارتھی وغیرہ میں آباد ہے یہ نوتک قبیلہ کے مختلف خاندانوں سے تعلّق رکھتا ہے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایسا قلعہ یا کوٹ جو کسی پہاڑ کے دامن میں واقع ہو قلات یا کلات کہتے ہیں -

نواب لعل خان نتکانی اور اس کے بھتیجے اسد خان کے مابین جب لڑائیاں ہوئیں تو اسد خان کی فوج کے جو آدمی گرفتار ہوتے رہے انہیں لعل خان کوٹ مہوئی میں قید میں ڈالتا رہا اور جب لعل خان کو درّانی فوج گرفتار کر کے کابل لے گئی اور اسد خان برسرِ اقتدار آگیا تو اس نے کوٹ مہوئی سے اپنے آدمی رہا کر دیئے - اس وقت عوام الناس کی زبان پر مشہور ہو گیا کہ آج قلاتی رہا کر دیئے گئے ہیں - چنانچہ اسی روز سے وہ لوگ قلاتی مشہور ہو گئے -

دودا خان - قلاتی خانوادے زیادہ تر مہوئی کے گرد و پیش میں آباد ہو گئے تھے ان میں بعض گھرانے پل ڈگر میں اور بعض اندر پہاڑ بارتھی میں جا کر آباد ہوئے مہوئی کے قلاتی اپنی قدیم ٹوگر پر بدستور چل رہے ہیں - ان میں تعلیم کم اور جاہلیت زیادہ ہے - زمیندارہ کاروبار کرتے ہیں اور پہاڑ کے دامن میں واقع چشموں کا پانی پیتے ہیں - زیادہ تر یہ لوگ سوکڑ کے ملغانی سردار کے زیرِ اثر ہیں - قلاتی خاندان اس وقت دو شاخوں میں مشہور ہیں گہرانی اور زوروانی اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دو قلاتی بھائی گاہروں اور زہرو تھے - ان کی اولادیں اِس نسبت سے گہرانی اور زروانی مشہور ہو گئیں موضع قلاتی میں دونوں خاندان آباد ہیں - ان میں گامن خان قلاتی ایک مشہور و معروف ہو گزرا ہے اب اس کا لڑکا عثمان خان ہے - اور یہ گہرانی خاندان سے تعلّق رکھتا ہے - اس خاندان کا ایک اور بزرگ روہل خان تھا مشہور جھوک روہل والی اسی کی آباد کردہ ہے - غرضیکہ دودا خان قلاتی اسی گہرانی قلاتی خاندان سے ہوئے - اس کا باپ غازی خان تھا اور وہ پل ڈگر کا رہنے والا تھا دودا خان ایک بڑا بہادر اور طاقتور آدمی بیان کیا جاتا ہے -

ایسے لوگوں کو تمندار اپنے دربار میں خاص جگہ دیتے تھے - چنانچہ عاشق محمد خان بزدار کا وہ خاص الخاص اور دوست تھا، جو کام کسی جن، بھوت اور دیو سے نہ ہو سکتا تو عاشق محمد خان وہ کام دودا خان کے ذمہ لگا دیتا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر بزدار تمندار کو کسی کی گھوڑی بہت پسند آئی، اتفاق سے وہ شخص اس کے پاس مہمان تھا، مگر گھوڑی کو وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا، رات کو جب کھلی کچہری لگی تو سردار عاشق محمد خان نے اپنے اس مہمان سے وہ گھوڑی طلب کی اور کہا کہ وہ خواہ قیمت لے کر خواہ نذرانہ کے طور پر گھوڑی ضرور دے - لیکن گھوڑی کا مالک اس بات پر رضامند نہ ہوا آخر کچہری برخاست ہوئی صبح سویرے جب مہمان اٹھا اور گھر کو واپس جانے کی سردار سے اجازت مانگی دیکھا تو اس کی وہ گھوڑی سردار کے ڈیرہ پر بندھی ہے - اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا، سردار سے دریافت کیا کہ گھوڑی آپ کو بخشی - مگر یہ بتائیے کہ اس قدر دور منزل سے میری گھوڑی یہاں پر کیسے پہنچی ہے - اور اسے کون لایا ہے - دودا خان قلاتی کھڑا ہو گیا اور کہا کہ یہ خدمتگار حاضر ہے - وہ شخص یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا - کہ دودا خان رات ہمارے ساتھ سردار کی کچہری میں موجود تھا لیکن صبح ہونے سے قبل وہ پچاس میل دور کیسے گیا اور راتوں رات میرے گھر سے گھوڑی کھولی اور سویرے یہاں پر موجود ہے - چنانچہ دودا خان کی جوانمردی پر سب نے اسے داد دی -

دودا خان کا لڑکا محمد رمضان ہے مگر اسے باپ سے کوئی نسبت نہیں ہے -

منگن قلاتی - منگن قلاتی بارتھی کا باشندہ تھا اس کے بزرگ کوٹ مہوئی سے رہا ہو کر بارتھی میں جا کر آباد ہوئے تھے - مجھے اس سے دو، تین منٹ ملاقات کرنے کا موقع ملا تھا جبکہ وہ اپنے خلاف مقدمات کی غرض سے پولیٹیکل تحصیلدار کی عدالت میں پیش ہونے کو آیا ہوا تھا۔

بہرحال پیر بخش خان قلاتی کا بیان ہے کہ اشتہاری ملزم ہونے سے قبل منگن جب کہیں باہر جاتا تو اپنی بیوی کو ایک دوسرے رشتہ دار میرو قلاتی

کے گھر بٹھا کر جاتا تھا تاکہ وہ گھر میں اکیلی نہ رہے - اور اسے اپنے اس رشتہ دار پر اعتماد بھی تھا - ایک بار جب وہ باہر گیا تو حسب معمول بیوی کو میرو خان قلاتی کے گھر چھوڑ گیا - جب واپس آیا تو اس کی بیوی نے میرو قلاتی کی زیادتی کی شکایت کی - صبح جب منگن اٹھا تو میرو کے گھر پہنچا اور اس سے اس کی شکایت کی، اور کہا کہ اس نے منگن کی عزت خراب کی ہے لہذا رواج کے مطابق اسے ایک رشتہ دے - میرو قلاتی نے لیت و لعل کیا - جب منگن اس سے اس سلسلہ میں ناامید ہو گیا - تو ایک روز بندوق کندھے پر رکھی اور میرو کے گھر پہنچ گیا اتفاق سے اس روز میرو قلاتی اپنا اونٹ لے کر کہیں سے بار اٹھانے گیا تھا - اب منگن گھر سے چل کر سیدھا قصبہ مندرانی میں آیا اپنے پیر و مرشد سید نور شاہ سے یہ تمام واقعہ کہہ سنایا اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا - کہ آج وہ میرو قلاتی کا راستہ روک کر اسے ختم کر دے گا - اس وقت اپنے لئے دعا منگوائی - چنانچہ وہاں سے وہ چلا اور میرو قلاتی کا راستہ روک کر بیٹھ گیا - میرو قلاتی جب ادھر سے گزرنے لگا تو منگن نے اسے للکارا مگر میرو اس وقت نہتا تھا اس نے زندگی کی مہلت مانگی لیکن منگن نے اس پر فائر کر کے اونٹ سے نیچے گرا دیا، یہی واقعہ منگن کے اشتہاری ملزم کا باعث بنا اور اس روز کے بعد وہ ایک ڈاکو مشہور ہو گیا۔

پیر بخش خان کا کہنا ہے کہ منگن زیادہ تر ہندوؤں پر ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ اور انہیں لوٹتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں منگن نے منگروٹھ غربی پر ڈاکہ ڈالا، ہندوؤں کو لوٹا - اور ان کی دکانیں جلا دیں - جاتے وقت قلعہ منگروٹھ کے اہلکاروں سے کچھ سرکاری بندوقیں بھی چھین کر لے گیا تھا - جبکہ اُسکے اپنے ساتھی گلفاز خان کی بندوق قلعہ منگروٹھ میں رہ گئی اس بندوق پر گلفاز خان کا نام نقش کیا ہوا تھا جو سنہری حروف سے منقش تھا -

پیر بخش قلاتی ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے یعنی رمک علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان

کے پاس منگن نے ایک بس پر ڈاکہ ڈالا۔ منگن نے بس میں سوار دو عورتوں کو مردوں سے علیحدہ کر کے سڑک کے کنارہ پر بٹھا دیا مردوں کی تلاشی لی جو کچھ ان سے ملا لے لیا۔ اب وہ ان عورتوں کے پاس آیا اور بڑے ادب و احترام سے کہا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے، مجھے دے دیں، میں آپ کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ ان عورتوں میں سے ایک نے کہا میں ایک سید زادی ہوں اور دوسری بولی کہ میں ایک غریب چپراسی کی بیوی ہوں اور ہمیں معاف کر دیا جائے چنانچہ اس نے انہیں چھوڑ دیا اور کچھ نہ لیا۔

پیر بخش خان کہتا ہے کہ وہ سید زادی قصبہ ملکانی (رتیڑہ) کی تھی اور منگن کے اس رویہ کی تعریف کرتی تھی۔ منگن قلاتی اندر پہاڑ علاقہ بزدار میں سفر کر رہا تھا۔ جب وہ مقام سوڑہ پر پہنچا جہاں کافی لوگ جمع تھے انہوں نے منگن کو اپنی طرف بلایا اور کہا ہماری آج شادی ہے کھانا کھا کر جائیں منگن کو ان پر یقین نہ آیا اس یقین دہانی کیلئے بزداروں نے اسے قرآن شریف ضامن دیا۔ بلوچ قرآن شریف کے نام کو کسی صورت میں پس پشت نہیں ڈالا کرتے چنانچہ منگن نے ان پر یقین کر لیا اور ان کے پاس چلا گیا اب انہوں نے خفیہ طور سے بارڈر ملٹری پولیس کو اطلاع کر دی تھوڑی دیر بعد ان کا مسلح دستہ آیا اور منگن کو گرفتار کر لیا۔ منگن کے دو اور ساتھی بھی تھے جو اس کے ساتھ گرفتار ہو گئے تھے بالآخر اس پر مقدمات چلائے گئے جن میں اسے غالباً پینتیس سال تک قید ہوئی، ممکن ہے کہ اس کے بعد پھانسی کا حکم بھی ہوا الغرض اس نے ایام اسیری میں وفات پائی منگن قلاتی کی اولاد بھی بتائی جاتی ہے جو اندر پہاڑ بارتھی میں رہتی ہے۔

نتکانی قبیلہ پر ایک نظر۔ ایبٹسن اور دیگر مؤرخین نوتک قوم و قبیلہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ڈیرہ غازیخان کا یہ ایک خاص قبیلہ ہے جو مشرق کی طرف دریائے سندھ اور شمالاً قیصرانی اور کھوسہ قبائل کے درمیان پھیلے ہوئے ایک وسیع علاقہ پر قابض ہے۔ ایک زمانہ میں تمام علاقہ سنگھڑ پر اعلیٰ مالکانہ حقوق رکھنے کی وجہ سے یہ

قبیلہ قابل ذکر اثر و رسوخ اور اہمیت کا حامل ہے لیکن رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے ابتدائی دنوں میں اپنا قبائلی وجود کھو جانے کی وجہ سے یہ زیادہ دیر تک سیاسی تنظیم کا حامل نہ رہ سکا۔

لیکن یہ واقعہ اتنا تازہ ہے کہ ابھی تک یہ اپنے قبائلی ربط اور اپنی نسلی خصوصیات کا حامل ہے[1]

"The Nutkani are a tribe peculiar to Dera Ghazi Khan, which holds a compact territory stretching eastward to the Indus and between the Northern Khosa and the Qasrani. The tribe once enjoyed considerable influence and importance, holding rights of superior ownership over the whole of the Sanghar country. But it no longer possesses a political organization, having been crushed out of tribal existance in the early days of Ranjit Singh!s rule. But the event is so recent that it still retains much of its tribal coherence and of the characteristics of its race."

لالہ حکم چند لکھتے ہیں کہ محمد مستو خان (اول)، اس کا بیٹا علی اکبر خان اور پوتا محمد اسد خان اپنے علاقہ میں ذی مقدور اور صاحب ثروت رئیس ہو گزرے ہیں اور ان کی حکومت کا بڑا اثر رہا ہے۔[2] نتکانی جب مغلیہ دور میں سنگھڑ پر قابض تھے تو پہاڑ نشین بزداروں کو حکومت دہلی کی طرف سے ملنے والا وظیفہ انہیں نتکانی سرداروں کے ذریعے سے ملتا رہا۔[3]

جب خواجہ محمد سلیمان صاحب اندر پہاڑ سے نکل کر تونسہ میں آکر سکونت پذیر

[1] پنجاب کاسٹس ص ۵۰۴۔ [2] تواریخ ڈیرہ غازیخان ص ۸۵ [3] گل بہار ص ۲۸۸۔

ہوئے، تو ان کے جان و مال کی حفاظت بھی نتکانی سرداروں نے کی۔[1]

دیوان ساونمل نے جب بزداروں پر لشکر کشی کی تو نتکانی اس کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر محمد خان ملغانی نمبردار، مجید خان لنجلانی، محمد خان تنگوانی، خدا بخش خان اور بخش خان شدانی، لعل خان سنجرانی اور خان محمد خان رحمانی مارے گئے۔ جبکہ سکھل خان کھیانی بزدار اور اس کے ساتھی اس لڑائی میں کام آئے تھے۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بزداروں پر حملہ کیا تو اس وقت بھی نتکانی ان کے ساتھ رہے۔[2] غرضیکہ یہ قوم ایسی شورہ پشت اور سخت جان تھی کہ میر چاکر خان اور غازیخان میرانی کے مشترکہ عساکر، مغلیہ حکومت کے اجارہ دار ناہڑ سردار اور سکھ خالصہ سرکار اسے ختم نہ کر سکی۔ یہ کابل سلطان (ددد) سے نکلے تو سنگھڑ بادشاہ (ددد) کی وادی کو آکر آباد کیا یعنی

جوان عزم و ہمّت صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

۱۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب ص ۲۰۸، ۲۔ گل بہار ص ۳۰۰۔

ٹھیڑ دلورائے